مذہب اور جدید چیلنج



مولانا وحیدالدّین خاں

مذہب

اور

جدید چیلنج

مولانا وحید الدین خاں

Mazhab aur Jadid Challenge (Urdu)
by Maulana Wahiduddin Khan

Arabic Version: *Al-Islamu Yatahadda*
English Version: *God Arises*
French Version: *L'islam Et Les Defis De La Science*
Malay version: *Islam Menjawadd tantagen Zaman*
Malayalam version: *Islam Velluvilikkunnu*
Sindhi Version: *Jadid Ilm jo Challenge*
Turkish Version: *Jslam Meydan Okuyor*

First Published 1966
Reprinted 2022

Goodword Books
A-21, Sector 4, Noida-201301
Delhi NCR, India
Tel.+9111-41827083, Mob.+91-8588822678
e-mail: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

CPS International
(Center for Peace and Spirituality)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Mob.+91-9999944119
email: info@cpsglobal.org
www.cpsglobal.org

Printed in India

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

عرضِ ناشر

فروری 1955ء کا واقعہ ہے۔ لکھنؤ کے امین الدولہ پارک میں جماعت اسلامی ہند کے زیر اہتمام ایک عمومی اجتماع ہوا۔ اس موقع پر اسلام کے عقلی اثبات پر مصنف کی ایک تقریر ہوئی۔ تقریر کے بعد جب اعلان کیا گیا کہ وہ چھپی ہوئی صورت میں یہاں بُک اسٹال پر موجود ہے تو انسانوں کا ہجوم اس کو لینے کے لیے اسٹال پر ٹوٹ پڑا۔ تقریر کے مطبوعہ نسخے ہاٹ کیک کی طرح فروخت ہوگئے۔ بعد کو یہ تقریر پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوئی۔ اردو میں اس کا نام تھا ''نئے عہد کے دروازہ پر'' ہندی میں ''نو یگ کے پردیش دوار پر'' اور انگریزی میں:

On the Threshold of a New Era

یہ پہلا موقع تھا جب کہ مصنف کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جدید الحاد کے جواب میں عصری انداز میں ایک کتاب تیار کرنی چاہیے۔ اس کے لیے مطالعہ اور مواد جمع کرنے کا کام اسی وقت سے شروع ہوگیا۔ اس کے بعض اجزاء متفرق طور پر بعض ماہناموں میں شائع ہوتے رہے۔ جمع شدہ مواد کی باقاعدہ کتابی ترتیب کا کام 1963 میں شروع ہوا اور اگست 1964 میں مکمل ہوگیا۔

یہ کتاب پہلی بار 1966 میں ادارہ تحقیقات ونشریاتِ اسلام (لکھنؤ) سے ''علم جدید کا چیلنج'' کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ پہلی بار 1970 میں کویت کے ناشر ''دار البحوث العلمیہ'' نے الاسلام یتحدیٰ کے نام سے شائع کیا۔ اس کے بعد وہ بیروت اور قاہرہ سے چھپتی رہی۔ اب تک اس کے ایک درجن ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ دوسری کئی عالمی زبانوں میں بھی اس کے ترجمے چھپ چکے ہیں۔ ''الاسلام یتحدیٰ'' نصف درجن عرب یونیورسٹیوں میں داخلِ نصاب ہے۔

کتاب کی اشاعت کے بعد سیکڑوں تبصرے مختلف عالمی جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک تبصرہ جزئی طور پر ٹائٹل کے آخری صفحہ پر نقل کیا جارہا ہے۔ یہ تبصرہ معروف مصری ادیب احمد بہجت کے قلم سے ہے اس کو قاہرہ کے اخبار الاہرام (2 جولائی 1973) نے اپنے کالموں میں شائع کیا تھا۔

تمہید

جدید دور کو، جہاں تک اس کے مخالفِ مذہب ہونے کی حیثیت کا تعلق ہے، دورِ الحاد کہا جاتا ہے۔ مگر اس الحاد کا مطلب خدا کا مدّعیانہ انکار نہیں ہے، بلکہ اس کی اپنی تشریح کے مطابق، یہ محض ایک طریق مطالعہ ہے جو ذہنی اور علمی ارتقا کے ایک مخصوص دور میں انسان کو حاصل ہوا ہے۔ اس ارتقائی مطالعہ کا لازمی تعلق کسی چیز کے انکار یا اثبات سے نہیں ہے بلکہ وہ مجرد ایک طریق جستجو ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جدید مفکرین کے نزدیک اس طریق جستجو نے مذہب کو باطل ثابت کر دیا ہے۔ یہاں میں مائلز (T.R Miles, 1923-2008) کے الفاظ نقل کروں گا:

''موجودہ رجحان ایک ٹکنیک، ایک طریقہ، سوالات کے مطالعہ کے ایک ڈھنگ کی طرف ہے، نہ کہ مسائل کا قطعی جواب دینا۔ یہ ایک نمایاں تبدیلی ہے، جو پچھلی نصف صدی کے اندر فلسفہ کی دنیا میں ہوئی ہے۔ یہ صورتحال ابھی جاری ہے اور بہت دور تک اس میں ٹھہراؤ کی امید نظر نہیں آتی۔''

Religion and the Scientific Outlook, (1959) P.13

جدید مفکرین کی اپنے موقف کے بارے میں یہ تشریح خواہ اسے ہم ایک خالص علمی بات سمجھیں یا اس کو یہ حیثیت دیں کہ مذہب بیزاری کے بعد کائنات کی مادی توجیہ ڈھونڈنے میں انسان کو جو ناکامی ہوئی ہے، اس کے بعد یہ ایک خوبصورت جائے پناہ ہے جو اس نے تلاش کی ہے، بہرحال ہماری مدافعانہ کوششوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس صورت حال کو ذہن میں رکھتے ہوئے کام کریں۔

مثال کے طور پر اثباتِ رسالت کے عنوان پر ہمارے یہاں جو کام ہو رہا ہے، اس میں اکثر یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ دورِ جدید کا یہ دعویٰ ہے کہ ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹے رسول تھے۔'' اور اس کے بعد آپ کو ''سچا'' ثابت کرنے پر مواد اکٹھا کرنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ جھوٹا نبی کہنے کا مطلب یہ

ہے کہ سچا نبی بھی ہوتا ہے جب کہ جدید انسان اپنے معلوماتی دائرہ کے مطابق ایسی کسی چیز کے ماننے ہی میں مشتبہ ہے۔ دراصل جھوٹا رسول (false prophet) یہود ونصاریٰ کے مذہبی طبقہ کا پرانا اعتراض ہے جو اپنے انبیاء کی نبوت کو مانتے ہیں مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے منکر ہیں، ورنہ جہاں تک جدید ملحدانہ ذہن کا تعلق ہے اس کے لیے اصل مسئلہ آپ کے ''جھوٹے'' یا ''سچے'' ہونے کا نہیں ہے، بلکہ اس کے سامنے صرف یہ سوال ہے کہ آپ کے کلامِ نبوت کا سرچشمہ کیا ہے وہ اپنے معلوم ذرائع پر قیاس کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس کا سرچشمہ انسان کا اپنا لاشعور ہے۔ اور لاشعور سے نکلے ہوئے کلام کو وحی والہام سے تعبیر کرنا محض ایک استعارہ ہے، نہ کہ کسی حقیقتِ واقعہ کا بیان۔

اس لیے رسالت کی بحث میں صرف آپ کو ''سچا'' ثابت کرنے سے جدید تقاضے کی تکمیل نہیں ہوتی۔ بلکہ ہمیں یہ بھی بتانا ہوگا کہ الہام کوئی حقیقی چیز ہے۔ وہ مخصوص انسانوں پر اترتا ہے، اور اسی کے اعتبار سے آپ خدا کے رسول تھے۔

یہ تو اس صورتِ حال کی مثال تھی جب کہ جدید فکر کے اصل موقف کو صحیح طور پر سامنے رکھے بغیر اس پر تنقید کی جائے۔ لیکن ایک اور ذہن ہے جو جدید فکر سے واقف ہونے کے باوجود دوسری قسم کی غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنی مرعوبیت کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ مغربی اماموں کے نزدیک جن تصورات کو علمی مسلّمہ کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے وہ یقیناً علمی مسلّمہ ہی ہوگی، اس لیے وہ اسلام کی فتح مندی اس میں سمجھتے ہیں کہ ان مسلّمہ تصورات کو قرآن وحدیث سے ثابت کر دکھائیں، یہ اسلام اور غیر اسلام میں مطابقت پیدا کرنے کا وہی انداز ہے جو مغلوب تہذیبیں اپنی غالب تہذیب کے مقابلے میں عموماً اختیار کیا کرتی ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جو طرز فکر اس طرح دنیا کے سامنے آئے وہ تہذیب کے جامے میں پیوند بن کر تو رہ سکتا ہے مگر وہ خود تہذیب کا جامہ نہیں بن سکتا۔ اس طرح کے تطبیقی بیانات سے اگر کوئی یہ امید رکھتا ہے کہ وہ دنیا کی علمی فضا کو بدل دے گا یا لوگوں کو ناحق سے پھیر کر حق کی طرف لانے میں کامیاب ہوگا تو یہ محض اس کی خوش خیالی ہے۔ افکار میں تبدیلی کے لیے انقلابی لٹریچر کی ضرورت ہوتی ہے، نہ کہ تطبیقی لٹریچر کی۔

یہ صورت حال اس وقت اور زیادہ خرابی کا باعث بنتی ہے جب کسی بنیادی اور ہمہ جہتی تصور کے بارے میں اس کا اظہار ہوا ہو۔ ''شہاب ثاقب'' کے بارے میں اگر جدید علمائے فلکیات کی کوئی مختلف تحقیق ہو اور اس کو مان کر آپ قرآن میں تاویل کریں تو اس سے کسی بڑی خرابی کا اندیشہ نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی ایسے تصور کو قبول کر لیا جائے جو محض ایک جزوی اور منفرد نوعیت کی چیز نہ ہو بلکہ دیگر سوالات سے بھی اس کا براہِ راست تعلق ہو تو سارا فلسفۂ دین اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔

اس کی واضح مثال ہماری صف کے وہ پڑھے لکھے لوگ ہیں جنھوں نے نظریۂ ارتقاء کو اس بنا پر قبول کر لیا ہے کہ جدید علماء کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے مطالعے اور تجربے سے اس کی صداقت پر مطمئن ہو چکے ہیں۔ اس نظریے کو مان لینے کی وجہ سے ان کو اسلام کی ایک ارتقائی تعبیر کرنے کی ضرورت پیش آ گئی ہے اور اسلام کے جامے کو ارتقاء کی ساخت کے مطابق بنانے کے لیے انھیں پورے کپڑے کو ازسرِ نو تراشنا پڑا ہے۔

مثال کے طور پر ''ارتقا'' کا نقطۂ نظر یہ چاہتا ہے کہ انسان بہ حیثیت نوع مسلسل ترقی کر رہا ہو اور زندگی کے انجام پر سب کو اعلیٰ تر مقام حاصل ہو۔ اس طرز فکر کے مطابق ناپسندیدہ صورت حال کو ماضی میں ہونا چاہیے، نہ کہ مستقبل میں۔ اس طرح ارتقا کے فلسفے میں جنت کی زندگی تو مناسب معلوم ہوتی ہے مگر دوزخی زندگی کی تشریح نہیں ہوتی۔ اس دشواری کو حل کرنے کے لیے ارتقا پسند ذہن کو یہ کہنا پڑا کہ جہنم سزا کی جگہ نہیں، بلکہ تربیت حاصل کرنے کی جگہ ہے۔ زندگی ہمیشہ رکاوٹوں کے خلاف جدوجہد کر کے آگے بڑھتی ہے جو لوگ دنیا میں گناہ کی رکاوٹوں میں گھر کر رہ گئے اور آگے نہ بڑھ سکے، ان کو جہنم کے مشکل حالات میں ڈالنے کا مقصد دراصل ان کی ارتقائی جدوجہد کو اگلی دنیا میں جاری رکھنا ہے اسی ''مشکل جدوجہد'' کا نام دوزخ ہے۔ اسی طرح یہ ذہن شخصی ملکیت کے اسلامی قوانین کو ''عبوری دور کے احکام'' قرار دیتا ہے کیوں کہ سماجی ارتقا کے تصور کے ساتھ ان احکام کا جوڑ نہیں لگتا۔

یہ دو مثالیں یہ واضح کرنے کے لیے دی گئی ہیں کہ جدید چیلنج کے جواب میں جو کام ہوا ہے اس کی اہمیت کے باوجود اس میں کس طرح کے نقائص باقی رہ گئے ہیں۔ مصنف کا یہ دعویٰ نہیں ہے

کہ اس کی کوشش تمام نقائص سے پاک ہے۔ البتہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کمی کا یہی احساس اس کوشش کا محرک ہوا۔

کتاب میں جس پہلو سے مذہب کی مدافعت ہے یا جس ذہن کے پیش نظر اس کو مدلّل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کے دو الگ الگ انداز ہوسکتے ہیں۔ ایک تصوراتی اور دوسرے تجرباتی، یا دوسرے لفظوں میں، ایک فلسفیانہ اور دوسرے سائنٹفک (اگر اس کو سائنٹفک کہا جاسکتا ہو)۔ زیرِ نظر کتاب میں زیادہ تر دوسرے پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس کی خاص وجہ مصنف کا یہ احساس ہے کہ پہلے طرز پر ہمارے یہاں کافی کام ہوچکا ہے اور اس میں بہت کچھ مواد ہمارے قدیم و جدید لٹریچر میں موجود ہے جب کہ دوسرے پہلو سے نسبتاً بہت کم کام ہوا ہے۔ خاص طور پر جدید سائنسی تحقیقات نے مذہب کے تجرباتی اثبات کے لیے جو وسیع میدان فراہم کر دیا ہے، وہ تو مجھے بالکل ''سَیُرِیکُمۡ آیَاتِهِ فَتَعۡرِفُونَهَا'' (27:93) کا مصداق معلوم ہوتا ہے۔ یعنی وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھائے گا تو تم ان کو پہچان لوگے۔ موجودہ کتاب، ایک لحاظ سے، اسی نئے پیدا شدہ امکان کو منظم طور پر استعمال کرنے کی ایک کوشش ہے۔

تصنیفات کی جدید تقسیم کے مطابق زیر نظر کتاب معروضی مطالعہ (objective study) کی مثال پیش نہیں کرتی۔ بلکہ وہ موضوعی یا داخلی (subjective) انداز میں لکھی گئی ہے۔ یہ جدید ذہن کے نزدیک گویا کتاب کے خلاف خود کتاب کا ووٹ ہے۔ کیوں کہ جو مطالعہ جانبدارانہ ذہن کے تحت کیا گیا ہو، اس کی صداقت کا یقین کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اس کے جواب میں، میں آسٹرین نومسلم علامہ اسد کا جملہ نقل کروں گا۔ انھوں نے اپنی کتاب کے اسی انداز کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> It does not pretend to be a dispassionate survey of affairs; it is statement of a case of Islam versus western civilisation. (Islam at the Crossroads. p. 6)

یعنی اس کتاب میں مصنوعی طور پر غیر جانبدارانہ سروے کا طریقہ اختیار نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کا انداز ایک مقدمہ جیسا ہے — اسلام کا مقدمہ مغربی تہذیب کے مقابلے میں۔

کتاب میں اکثر ''مذہب'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے کسی کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ کتاب چوں کہ ایک عمومی موضوع پر ہے اس لیے اس کی مناسبت سے عمومی لفظ زیادہ موزوں تھا۔ مصنف کا ذہن اس بارے میں بالکل صاف ہے کہ مذہب سے مراد کوئی موہوم چیز نہیں بلکہ صرف وہ ہے جو آج مذہب کی حیثیت سے خدا کے یہاں مسلم ہے — یعنی اسلام۔ اگر ہندوستان کے کسی شہری سے کہا جائے کہ تمھیں قانون کی پیروی کرنی ہوگی، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی بھی مجموعۂ الفاظ جس پر قانون یا قانونِ ہند کا اطلاق ہوسکتا ہو، بس اس کی پیروی کرلینا کافی ہے۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ قانون جو آج ہندستانی باشندوں کے لیے قانون کی حیثیت رکھتا ہے، اس کو ماننا اور اس کی تعمیل کرنا۔ اسی طرح آج عملی طور پر مذہب سے مراد صرف اسلام ہے۔ اگرچہ لغت کے اعتبار سے اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو مذہب کے نام سے مشہور ہو۔ دوسرے لفظوں میں تاریخی فہرست بندی کے طور پر خواہ جس جس چیز کو مذہب شمار کیا جائے۔ مگر خدا کی پسند کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے آج جو محفوظ مذہب (preserved religion) ہے، وہ صرف اسلام ہے۔ اس لیے اسلام ہی کی پیروی میں آخرت کی نجات ہے، اس کے سوا نجات کی کوئی صورت نہیں۔

یونیورسٹی کے طلبہ کی یونین میں ایک مرتبہ مقالہ پڑھنے کے بعد مجھے ایک سوال سے سابقہ پیش آیا، میں نے اپنے مضمون میں فرائڈ (Sigmund Freud, 1856-1939) کا ایک اقتباس دیا تھا۔ نفسیات کے ایک پروفیسر بھی اتفاق سے مجلس میں موجود تھے۔ انھوں نے مقالہ سننے کے بعد کہا۔ آپ نے فرائڈ کا حوالہ ایک مذہبی بحث میں بطور تائید نقل کیا ہے۔ حالانکہ فرائڈ وہ شخص ہے، جو سرے سے اس مذہبی نقطۂ نظر ہی کے خلاف ہے جس کے آپ نمائندہ ہیں۔

یہی سوال موجودہ کتاب کے بارے میں زیادہ بڑے پیمانے پر کیا جاسکتا ہے کیوں کہ اس میں ایسے بہت سے اقتباسات تائید کے طور پر نقل کیے گئے ہیں جن کے مصنفین کتاب کے اصل مدعا سے اتفاق نہیں کرسکتے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو ''دلیلِ آخرت'' کا آخری اقتباس۔ مگر یہ اعتراض درست

نہیں۔ کیوں کہ ان اقتباسات کی حیثیت یہ نہیں ہے کہ وہ ایک شخص کی ذاتی سند کے طور پر نقل کیے گئے ہیں، یعنی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ چوں کہ فلاں شخص نے اس کی تصدیق کی ہے، اس لیے وہ بات صحیح ہے۔ بلکہ تمام اقتباسات کسی علمی دلیل کی وضاحت میں نقل کیے گئے ہیں۔ مصنف نے ایک دلیل کو پیش کرتے ہوئے کہیں اس کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے اور کہیں دوسرے کے الفاظ میں۔

ان اقتباسات میں جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ عموماً وہ ہیں جو کسی کی ذاتی فکر سے تعلق نہیں رکھتیں، بلکہ وہ علمی دریافتیں ہیں۔ ملحدین نے ان علمی دریافتوں کو لے کر ان کو دوسرے دوسرے معنی پہنائے ہیں اور ہم نے ان کو مذہب کے حق میں پا کر انھیں کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ جو اقتباسات صراحۃً مذہب کی حمایت میں ہیں، وہ عموماً عیسائی علماء کے اقوال ہیں، اور آسمانی مذہب پر عقیدہ رکھنے کی وجہ سے ان کے اس طرح کے اقوال ہمارے لیے اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، زیر نظر کتاب کا موضوع جدید مادی فکر کے مقابلے میں مذہب کا اثبات ہے۔ اس اثبات کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ثابت کیا جائے کہ مذہب ایک غیر مادی چیز ہے۔ اس لیے وہ مادی علوم کی دسترس سے باہر ہے۔ ایسی حالت میں مادی علوم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مذہب کی صداقت پر معترض ہوں۔ اثبات کا یہ انداز اہلِ مذاہب کی طرف سے کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ پھر بیسویں صدی میں اس استدلال میں مزید قوت سائنس کے اس اعتراف سے پیدا ہوگئی ہے — سائنس حقیقت کا صرف جزئی علم دیتی ہے:

Science gives us but a partial knowledge of reality

اس کا مطلب یہ ہے کہ خود مادی علم کے اپنے اعتراف کے مطابق، کچھ ایسے حقائق ہو سکتے ہیں، جو مادی تحقیقات کے دائرے سے باہر ہوں۔ اس جدید امکان پر غالباً سب سے زیادہ کامیاب تصنیف جے۔ ڈبلیو۔ این سولیون کی ہے، جس کا کچھ حصّہ آٹھویں باب کی تیسری بحث میں ملے گا۔

مادی فکر کے مقابلے میں مذہب کے اثبات کی دوسری صورت یہ ہے کہ خود انھیں ذرائع علم کے تحت اس کو ثابت کیا جائے جس کے مطابق مادی علوم میں کسی چیز کو ثابت کیا جاتا ہے۔ زیر نظر

کتاب میں زیادہ تر اسی دوسری صورت کو سادہ انداز میں اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف کی کوشش یہ ہے کہ مادی حقائق کو ثابت کرنے کے لیے موجودہ زمانے میں جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، اسی کو عام فہم انداز میں مذہب کے اثبات کے لیے استعمال کیا جائے۔

یہاں ایک اور بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یہ انداز جس کے تحت اس کتاب میں دین کی حمایت و مدافعت کی گئی ہے، ممکن ہے اہل دین میں سے بعض ذہنوں کو اجنبی یا نامناسب معلوم ہو۔ اگر ایسا ہو تو میں کہوں گا کہ اس کتاب کو اس نظر سے دیکھنا چاہیے کہ یہ ایک متکلمانہ ضرورت کے طور پر لکھی گئی ہے، نہ کہ تشریح دین کے طور پر۔ دین کی مجرد تعبیر و تشریح جو مومن و مسلم طبیعتوں کو سامنے رکھ کر کی جائے اس کا انداز دوسرا ہوتا ہے، لیکن جب سامنے ایسے لوگ ہوں جو ایمان و اسلام کو محض اس قسم کا فریب سمجھتے ہوں اور جب دین و مذہب کے خلاف اٹھائے ہوئے سوالات کا مقابلہ کرنا ہو تو قدرتی طور پر بات کا انداز بدل جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ضروری ہو جاتا ہے کہ معاند کے ذہن کو پیش نظر رکھ کر بات کہی جائے اور اس کی اپنی زبان اور اصطلاحات میں کلام کیا جائے جب کہ مومن و مسلم کا معاملہ ہو تو گفتگو اپنی فطری شکل میں باقی رہتی ہے۔ اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ موجودہ دور میں فکر اور استدلال کا انداز بالکل بدل گیا ہے۔ اس لیے موجودہ دور کا علم کلام بھی پہلے کے مقابلے میں بہت کچھ مختلف ہوگا۔ اگر یہ بات ذہن میں ہو تو کتاب کے مباحث کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔

وحید الدین خاں

26 اگست 1964ء، لکھنؤ

مخالفین مذہب کا مقدمہ

’’جس طرح ایٹم کے ٹوٹنے سے مادہ کے بارے میں انسان کے پچھلے تمام تصورات ختم ہوگئے، اسی طرح پچھلی صدی میں علم کی جو ترقی ہوئی ہے، وہ بھی ایک قسم کا علمی دھماکہ (knowledge explosion) ہے، جس کے بعد خدا اور مذہب کے متعلق تمام پرانے خیالات بھک سے اڑ گئے ہیں۔‘‘ (ہندوستان ٹائمس، سنڈے میگزین، 24 ستمبر 1961ء)۔

یہ جولین ہکسلے کے الفاظ میں علم جدید کا چیلنج ہے، اور ان صفحات میں مجھے اسی چیلنج کا جواب دینا ہے۔ مصنف کا یقین ہے کہ علم کی روشنی مذہب کی صداقت کو اور زیادہ واضح کرنے میں مددگار ہوئی ہے، اس نے کسی بھی اعتبار سے مذہب کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے، دور جدید کی ساری دریافتیں صرف اس بات کا اعتراف ہیں کہ آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے اسلام کا یہ دعویٰ کہ وہ آخری صداقت ہے اور آئندہ کی تمام انسانی معلومات اس کی صداقت کو اور مبرہن کرتی چلی جائیں گی، بالکل صحیح تھا۔

قرآن کے الفاظ یہ ہیں: سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔ یعنی عنقریب ہم دکھائیں گے اپنی نشانیاں ان کو آفاق میں اور خود ان کے اندر یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ وہ حق ہے۔

جدید بے خدا مفکرین کے نزدیک مذہب کوئی حقیقی چیز نہیں ہے، وہ انسان کی صرف اس خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ وہ کائنات کی توجیہ کرنا چاہتا ہے۔ توجیہ تلاش کرنے کا انسانی جذبہ بذاتِ خود غلط نہیں ہے مگر کم تر معلومات نے ہمارے پرانے اجداد کو ان غلط جوابات تک پہنچا دیا جس کو خدا یا مذہب کہا جاتا ہے۔ اب جس طرح بہت سے دوسرے معاملات میں انسان نے اپنی علمی ترقی سے ماضی کی غلطیوں کی اصلاح کی ہے، اسی طرح توجیہ کے معاملے میں بھی وہ آج اس پوزیشن میں ہے کہ اپنی ابتدائی غلطیوں کی اصلاح کر سکے۔

آگسٹ کامٹے(August Comte) جوانیسویں صدی کے نصف اوّل کا فرانسیسی مفکر ہے، اس کے نزدیک انسان کی فکری ارتقا کی تاریخ تین مرحلوں میں تقسیم ہے۔ پہلا مرحلہ الٰہیاتی مرحلہ (Theological Stage) ہے، جب کہ واقعات عالم کی توجیہ خدائی طاقتوں کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ دوسرا مرحلہ مابعدالطبیعیاتی مرحلہ(Metaphysical Stage) ہے،جس میں متعین خدا کا نام تو باقی نہیں رہتا، پھر بھی واقعات کی توجیہ کے لیے خارجی عناصر کا حوالہ دیا جاتا ہے۔تیسرا مرحلہ ثبوتی مرحلہ(positive stage) ہے جب کہ واقعات کی توجیہ ایسے اسباب کے حوالے سے کی جاتی ہے، جو مطالعہ اور مشاہدہ کے عام قوانین کے تحت معلوم ہوتے ہیں، بغیر اس کے کہ کسی روحِ خدا یا مطلق طاقتوں کا نام لیا گیا ہو۔اس فکر کی رو سے اس وقت ہم اسی تیسرے فکری دور سے گزر رہے ہیں، اور اس فکر نے فلسفہ میں جو نام اختیار کیا ہے وہ منطقی ثبوتیت(Logical Positivism) ہے۔

منطقی ثبوتیت یا سائنسی تجربیت(Scientific Empiricim) باقاعدہ تحریک کی شکل میں بیسویں صدی میں شروع ہوئی۔مگر ایک طرزفکر کی حیثیت سے یہ پہلے ذہنوں میں پیدا ہو چکی تھی۔اس کی پشت پر ہیوم (Hume) اور مل(Mill) سے لے کر رسل(Russell) تک درجنوں ممتاز مفکرین کے نام ہیں، اور اب ساری دنیا میں اپنے تبلیغی اور تحقیقی اداروں کے ساتھ وہ موجودہ زمانے کا اہم ترین طریق فکر بن چکا ہے۔

ڈکشنری آف فلاسفی(مطبوعہ نیویارک) میں اس طریق فکر کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی گئی ہے:

"Every knowledge that is factual, is connected with experiences in such a way that verification or direct or indirect confirmation is possible." (P. 285)

یعنی ہر وہ علم جو حقیقی ہے، وہ تجربات سے اس طور پر متعلق ہوتا ہے کہ اس کی جانچ یا براہِ راست یا بالواسطہ طریقہ سے اس کی تصدیق حاصل کرنا ممکن ہو۔اس طرح مخالفین مذہب کے نزدیک صورت حال یہ بنتی ہے کہ ارتقا کے عمل نے انسان کو آج جس اعلیٰ ترین مقام تک پہنچایا ہے، وہ عین اپنے طریق

فکر کے اعتبار سے مذہب کی تردید ہے۔ کیوں کہ جدید ارتقا یافتہ علم نے ہمیں بتایا ہے کہ حقیقت صرف وہی ہو سکتی ہے جو تجربہ اور مشاہدہ میں آئی ہو۔ جب کہ مذہب کی بنیاد حقیقت کے ایک ایسے تصور پر ہے جو سرے سے مشاہدے اور تجربے میں آ ہی نہیں سکتی، دوسرے لفظوں میں واقعات و حوادث کی الٰہیاتی توجیہ ترقی یافتہ ذرائع سے ثابت نہیں ہوتی اس لیے وہ غیر حقیقی ہے۔

اس طریق فکر کے مطابق مذہب، حقیقی واقعات کی غیر حقیقی توجیہ ہے۔ پہلے زمانے میں انسان کا علم چوں کہ بہت محدود تھا، اس لیے واقعات کی صحیح توجیہ میں اسے کامیابی نہیں ہوئی اور اس نے مذہب کے نام سے عجیب عجیب مفروضے قائم کر لیے، مگر ارتقا کے عالمگیر قانون نے آدمی کو اس اندھیرے سے نکال دیا ہے، اور جدید معلومات کی روشنی میں یہ ممکن ہو گیا ہے کہ اٹکل پچّو عقائد پر ایمان رکھنے کے بجائے خالص تجرباتی اور مشاہداتی ذرائع سے اشیا کی حقیقت معلوم کی جائے۔[1] چنانچہ وہ تمام چیزیں جن کو پہلے مافوق الطبیعاتی اسباب کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا، اب بالکل فطری اسباب کے تحت ان کی تشریح معلوم کر لی گئی ہے۔ جدید طریق مطالعہ نے ہمیں بتا دیا ہے کہ خدا کا وجود فرض کرنا انسان کی کوئی واقعی دریافت نہیں تھی، بلکہ یہ محض دور لاعلمی کے قیاسات تھے جو علم کی روشنی پھیلنے کے بعد خود بخود ختم ہو گئے ہیں۔ جولین ہکسلے لکھتا ہے:

> ”نیوٹن نے دکھا دیا ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے، جو سیاروں کی گردش پر حکومت کرتا ہو، لاپلاس نے اپنے مشہور نظریے سے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ فلکی نظام کو خدائی مفروضہ کی کوئی ضرورت نہیں، ڈارون اور پاسچر نے یہی کام حیاتیات کے میدان میں کیا ہے، اور موجودہ صدی میں علم النفس کی ترقی اور تاریخی معلومات کے اضافے نے خدا

---

(1) منطقی ثبوتیت کی تنقید کو دوسری طرح یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ماضی کے علمائے مذاہب کی مثال ایسے شخص کی سی ہے، جس نے بیکار چیک (Dud Cheque) لکھ دیا ہو جس کے لیے بنک میں واقعی رقم موجود نہ ہو۔ یہ لوگ ایسے الفاظ استعمال کرتے رہے، جس کے پیچھے معنویت کا سرمایہ نہیں، ”ناقابلِ تغیر حقیقت اعلیٰ“ قواعد زبان کی رو سے ایک صحیح جملہ ہے۔ مگر وہ ایک بے کار چک ہے جس کے پیچھے کوئی حقیقی سرمایہ نہیں۔“ *Religion and the Scientific Outlook*, p. 20

کو اس مفروضہ مقام سے ہٹادیا ہے کہ وہ انسانی زندگی اورتاریخ کوکنٹرول کرنے والا ہے۔‘‘

Religion without Revelation, New York, 1958, p. 58

یعنی طبیعیات،نفسیات اورتاریخ،تینوں علوم نے یہ ثابت کردیا ہے کہ جن واقعات کی توجیہ کے لیے پچھلے انسان نے خدااور دیوتا کا وجود فرض کرلیا تھا، یا مجرد طاقتوں کو ماننے لگا تھا، اس کے اسباب دوسرے تھے،مگرناواقفیت کی وجہ سے وہ مذہب کی پراسرار اصطلاحوں میں بات کرتا رہا۔

1۔طبیعیاتی دنیامیں اس انقلاب کا ہیرو نیوٹن ہے۔جس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کائنات کچھ ناقابل تغیر اصولوں میں بندھی ہوئی ہے۔کچھ قوانین ہیں،جن کے تحت تمام اجرام سماوی حرکت کر رہے ہیں۔بعد کو دوسرے بے شمار لوگوں نے اس تحقیق کو آگے بڑھایا۔یہاں تک کہ زمین سے لے کر آسمان تک سارے واقعات ایک اٹل نظام کے تحت ظاہر ہوتے ہوئے نظر آئے جس کو قانون فطرت (Law of Nature) کا نام دیا گیا،اس دریافت کے بعد قدرتی طور پر یہ تصورختم ہوجاتا ہے کہ کائنات کے پیچھے کوئی فعال اورقادرخدا ہے، جواس کو چلا رہا ہے،زیادہ سے زیادہ گنجائش اگر ہوسکتی ہے تو ایسے خدا کی جس نے ابتدامیں کائنات کوحرکت دی ہو۔چنانچہ شروع میں لوگ محرّکِ اول کے طورپرخدا کو مانتے رہے، والٹیر نے کہا کہ خدانے اس کائنات کو بالکل اسی طرح بنایا ہے، جس طرح ایک گھڑی سازگھڑی کے پرزے جمع کرکے انھیں ایک خاص شکل میں ترتیب دے دیتا ہے، اوراس کے بعدگھڑی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔اس کے بعد ہیوم نے اس ’’بے جان اور بے کارخدا‘‘ کوبھی یہ کہہ کرختم کردیا کہ ہم نے گھڑیاں بنتے ہوئے تو دیکھی ہیں،لیکن دنیائیں بنتی ہوئی نہیں دیکھیں،اس لیے کیوں کرایسا ہوسکتا ہے کہ ہم خدا کو مانیں۔

سائنس کی ترقی اورعلم کے پھیلاؤ نے اب انسان کو وہ کچھ دکھا دیا ہے،جس کو پہلے اس نے دیکھا نہیں تھا۔واقعات کی جن کڑیوں کو نہ جاننے کی وجہ سے ہم سمجھ نہیں سکتے تھے کہ یہ واقعہ کیوں ہوا، وہ اب واقعات کی تمام کڑیوں کے سامنے آجانے کی وجہ سے ایک جانی بوجھی چیزبن گیا ہے۔

مثلاً پہلے آدمی یہ نہیں جانتا تھا کہ سورج کیسے نکلتا اور ڈوبتا ہے۔ اس لیے اس نے سمجھ لیا کہ کوئی خدا ہے جو سورج کو نکالتا ہے اور اس کو غروب کرتا ہے، اس طرح ایک مافوق الفطری طاقت کا خیال پیدا ہوا، اور جس چیز کو آدمی نہیں جانتا تھا، اس کے متعلق کہہ دیا کہ یہ اسی طاقت کا کرشمہ ہے، مگر اب جب کہ ہم جانتے ہیں کہ سورج کا نکلنا اور ڈوبنا، اس کے گرد زمین کے گھومنے کی وجہ سے ہوتا ہے، تو سورج کو نکالنے اور غروب کرنے کے لیے خدا کو ماننے کی کیا ضرورت؟ اسی طرح وہ تمام چیزیں جن کے متعلق پہلے سمجھا جاتا تھا کہ ان کے پیچھے کوئی اَن دیکھی طاقت کام کر رہی ہے، وہ سب جدید مطالعہ کے بعد ہماری جانی پہچانی فطری طاقتوں کے عمل اور ردعمل کا نتیجہ نظر آیا— گویا واقعہ کے فطری اسباب معلوم ہونے کے بعد وہ ضرورت آپ سے آپ ختم ہوگئی جس کے لیے پہلے لوگوں نے ایک خدا یا مافوق الفطری طاقت کا وجود فرض کر لیا تھا۔ ''اگر قوس قزح گرتی ہوئی بارش پر سورج کی شعاعوں کے انعطاف (refraction) سے پیدا ہوتی ہے تو یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ آسمان کے اوپر خدا کا نشان ہے۔''— ہکسلے اس قسم کے واقعات پیش کرتا ہوا کس قدر یقین کے ساتھ کہتا ہے:

"If events are due to natural causes, they are not due to supernatural causes."

J. Huxley, *Religion without Revelation*, 1929, p. 46

یعنی واقعات اگر فطری اسباب کے تحت صادر ہوتے ہیں تو وہ مافوق الفطری اسباب کے پیدا کیے ہوئے نہیں ہو سکتے۔

2۔ اس کے بعد نفسیات کی تحقیق کی گئی تو اس نقطۂ نظر پر مزید یقین حاصل ہو گیا۔ کیوں کہ اس سے معلوم ہوا کہ مذہب، انسان کے اپنے لاشعور کی پیداوار ہے نہ کہ فی الواقع کسی خارجی حقیقت کا انکشاف، ایک عالم کے الفاظ میں:

"God is nothing but a projection of man on a cosmic screen."

یعنی خدا کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ کائناتی سطح پر انسان کی ہستی کا ایک خیالی

انعکاس ہے، دوسری دنیا کا عقیدہ انسان کی اپنی آرزوؤں کی ایک خوبصورت تصویر (Beautiful Idealisation of Human Wishes) سے [۱] زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ وحی والہام محض بچپن میں دبے ہوئے خیالات (childhood repressions) کا ایک غیر معمولی اظہار ہیں۔

ان تمام خیالات کی بنیاد نظریۂ لاشعور پر قائم ہے۔ جدید تحقیق سے معلوم ہوا کہ انسان کا ذہن دو بڑے خانوں پر منقسم ہے۔ ایک خانہ وہ جس کو شعور کہتے ہیں، یہ ہمارے ان افکار کا مرکز ہے جو عام طور پر ہوش وحواس کی حالت میں شعوری طور پر ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، دوسرا خانہ لاشعور ہے۔ اس حصۂ ذہن کے خیالات عام طور پر ہمارے علم وحافظہ کے سامنے نہیں ہوتے مگر وہ اس کی تہ میں موجود رہتے ہیں، اور غیر معمولی حالات میں یا سوتے وقت خواب میں ظاہر ہوتے ہیں، انسان کے بیشتر خیالات اسی لاشعور کے خانے میں جا کر محفوظ ہو جاتے ہیں، اور اس اعتبار سے ذہن کا شعوری حصہ اس کے لاشعور سے بہت کم ہے۔ چنانچہ دونوں کا تناسب ظاہر کرنے کے لیے سمندر کے برفانی تودہ (iceberg) کی مثال دی جاتی ہے، جس کے نو حصے کیے جائیں تو آٹھ حصے پانی میں ڈوبے ہوئے ہوں گے اور صرف ایک حصہ اوپر دیکھنے والوں کو نظر آئے گا (اگرچہ یہ تناسب بھی اضافی ہے)۔

فرائڈ نے طویل تحقیق کے بعد انکشاف کیا کہ بچپن میں انسان کے لاشعور میں کچھ ایسی چیزیں بیٹھ جاتی ہیں، جو بعد میں غیر عقلی رویے کا باعث بنتی ہیں۔ یہی صورت مذہبی عقائد کی ہے، مثلاً دوسری دنیا اور جنّت کا تصور دراصل ان آرزوؤں کی صدائے بازگشت ہے، جو بچپن میں آدمی کے ذہن میں پیدا ہوئیں، مگر حالات سازگار نہ ہونے کہ وجہ سے پوری نہیں ہوئیں اور دب کر لاشعور میں باقی رہ گئیں۔ بعد کو لاشعور نے اپنی تسکین کے لیے ایک ایسی دنیا فرض کر لی جہاں وہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل کر سکے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی شخص اپنی ایک محبوب چیز کو واقعی دنیا میں نہ پا سکا تو وہ نیند کی حالت میں خواب دیکھتا ہے کہ وہ اس سے ہم کنار ہو رہا ہے۔ اسی طرح بچپن کی بہت سے باتیں جو لاشعور میں تہ نشیں ہو کر بظاہر حافظہ سے نکل گئی تھیں، وہ غیر معمولی حالات مثلاً جنون یا ہسٹریا میں یکا یک زبان پر جاری

---

(۱) The Iqbal Review, (Lahore), April, 1962

ہوگئیں تو سمجھ لیا گیا کہ یہ کوئی ماورائی طاقت ہے جو انسان کی زبان سے کلام کررہی ہے ۔اسی طرح بڑے اور چھوٹے کے فرق (father complex) نے خدااور بندے کا تصور پیدا کیا، اور جو چیز محض ایک سماجی برائی تھی، اس کو کائناتی سطح پر رکھ کر ایک نظریہ گڑھ لیا گیا۔ لنٹن (Ralph Linton) لکھتا ہے:

’’ایک ایسے قادر مطلق کا تصور جس کے کام خواہ کتنے ہی غیر منصفانہ معلوم ہوں مگر وہ مکمل فرمانبرداری اور وفاداری ہی کے ذریعہ خوش کیا جاسکتا ہے، براہِ راست سامی عائلی نظام کی پیداوار تھا۔اس عائلی نظام نے مبالغہ آمیز فوق الفطری انانیت کو جنم دیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قانون موسوی کی شکل میں انسانی زندگی اور رویہ کے ہر پہلو کے متعلق محرمات کی ایک مفصل فہرست تیار ہوگئی ۔محرمات کا یہ سلسلہ ان لوگوں نے گرہ میں باندھ لیا جو بچپن میں اپنے باپ کے احکام کو یاد رکھنے اور احتیاط سے اس پر عمل کرنے کے عادی ہو چکے تھے ۔خدا کا تصور مخصوص قسم کے سامی باپ کا پرتو ہے، جس کے اختیارات اور اوصاف میں تجرد اور مبالغہ پیدا کردیا گیا ہے۔‘‘

The Hebrew picture of an all-powerful deity who could only be placated by complete submission and protestations of devotion, no matter how unjust his acts might appear, was a direct outgrowth of this general Semitic family situation. Another product of the exaggerated superego to which it gave rise was the elaborate system of taboos relating to every aspect of behaviour. One system of this sort has been recorded and confided in the Laws of Moses. All Semitic tribes had similar series of regulation differing only in content. Such codes provided those who kept them with a sense of security, comparable to that of the good child who is able to remember everything that his father ever told him not to do and carefully abstains from doing it. The Hebrew Yahveh was a portrait of the Semitic father with his

patriarchal authoritarian qualities abstracted and exaggerated.

The Tree of Culture, Ralph Linton
New York, Alfred A, Knopf , 1956, p. 288

3۔مذہب کے خلاف مقدمے کی تیسری بنیاد تاریخ ہے۔مخالفین مذہب کا دعویٰ ہے کہ ہم نے تاریخ کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ مذہبی تصورات پیدا ہونے کی وجہ وہ مخصوص تاریخی حالات ہیں، جو اس سے پہلے انسان کو گھیرے ہوئے تھے۔قدیم زمانے میں سائنس کی دریافتوں سے پہلے سیلاب، طوفان اور بیماری وغیرہ سے بچنے کا انسان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ مستقل طور پر اپنے آپ کو غیر محفوظ زندگی میں پاتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنی تسکین کے لیے کچھ ایسی غیر معمولی طاقتیں فرض کرلیں، جن کو وہ مصیبت کے وقت پکارے اور جن سے دفعِ بلا کی امید رکھے۔اسی طرح سماج کے اندر باہمی پیوستگی پیدا کرنے اور ایک مرکز کے گرد لوگوں کو جوڑے رکھنے کے لیے بھی کسی چیز کی ضرورت تھی۔ یہ کام اس نے ایسے معبودوں سے لیا جو سارے انسانوں کے اوپر ہوں اور جن کی مرضی حاصل کرنا ہر ایک کے لیے ضروری ہو، وغیرہ غیرہ،علوم اجتماعی کی انسائیکلو پیڈیا میں مذہب (Religion) کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

’’جس طرح دوسرے اسباب مذہب کو پیدا کرنے میں اثر انداز ہوئے ہیں، اسی طرح اس میں سیاسی اور تمدنی حالات کا بھی دخل رہا ہے۔خداؤں کے نام اور ان کی صفات خود بخود وقت کے نظام سلطنت کی صورت میں ڈھل گئے۔ خدا کو بادشاہ ماننے کا عقیدہ محض انسانی بادشاہت کی بدلی ہوئی شکل ہے، اور آسمانی بادشاہت صرف زمینی بادشاہت کا ایک چربہ ہے۔نیز چوں کہ بادشاہ سب سے بڑا جج بھی ہوتا تھا، اسی طرح خدا کو بھی عدالت کی کارروائیاں سپرد کردی گئیں اور یہ عقیدہ بن گیا کہ وہ انسان کی بدی یا نیکی کے بارے میں آخری فیصلہ کرے گا۔اس قسم کا عدالتی تصور جو خدا کو حساب لینے والا اور اختیار والا مانتا ہے، اس نے نہ صرف یہودیت میں بلکہ عیسائیت اور اسلام کے مذہبی نقطۂ نظر میں بھی مرکزی مقام حاصل کرلیا ہے۔‘‘

Encyclopaedia of Social Sciences, 1957, Vol. 13, p.233

اس طرح مخصوص تاریخی دور کے حالات اوران حالات کے ساتھ انسانی ذہن کے باہمی تعامل نے وہ تصورات پیدا کیے جن کو مذہب کہا جاتا ہے۔ ''مذہب انسانی ذہن کی پیداوار ہے جو عدم واقفیت اور خارجی قوتوں کے مقابلے میں بے سہارا ہونے کی ایک خاص حالت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے''۔ جولین ہکسلے یہ ریمارک دیتا ہوا لکھتا ہے:

"Religion is the product of a certain type of interaction between man and his environment."

Man in the Modern World, 1950, Britain, p. 132

یعنی مذہب نتیجہ ہے۔ انسان اور اس کے ماحول کے درمیان ایک خاص طرح کے تعامل کا۔ اب چوں کہ وہ مخصوص ماحول ختم ہو گیا ہے، یا کم از کم ختم ہو رہا ہے، جو اس طرح کے تعامل کو وجود میں لانے کا ذمہ دار تھا۔ اس لیے اب مذہب کو زندہ رکھنے کی بھی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ ہکسلے مزید لکھتا ہے:

''خدا کا تصور اپنی افادیت کے آخری مقام پر پہنچ چکا ہے، اب وہ مزید ترقی نہیں کر سکتا۔ مافوق الفطری طاقتیں دراصل مذہب کا بوجھ اٹھانے کے لیے انسانی ذہن نے اختراع کی تھیں۔ پہلے جادو پیدا ہوا، پھر روحانی تصرفات نے اس کی جگہ لی، پھر دیوتاؤں کا عقیدہ ابھرا اور اس کے بعد ایک خدا کا تصور آیا۔ اس طرح ارتقائی مراحل سے گزر کر مذہب اپنی آخری حد کو پہنچ کر ختم ہو چکا ہے۔ کسی وقت یہ خدا ہماری تہذیب کے ضروری مفروضے اور مفید تخیلات تھے، مگر اب جدید ترقی یافتہ سماج میں وہ اپنی ضرورت اور افادیت کھو چکے ہیں۔''

The concept of God has reached the limits of its usefulness : it cannot evolve further. Supernatural powers were created by man to carry the burden of religion. From diffuse magic *mana* to personal spirits; from spirits to gods; from gods to God—so crudely speaking, the evolution has gone. The particular phase of that evolution which concerns us is that of gods. In one period of our western civilization the gods were

necessary fictions, useful hypotheses by which to live.

Man in the Modern World, 1950, Britain, p. 134

اشتراکی فلسفہ کے نزدیک بھی مذہب ایک تاریخی فریب ہے۔ البتہ اشتراکیت چوں کہ تاریخ کا مطالعہ تمام تر اقتصادیات کی روشنی میں کرتی ہے۔ اس لیے اس نے تمام تاریخی اسباب کو سمیٹ کر صرف اقتصادی اسباب میں مرکوز کردیا۔ اس کے نزدیک مذہب کو جن تاریخی حالات نے پیدا کیا وہ دورِقدیم کا جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام تھا۔ اب چوں کہ یہ فرسودہ نظام اپنی موت مر رہا ہے۔ اس لیے مذہب کو بھی اسی کے ساتھ ختم سمجھنا چاہیے۔ انگلس کے الفاظ میں "تمام اخلاقی نظریے، اپنے آخری تجزیے میں، وقت کے اقتصادی حالات کی پیداوار ہیں"۔

Antzs Duhring, Moscow, 1954 , p. 131

انسانی تاریخ طبقاتی لڑائیوں کی تاریخ ہے جس میں سربرآوردہ طبقہ پسماندہ طبقہ کا استحصال کرتا رہا ہے، اور مذہب و اخلاق صرف وضع کیے گئے تاکہ سربرآوردہ طبقہ کے مفادات کو محفوظ کرنے کے لیے نظریاتی بنیاد حاصل ہو سکے۔

"قانون، اخلاق، مذہب، سب بورژوا کی فریب کاری ہے، جس کی آڑ میں اس کے بہت سے مفادات چھپے ہوئے ہیں۔" (کمیونسٹ مینی فسٹو)

نوجوان کمیونسٹ لیگ کی تیسری کل روس کانگریس (اکتوبر 1920) میں لینن نے کہا تھا:

"یقیناً ہم خدا کو نہیں مانتے۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ اربابِ کلیسا، زمیندار اور بورژوا طبقہ جو خدا کے حوالے سے کلام کرتے ہیں وہ محض استحصال کرنے والے کی حیثیت سے اپنے مفادات کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ایسے تمام اخلاقی ضابطوں کا انکار کرتے ہیں، جو انسانوں سے ماورا کسی مافوق طاقت سے اخذ کیے گئے ہوں یا طبقاتی تصور پر مبنی نہ ہوں، ہم کہتے ہیں کہ یہ ایک دھوکا ہے، ایک فریب ہے، زمینداروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کے لیے مزدوروں اور کسانوں کی فکر پر پردہ ڈالنا (befogging of the minds) ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ضابطۂ اخلاق تمام تر صرف پرولتاریہ کی طبقاتی جدوجہد کے تابع ہے، ہمارے

اخلاقی اصول کاماخذ پرولتاریہ کی طبقاتی جدوجہد کا مفاد ہے۔‘‘(لینن سلکٹڈ ورکس، ماسکو،1947،جلد2صفحہ667)

یہ ہے مخالفین مذہب کاوہ مقدمہ جس کی بنیاپر دورجدید کے بہت سےلوگ ،فزیالوجی کے ایک امریکی پروفیسرکے الفاظ میں، کہتے ہیں— سائنس نے ثابت کردیاہے کہ مذہب تاریخ کاسب سےزیادہ دردناک اورسب سے بدترین ڈھونگ تھا:

Science has shown religion to be history's cruelest and wickedest hoax.

Quoted by C. A. Coulson, *Science and Christian Belief*, p. 4

تبصرہ

پچھلے صفحات میں ہم نے ان مخالف مذہب استدلالات کا ذکر کیا ہے، جو اس بات کے ثبوت کے لیے پیش کیے جاتے ہیں کہ دورِ جدید نے مذہب کے لیے کوئی علمی گنجائش باقی نہیں رکھی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ایک بے بنیاد دعویٰ ہے۔، جدید طریقِ فکر نے مذہب کو کسی بھی درجہ میں کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ اگلے ابواب میں ہم مذہب کے بنیادی تصورات کو ایک ایک کر کے لیں گے اور دکھائیں گے کہ کس طرح مذہب آج بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے، جیسے کہ وہ پہلے تھا۔ یہاں گزشتہ دلائل پر ایک عمومی تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔

1۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس دلیل کو لیجیے، جو طبیعیاتی تحقیق کے حوالے سے پیش کی گئی ہے، یعنی کائنات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں جو واقعات ہو رہے ہیں، وہ ایک متعین قانونِ فطرت کے مطابق ہو رہے ہیں، اس لیے ان کی توجیہ کرنے کے لیے کسی نا معلوم خدا کا وجود فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ معلوم قوانین خود اس کی توجیہ کے لیے موجود ہیں۔ اس استدلال کا بہترین جواب وہ ہے جو ایک عیسائی عالم نے دیا ہے، اس نے کہا:

"Nature is a fact, not an explanation"

یعنی فطرت کا قانون کائنات کا ایک واقعہ ہے، وہ کائنات کی توجیہ نہیں ہے۔ تمھارا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہم نے فطرت کے قوانین معلوم کر لیے ہیں۔ مگر تم نے جو چیز معلوم کی ہے وہ اس مسئلے کا جواب نہیں، جس کے جواب کے طور پر مذہب وجود میں آیا ہے۔ مذہب یہ بتاتا ہے کہ وہ اصل اسباب و محرکات کیا ہیں جو کائنات کے پیچھے کام کر رہے ہیں۔ جب کہ تمھاری دریافت صرف اس مسئلہ سے متعلق ہے کہ کائنات جو ہماری سامنے کھڑی نظر آتی ہے، اس کا ظاہری ڈھانچہ کیا ہے۔ جدید علم جو کچھ ہمیں بتاتا ہے وہ صرف واقعات کی مزید تفصیل ہے، نہ کہ اصل واقعہ کی توجیہ۔ سائنس کا سارا علم اس سے متعلق ہے کہ "جو کچھ ہے وہ کیا ہے"۔ یہ بات اس کی دسترس سے باہر ہے کہ "جو کچھ ہے، وہ

کیوں ہے''۔ جب کہ توجیہ کا تعلق اسی دوسرے پہلو سے ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھیے۔ مرغی کا بچہ انڈے کے مضبوط خول کے اندر پرورش پاتا ہے، اور اس کے ٹوٹنے سے باہر آتا ہے۔ یہ واقعہ کیوں کر ہوتا ہے کہ خول ٹوٹے اور بچہ جو گوشت کے لوتھڑے سے زیادہ نہیں ہوتا، وہ باہر نکل آئے۔ پہلے انسان اس کا جواب یہ دیتا تھا کہ ''خدا ایسا کرتا ہے''۔ مگر اب خوردبینی مشاہدہ کے بعد معلوم ہوا کہ 21 روز کی مدت پوری ہونے والی ہوتی ہے، اس وقت ننھے بچے کی چونچ پر ایک نہایت چھوٹی سے سخت سینگ ظاہر ہوتی ہے، اس کی مدد سے وہ اپنے خول کو توڑ کر باہر آجاتا ہے۔ سینگ اپنا کام پورا کر کے بچہ کی پیدائش کے چند دن بعد خود بخود جھڑ جاتی ہے۔

مخالفین مذہب کے نظریے کے مطابق یہ مشاہدہ اس پرانے خیال کو غلط ثابت کر دیتا ہے کہ بچہ کو باہر نکالنے والا خدا ہے۔ کیوں کہ خوردبین کی آنکھ ہم کو صاف طور پر دکھا رہی ہے کہ ایک 21 روزہ قانون ہے جس کے تحت وہ صورتیں پیدا ہوتی ہیں، جو بچہ کو خول کے باہر لاتی ہیں۔ مگر یہ مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ جدید مشاہدہ نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے، وہ صرف واقعہ کی چند مزید کڑیاں ہیں، اس نے واقعہ کا اصل سبب نہیں بتایا۔ اس مشاہدہ کے صورت حال میں جو فرق پیدا ہوا ہے، وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ پہلے جو سوال خول کے ٹوٹنے کے بارے میں تھا، وہ ''سینگ'' کے اوپر جا کر ٹھہر گیا۔ بچہ کا اپنی سینگ سے خول کو توڑنا واقعہ کی صرف ایک درمیانی کڑی ہے، وہ واقعہ کا سبب نہیں ہے۔ واقعہ کا سبب تو اس وقت معلوم ہوگا جب ہم جان لیں کہ چونچ پر سینگ کیسے ظاہر ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں اس آخری سبب کا پتہ لگا لیں، جو بچہ کی اس ضرورت سے واقف تھا کہ اس کو خول سے باہر نکلنے کے لیے کسی سخت مددگار کی ضرورت ہے، اور اس نے مادہ کو مجبور کیا کہ عین اس وقت پر ٹھیک 21 روز بعد بچہ کی چونچ پر ایک ایسی سینگ کی شکل میں نمودار ہو جو اپنا کام پورا کرنے کے بعد جھڑ جائے۔ گویا پہلے یہ سوال تھا کہ ''خول کیسے ٹوٹتا ہے''، اور اب سوال یہ ہو گیا کہ ''سینگ کیسے بنتی ہے''۔ ظاہر ہے کہ دونوں حالتوں میں کوئی نوعی فرق نہیں۔ اس کو زیادہ سے زیادہ حقیقت کا وسیع تر مشاہدہ کہہ سکتے ہیں حقیقت کی توجیہ کا نام نہیں دے سکتے۔

یہاں میں ایک امریکی عالم حیاتیات (Cecil Boyce Hamann, 1913-1984) کے الفاظ نقل کروں گا:

''غذا ہضم ہونے اور اس کے جزء بدن بننے کے حیرت انگیز عمل کو پہلے خدا کی طرف منسوب کیا جاتا تھا، اب جدید مشاہدہ میں وہ کیمیائی ردِعمل کا نتیجہ نظر آتا ہے۔ مگر کیا اس کی وجہ سے خدا کے وجود کی نفی ہوگئی۔ آخر کون طاقت ہے، جس نے کیمیائی اجزاء کو پابند کیا کہ وہ اس قسم کا مفید ردِعمل ظاہر کریں۔ غذا انسان کے جسم میں داخل ہونے کے بعد ایک عجیب و غریب خودکار انتظام کے تحت جس طرح مختلف مراحل سے گزرتی ہے۔ اس کو دیکھنے کے بعد یہ بات بالکل خارج از بحث معلوم ہوتی ہے کہ حیرت انگیز انتظام محض اتفاق سے وجود میں آگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مشاہدہ کے بعد تو اور زیادہ ضروری ہوگیا ہے کہ ہم یہ مانیں کہ خدا اپنے ان عظیم قوانین کے ذریعہ عمل کرتا ہے، جس کے تحت اس نے زندگی کو وجود دیا ہے۔''

The Evidence of God in an Exapanding Universe, p. 221

اس سے آپ جدید دریافتوں کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ سائنس نے کائنات کے بارے میں انسان کے مشاہدے کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اس نے دکھا دیا ہے کہ وہ کون سے فطری قوانین ہیں، جن میں یہ کائنات جکڑی ہوئی ہے، اور جس کے تحت وہ حرکت کر رہی ہے۔ مثلاً پہلے آدمی صرف یہ جانتا تھا کہ پانی برستا ہے، مگر اب سمندر کی بھاپ اٹھنے سے لے کر بارش کے قطرے زمین پر گرنے تک کا وہ پورا عمل انسان کو معلوم ہوگیا ہے، جس کے مطابق بارش کا واقعہ ہوتا ہے۔ مگر یہ ساری دریافتیں صرف واقعہ کی تصویر ہیں، وہ واقعہ کی توجیہ نہیں ہیں۔ سائنس یہ نہیں بتاتی کہ فطرت کے قوانین کیسے بن گئے۔ وہ کیسے اس قدر مفید شکل میں مسلسل طور پر زمین و آسمان میں قائم ہیں، اور اس صحت کے ساتھ قائم ہیں کہ ان کی بنیاد پر سائنس میں قوانین مرتب کیے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرت جس کو معلوم کر لینے کا مدعی بن کر انسان یہ کہنے لگا ہے اس نے کائنات کی توجیہ دریافت کر لی، وہ محض دھوکا ہے۔ یہ ایک غیر متعلق بات کو سوال کا جواب بنا کر پیش کرنا ہے۔ یہ

درمیانی کڑی کو آخری کڑی قرار دینا ہے۔ یہاں پھر میں مذکورہ عالم کے الفاظ دہراؤں گا—فطرت کائنات کی توجیہ نہیں کرتی، وہ خود اپنے لیے توجیہ کی طالب ہے:

Nature does not explain, she herself is in need of an explanation.

اگر آپ کسی ڈاکٹر سے پوچھیں کہ خون سرخ کیوں ہوتا ہے، تو وہ جواب دے گا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ خون میں نہایت چھوٹے چھوٹے سرخ اجزا ہوتے ہیں (ایک انچ کے سات ہزارویں حصہ کے برابر) یہی سرخ ذرات خون کو سرخ کرنے کا سبب ہیں۔

''درست، مگر یہ ذرات سرخ کیوں ہوتے ہیں۔''

''ان ذرات میں ایک خاص مادہ ہوتا ہے، جس کا نام ہیموگلوبین (Haemoglobin) ہے۔ یہ مادہ جب پھیپھڑے میں آکسیجن جذب کرتا ہے تو گہرا سرخ ہو جاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، مگر ہیموگلوبین کے حامل سرخ ذرات کہاں سے آئے۔''

''وہ آپ کی تلی میں بن کر تیار ہوتے ہیں۔''

''ڈاکٹر صاحب! جو کچھ آپ نے فرمایا وہ بہت عجیب ہے، مگر مجھے بتائیے کہ ایسا کیوں ہے کہ خون، سرخ ذرات، تلی اور دوسری ہزاروں چیزیں اس طرح ایک کُل کے اندر باہم مربوط ہیں، اور اس قدر صحت کے ساتھ اپنا اپنا عمل کر رہی ہیں۔''

''یہ قدرت کا قانون ہے۔''

''وہ کیا چیز ہے جس کو آپ قانون قدرت کہتے ہیں۔''

''اس سے مراد ہے طبیعی اور کیمیائی طاقتوں کا اندھا عمل (Blind interplay of physical and chemical forces)۔

''مگر کیا وجہ ہے کہ یہ اندھی طاقتیں ہمیشہ ایسی سمت میں عمل کرتی ہیں، جو انھیں ایک متعین انجام کی طرف لے جائے۔ کیسے وہ اپنی سرگرمیوں کو اس طرح منظم کرتی ہیں کہ ایک چڑیا اڑنے کے قابل ہو سکے، ایک مچھلی تیر سکے، ایک انسان اپنی مخصوص

صلاحیتوں کے ساتھ وجود میں آئے۔"

"میرے دوست مجھ سے یہ نہ پوچھو۔ سائنس داں صرف یہ بتا سکتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ، وہ کیا ہے ۔ اس کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے۔"

یہ سوال و جواب واضح کر رہا ہے کہ سائنسی دریافتوں کی حقیقت کیا ہے۔ بلاشبہ سائنس نے ہم کو بہت سی نئی نئی باتیں بتائی ہیں، مگر مذہب جس سوال کا جواب ہے، اس کا ان دریافتوں سے کوئی تعلق نہیں، اس قسم کی دریافتیں اگر موجودہ مقدار کے مقابلے میں اربوں کھربوں گنا بڑھ جائیں، جب بھی مذہب کی ضرورت باقی رہے گی، کیوں کہ یہ دریافتیں صرف ہونے والے واقعات کو بتاتی ہیں، یہ واقعات کیوں ہو رہے ہیں اور ان کا آخری سبب کیا ہے، اس کا جواب ان دریافتوں کے اندر نہیں ہے، یہ تمام کی تمام دریافتیں صرف درمیانی تشریح ہیں، جب کہ مذہب کی جگہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ آخری اور کلی تشریح دریافت کر لی جائے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی مشین کے اوپر ڈھکن لگا ہوا ہو تو ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ چل رہی ہے، اگر ڈھکن اتار دیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ باہر کا چکّر کس طرح اور ایک چکّر سے چل رہا ہے، اور وہ چکر کس طرح دوسرے بہت سے پرزوں سے مل کر حرکت کرتا ہے، یہاں تک کہ ہوسکتا ہے کہ ہم اس کے سارے پرزوں اور اس کی پوری حرکت دیکھ لیں، مگر کیا اس علم کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے مشین کے خالق اور اس کے سبب حرکت کا راز بھی معلوم کر لیا ، کیا کسی مشین کی کارکردگی کو جان لینے سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ خود بخود بن گئی ہے، اور اپنے آپ چلی جا رہی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کائنات کی کارکردگی کی بعض جھلکیاں دیکھنے سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ یہ سارا کارخانہ اپنے آپ قائم ہوا، اور اپنے آپ چلا جا رہا ہے۔ ہیریس (A. Harris) نے یہی بات کہی تھی، جب اس نے ڈارونزم پر تنقید کرتے ہوئے کہا:

"Natural selection may explain the survival of the fittest, but cannot explain the arrival of the fittest," (*Revolt Against Reason* by A. Lunn, p.133)

یعنی انتخاب طبیعی کا قانون صرف زندگی کے بہتر مظاہر کے باقی رہنے کی توجیہ کرسکتا ہے، وہ یہ نہیں بتاتا کہ یہ بہتر زندگیاں خود کیسے وجود میں آئیں۔

2۔ اب نفسیاتی استدلال کو لیجیے۔ کہا جاتا ہے کہ خدا اور دوسری دنیا کا تصور کوئی حقیقی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ انسانی شخصیت اور انسانی آرزوؤں کو کائناتی سطح پر قیاس کرنا ہے۔ لیکن میرے لیے ناقابل تصور ہے کہ اس میں استدلال کا پہلو کیا ہے۔ اس کے جواب میں اگر میں کہوں کہ فی الواقع انسانی شخصیت اور انسانی آرزوئیں کائناتی سطح پر موجود ہیں تو مجھے نہیں معلوم کہ مخالفین کے پاس وہ کون سی حقیقی معلومات ہیں جن کی بنیاد پر وہ اس کی تردید کرسکیں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ جنین کا خوردبینی مادہ چھ فٹ لمبے چوڑے انسان کی سطح پر ایک شخص کی موجودگی کی پیشین گوئی ہے۔ ناقابل مشاہدہ ایٹم میں وہ نظام پایا جاتا ہے، جو شمسی نظام کی سطح اربوں میل کے دائرے میں گردش کررہا ہے۔ پھر شعور جس کا ہم انسان کی صورت میں تجربہ کررہے ہیں، وہ اگر کائناتی سطح پر زیادہ مکمل حالت میں موجود ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ اسی طرح ہمارا ضمیر اور ہماری فطرت جس وسیع تر دنیا کو چاہتے ہیں وہ اگر ایک ایسی دنیا کی بازگشت ہو جو فی الواقع کائنات کے پردہ میں موجود ہے تو اس میں آخر استحالہ (impossibility) کا کیا پہلو ہے۔

الف: علمائے نفسیات کا یہ کہنا بجائے خود صحیح ہے کہ بچپن میں بعض اوقات ایسی باتیں ذہن میں پڑ جاتی ہیں جو بعد کو غیر معمولی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ مگر اس سے یہ استدلال کرنا کہ انسان کی یہی وہ خصوصیت ہے، جس نے مذہب کو پیدا کیا، بالکل بے بنیاد قیاس ہے۔ یہ ایک معمولی واقعہ سے غیر معمولی نتیجہ اخذ کرنا ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے، جیسے میں کسی کمہار کو مٹی کی مورت بناتے ہوئے دیکھوں تو پکار اٹھوں کہ بس یہی وہ شخص ہے، جو ذی روح انسان کا خالق ہے۔ کھلونا سازی اور انسان سازی میں بعض اعتبار سے یقیناً مشابہت ہے، مگر دونوں کی نوعیت میں اتنا فرق ہے کہ ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ پر قیاس کرنا، ایک غیر منطقی قیاس (illogical argument) ہے۔ کمہار بیشک مٹی کے کھلونوں کا بنانے والا ہے، مگر یہ کہنا کہ اسی طرح کوئی اور کمہار تھا، جس

نے خود اس کمہار کو بنایا، ایک بے تکی بات کے سوا اور کچھ نہیں۔

جدید طرزِ فکر کی یہ عام کمزوری ہے کہ وہ معمولی واقعہ سے غیر معمولی استدلال کرتا ہے، حالانکہ منطقی اعتبار سے اس استدلال میں کوئی وزن نہیں، اگر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص لاشعور میں دبے ہوئے خیالات کے تحت کبھی خلافِ معمول الفاظ کا منھ سے نکالنے لگتا ہے، تو اس سے یہ کہاں ثابت ہو گیا کہ انبیاء کی زبان سے کائنات کے جس علم کا انکشاف ہوا ہے، وہ بھی اسی طرح محض لاشعور کا ایک کرشمہ ہے۔ پہلے واقعہ کو تسلیم کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں اس سے دوسرے واقعہ کے بارے میں استدلال کرنا ایک غیر علمی اور غیر منطقی روش کا مظاہرہ کرنا ہے، یہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ توجیہ کرنے والے کے پاس نبی کے غیر معمولی کلام کو سمجھنے کے لیے کوئی اور معیار موجود نہیں تھا، اس کو ایک ہی بات معلوم تھی — یہ کہ بعض مرتبہ کوئی شخص خواب یا جنون یا بے ہوشی کی حالت میں کچھ ایسی باتیں زبان سے نکالنے لگتا ہے جو عام طور پر ہوش کی حالت میں کسی کی زبان سے ادا نہیں ہوتیں، اس نے فوراً کہہ دیا کہ بس یہی وہ چیز ہے جو مذہبی قسم کی باتوں کی ذمہ دار ہے، حالانکہ کسی کے پاس حقیقت کو ناپنے کا ایک ہی معیار ہو تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بطور واقعہ بھی حقیقت کو ناپنے کا ایک ہی معیار ہو گا۔

فرض کیجیے کہ دور کے کسی سیارہ سے ایک ایسی مخلوق زمین پر اترتی ہے، جو سنتی تو ہے مگر بولنا نہیں جانتی، وہ صرف سماعت کی صفت سے آشنا ہے، تکلم کی صفت کی اسے کوئی خبر نہیں ہے۔ وہ انسان کی گفتگو اور تقریریں سن کر یہ تحقیق شروع کرتی ہے کہ ''آواز'' کیا ہے، اور کہاں سے آتی ہے۔ اس تحقیق کے دوران اس کے سامنے یہ منظر آتا ہے کہ درخت کی دو شاخیں جو باہم ملی ہوئی تھیں، اتفاقاً ہوا چلی اور رگڑ سے ان میں آواز نکلنے لگی۔ پھر جب ہوا رکی تو آواز بند ہو گئی۔ یہ واقعہ بار بار اس کے سامنے آتا ہے۔ اب ان میں کا ایک ''ماہر'' بغور اس کا مطالعہ کرنے کے بعد اعلان کرتا ہے کہ کلام انسانی کا راز معلوم ہو گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کے منھ میں نیچے اور اوپر کے جبڑوں میں دانت کی موجودگی اس کا سبب ہے۔ جب یہ نیچے اوپر کے دانت باہم رگڑ کھاتے ہیں تو ان سے آواز نکلتی

ہے، اور اسی کو کلام کہا جاتا ہے — دو چیزوں کی رگڑ سے ایک قسم کی آواز پیدا ہونا بجائے خود ایک واقعہ ہے۔ مگر اس واقعہ سے کلام انسانی کی تشریح کرنا جس طرح صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح غیر معمولی حالات میں لاشعور سے نکلی ہوئی باتوں سے کلامِ نبوت کی تشریح نہیں کی جا سکتی۔

ب: لاشعور میں جو خیالات دبا دیے جاتے ہیں وہ اکثر اوقات ایسی ناپسندیدہ خواہشیں ہوتی ہیں، جو خاندان اور سماج کے خوف سے پوری نہیں ہو سکیں۔ مثلاً کسی کے اندر اپنی بہن یا لڑکی کے ساتھ جنسی جذبہ پیدا ہو تو وہ اس خیال سے اسے دبا دیتا ہے کہ اس کا ظاہر کرنا رسوائی کا باعث ہوگا، اگر ایسا نہ ہو تو وہ شاید اس کے ساتھ شادی کرنا پسند کرتا، کسی کو قتل کرنے کا خیال ہو تو آدمی اس ڈر سے اپنے ذہن میں دفن کر دیتا ہے کہ اس کو جیل جانا پڑے گا وغیرہ وغیرہ۔ گویا لاشعور میں دبی ہوئی خواہشیں اکثر اوقات وہ برائیاں ہوتی ہیں، جو ماحول کے خوف سے بروئے کار نہ آسکیں، اب اگر ایسے کسی شخص میں ذہنی اختلال (mental disorder) پیدا ہو اور اس کا لاشعور ظاہر ہونا شروع کرے تو اس سے کیا ظاہر ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہی برے جذبات اور غلط خواہشیں اس کی زبان سے نکلیں گی جو اس کے لاشعور میں بھری ہوئی تھیں، وہ شر کا پیغمبر ہوگا، خیر کا پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس انبیاء کی زبان سے جس مذہب کا ظہور ہوا ہے، وہ سر تا پا خیر اور پاکیزگی ہے۔ ان کا کلام اور ان کی زندگی خیر اور پاکیزگی کا اتنا اعلیٰ نمونہ ہے کہ انبیاء کے سوا کہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہی نہیں بلکہ ان کے خیالات میں اتنی کشش ہوتی ہے کہ وہی سماج جس کے ''خوف'' سے انھوں نے کبھی اپنے خیالات اپنے ذہن میں چھپا لیے تھے، وہ اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو جاتا ہے، اور صدیاں گزر جاتی ہیں، پھر بھی انھیں نہیں چھوڑتا۔

ج: نفسیاتی نقطۂ نظر سے انسان کا لاشعور اصلاً خلا (vacuum) ہے۔ اس میں پہلے سے کوئی چیز موجود نہیں ہوتی بلکہ شعور کی راہ سے گزر کر پہنچتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لاشعور صرف انھیں واردات اور معلومات کا گودام ہے، جو کبھی انسان کے علم میں آیا ہو۔ وہ نامعلوم حقائق کا خزانہ نہیں بن سکتا۔ لیکن یہ حیرت انگیز بات ہے کہ انبیاء کی زبان سے جس مذہب کا اعلان ہوا ہے، وہ ایسی حقیقتوں پر مشتمل ہے، جو وقتی نہیں، دائمی ہیں۔ وہ ایسی باتیں ہیں جو نہ تو انھیں پہلے سے معلوم تھیں، نہ

ان کے وقت تک پوری نسل انسانی کومعلوم ہوسکی تھیں ۔اگرحقائق کا سرچشمہ لاشعورہوتا تو وہ ہرگز ایسے نامعلوم حقائق کااظہارنہیں کرسکتا تھا۔

انبیاء کی زبان سےجس مذہب کا ظہار ہوا ہے اس میں فلکیات ،طبیعیات، حیاتیات،نفسیات، تاریخ تمدن ،سیاست، معاشرت،غرض سارے ہی علوم کسی نہ کسی اعتبار سے مَس ہوتے ہیں۔ ایسا ہمہ گیر کلام لاشعورتو درکنار شعور کےتحت بھی اب تک کسی انسان سے ظاہرنہیں ہوا جس میں غلط فیصلے، خام اندازے،غیرواقعی بیانات اورناقص دلائل موجود نہ ہوں۔مگر مذہبی کلام حیرت انگیزطور پراس قسم کے غلطیوں سے بالکل پاک ہے۔ وہ اپنی دعوت، اپنے استدلال اوراپنے فیصلوں میں تمام انسانی علوم کو چھوتا ہے۔مگرسیکڑوں، ہزاروں برس گزرجاتے ہیں، اگلی نسلوں کی تحقیق پچھلی نسلوں کے خیالات کو بالکل بے بنیاد ثابت کر دیتی ہے۔مگر مذہب کی صداقت پھر بھی باقی رہتی ہے۔آج تک حقیقی معنوں میں اس کے اندرکسی غلطی کی نشاندہی نہ ہوسکی۔اگرکسی نے ایسی کوشش کی ہےتو وہ خود ہی غلط کارثابت ہوا ہے۔

میں ایک کتاب (1935ء) کی مثال دیتا ہوں جس میں ایک ماہرفلکیات جیمز ہنری بریسٹڈ (James Henry Breasted) نےانتہائی یقین کے ساتھ اس بات کااظہار کیا ہے کہ اس نے قرآن میں ایک فنی غلطی ڈھونڈ نکالی ہے۔وہ لکھتا ہے:

’’مغربی ایشیا کی قوموں میں طویل مدت کے رواج اورخاص طور پراسلام کے غلبہ نے قمری کیلنڈر کو دنیا بھرمیں رائج کردیا۔قمری اورشمسی سال کے درمیان فرق کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)اس انتہائی لغوحدتک لے گئے جوکہ تصورنہیں کیا جاسکتا ہے۔وہ کیلنڈر کے مسائل کی نوعیت سے اتنا زیادہ بے خبر تھے کہ قرآن میں باضابطہ انھوں نے کبیسہ کے مہینے (Intercalary Months) کاٹھہرانا ممنوع قرار دے دیا۔354 دنوں کانام نہاد قمری سال شمسی سال سے گیارہ دن کم ہوتا ہے۔اس لیے وہ اپنی گردش میں ہر33 سال میں ایک سال اورہرصدی میں تین سال زیادہ ہوجاتا ہے۔ایک ماہانہ مذہبی

عمل جیسے رمضان اگر اس وقت جون میں ہو تو چھ (6) سال بعد وہ اپریل میں آئے گا۔ 1935 میں ہجرت کو 1313 سال گزر چکے ہیں، جب سے کہ ہجری سال شروع ہوا۔ مگر ہماری ہر ایک صدی مسلمانوں کے قمری سال کے اعتبار سے ایک سو تین سال سے زیادہ کی ہوتی ہے، ہمارے عام شمسی سالوں کے اعتبار سے جب 1313 سال ہوتے ہیں تو مسلم سال کے اعتبار سے تقریباً اکتالیس (41) سال زیادہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کا سال ہجری وقت تحریر 1354 تک پہنچ چکا ہے، یعنی شمسی اعتبار سے 1313 سالوں میں 41 سال مزید۔ مشرقی ملکوں کے یہودی چرچ نے اس قسم کی لغویت (absurdity) کو ختم کر کے لوند یا مہینوں کے اضافہ کا طریقہ (intercalation) کو اختیار کیا اور اس طرح اپنے قمری کیلنڈر کو شمسی سال کے ڈھانچہ کے مطابق بنالیا۔ اس بنا پر تمام مغربی ایشیا اب تک اس انتہائی قدیم طریقے کے قمری کیلنڈر کی زحمت کو برداشت کر رہا ہے۔''

Time and its Mysteries, New York. 1962, p. 56

یہاں مجھے شمسی اور قمری کیلنڈر کے فرق پر کوئی بحث نہیں کرنی ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مصنف نے جس واقعہ کو پیغمبر اسلام کی طرف منسوب کر کے ''انتہائی لغو بے خبری'' کا الزام لگایا ہے، وہ واقعہ بذاتِ خود صحیح نہیں۔ قرآن میں جس چیز کی ممانعت کی گئی ہے، وہ کبیسہ کا مہینے ٹھہرانا نہیں، بلکہ ''نسئ'' ہے (التوبہ، 9:37)۔ نسئ کے معنی عربی زبان میں تاخیر کے ہیں، یعنی موخر کرنا ہٹانا، مثلاً حوض پر ایک جانور پانی پی رہا ہے، اور آپ نے اس کو ہٹا کر اپنے جانور کو حوض پر کھڑا کر دیا کہ پہلے آپ کا جانور پانی پی لے، اس کے بعد دوسرا پیے، تو اس طرح ہٹانے کو کہیں گے — ''نَسَاَ الدَّابۃ''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعے عرب میں جو طریقے رائج ہوئے تھے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ سال کے بارہ مہینوں میں سے چار مہینے ''اشہر حرم'' (خاص ادب واحترام کے مہینے) ہیں، یہ مہینے ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب تھے، ان میں خونریزی اور جدال وقتال قطعاً بند کر دیا

جاتا تھا۔ لوگ حج وعمرہ اورکاروبار کے لیے امن وامان کے ساتھ آزادانہ سفر کرسکتے تھے۔ بعد کو جب قبائل عرب میں سرکشی پیدا ہوئی تو انھوں نے اس قانون کی پابندی سے بچنے کے لیے نسیٔ کی رسم نکالی، یعنی جب کسی زورآور قبیلہ کی خواہش ماہ محرم میں جنگ کرنے کی ہوئی تو اس سردار نے اعلان کردیا کہ اس سال ہم نے محرم کو اشہر حُرُم سے نکال کر اس کی جگہ صَفر کو حرام کردیا۔ دوسرے لفظوں میں محرم کو اپنی جگہ سے ہٹا کر صفر کی جگہ رکھ دیا۔ یہی محترم مہینوں کو آگے پیچھے کرنے کی رسم تھی، جس کو نسیٔ کہا جاتا تھا، اوراسی کے متعلق قرآن (9:37) میں کہا گیا ہے کہ یہ ''زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ'' ہے، یعنی کفر میں ایک اضافہ ہے۔

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ عربوں میں ''لوند'' کی بھی ایک قسم کا رواج تھا، یعنی مہینوں کا عدد بدل دیتے تھے، مثلاً بارہ مہینے کے چودہ بنالیے، مگر ایک مفسر قرآن کے الفاظ ہیں:

''بعض اقوام جو اپنے مہینوں کا حساب درست رکھنے کے لیے لوند کا مہینہ ہر تیسرے سال بڑھاتی ہیں، وہ نسیٔ میں داخل نہیں۔''

معلوم ہوا کہ دورِ بے خبری میں بھی پیغمبر اسلام نے بے خبری کی بات نہیں کہی، حالانکہ اگر ان کے الفاظ صرف لاشعور سے نکلے ہوئے ہوتے تو اس قسم کی بے خبری کا ظاہر ہونا لازمی تھا۔

3۔ تاریخ یا سماجی مطالعہ کے حوالے سے استدلال کرنے والوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ صحیح رخ سے مذہب کا مطالعہ نہیں کرتے، اس لیے پورا مذہب ان کو اصل حقیقت کے خلاف ایک اور ہی شکل میں نظر آنے لگتا ہے، ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چوکور چیز کو کوئی شخص ترچھا کھڑا ہو کر دیکھے، ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو وہی چیز جو حقیقۃً چوکور ہے، تکونی نظر آسکتی ہے۔

ان حضرات کی غلطی یہ ہے کہ وہ مذہب کا مطالعہ ایک معروضی مسئلہ (objective problem) کے طور پر کرتے ہیں۔[1] یعنی ظاہری طور پر مذہب کے نام سے جو کچھ تاریخ میں

---

(1) J.Huxly, Man in the Modren World, p. 129

کبھی پایا گیا ہے، ان سب کو مذہب کے اجزا سمجھ کر یکساں حیثیت سے جمع کر لینا اور پھر ان کی روشنی میں مذہب کے بارے میں ایک رائے قائم کرنا۔ اس کی وجہ سے پہلے ہی قدم پر ان کی پوزیشن غلط ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہب ان کی نظروں میں محض ایک سماجی عمل بن جاتا ہے، نہ کہ کوئی سچائی کی دریافت۔ ایک چیز جو سچائی کی دریافت کی نوعیت رکھتی ہو، وہ بذاتِ خود ایک آئیڈیل ہوتی ہے، اور اس کے اپنے آئیڈیل کی روشنی میں اس کے مظاہر اور اس کی تاریخ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو چیز سماجی عمل کی حیثیت رکھتی ہو، اس کا اپنا کوئی آئیڈیل نہیں ہوتا بلکہ سماج کا عمل ہی اس کی حقیقت کا تعین کرتا ہے۔ کوئی چیز جو سماجی آداب یا سماجی روایات کی حیثیت رکھتی ہو۔ اس کی یہ حیثیت صرف اس وقت تک قائم رہتی ہے، جب تک سماج نے بالفعل اس کو یہ حیثیت دے رکھی ہو، اگر سماج اس کو چھوڑ کر اس کی جگہ کوئی اور طریقہ اختیار کر لے تو پھر وہ ایک تاریخی چیز ہو جاتی ہے، اور سماجی روایت کی حیثیت سے اس کا کوئی مقام باقی نہیں رہتا۔

مگر مذہب کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ مذہب کا مطالعہ ہم اس طرح نہیں کر سکتے، جس طرح ہم سواری، لباس اور مکان مطالعہ کا کرتے ہیں۔ کیوں کہ مذہب اپنی ذات میں ایک حقیقت ہے، جس کو سماج اپنے ارادہ سے قبول کرتا ہے یا اسے قبول نہیں کرتا یا قبول کرتا ہے تو ناقص شکل میں۔ اس کی وجہ سے مذہب اپنی اصولی حیثیت میں تو ہمیشہ یکساں رہتا ہے، مگر سماج کے اندر رواج یافتہ ہیئت کے اعتبار سے اس کی شکلیں مختلف ہو جاتی ہیں۔ اس لیے سماج کے اندر رواج یافتہ مذاہب کی یکساں فہرست بندی کر کے ہم مذہب کو سمجھ نہیں سکتے۔

مثال کے طور پر جمہوریت (democracy) کو لیجیے۔ جمہوریت ایک مخصوص سیاسی معیار کا نام ہے، اور کسی حکومت کو اس معیار کی روشنی ہی میں جمہوری یا غیر جمہوری کہا جا سکتا ہے، یعنی جمہوریت کے اپنے معیار کی رو سے تمام ملکوں کو دیکھا جائے گا، اور صرف اسی رویہ کو جمہوری قرار دیا جائے گا جو حقیقتاً جمہوری ہو۔ اس کے برعکس، اگر جمہوریت کا مطالعہ اس طرح کیا جائے کہ ہر وہ ملک جس نے اپنے نام کے ساتھ ''جمہوری'' کا لفظ لگا رکھا ہے، اس کو حقیقتاً جمہوری فرض کر کے

جمہوریت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو پھر جمہوریت ایک بے معنی لفظ بن جائے گا۔ کیوں کہ ایسی حالت میں امریکا کی جمہوریت چین کی جمہوریت سے مختلف ہوگی، انگلینڈ کی جمہوریت مصر کی جمہوریت سے ٹکرائے گی، ہندوستان کی جمہوریت کا پاکستان کی جمہوریت سے کوئی جوڑ نہیں ہوگا۔ اس کے بعد جب ان سارے مشاہدات کو ارتقائی ڈھانچہ میں رکھ کر دیکھا جائے گا تو وہ اور زیادہ بے معنی ہو جائے گا۔ کیوں کہ فرانس جو جمہوریت کا مقام پیدائش ہے، اس کا مطالعہ بتائے گا کہ جمہوریت اپنے بعد کے ارتقائی مرحلہ کے مطابق نام ہے، جنرل ڈیگال (1890-1970ء) کی فوجی آمریت کا۔

اس طریق مطالعہ کا یہ نتیجہ ہے کہ مذہب کے لیے خدا کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی۔ مذہب کی تاریخ میں اس کی مثال موجود ہے کہ مذہب خدا کے بغیر بھی ہوسکتا ہے۔ یہ مثال بدھ ازم کی ہے، جو ''مذہب'' ہونے کے باوجود خدا کے تصور سے خالی ہے۔ اس لیے آج بہت سے لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ مذہب کا مطالعہ خدا سے الگ کر کے کیا جانا چاہیے، اگر اس ضرورت کو تسلیم کرلیا جائے کہ لوگوں کے اندر اخلاق اور تنظیم پیدا کرنے کے لیے مذہبی نوعیت کی کوئی چیز ضروری ہے تو اس مقصد کے لیے لازمی طور پر خدا کو ماننا ضروری نہیں، بے خدا مذہب بھی اس ضرورت کو پورا کرسکتا ہے، چنانچہ یہ لوگ بدھ ازم کے حوالے سے یہ کہتے ہیں کہ اب موجودہ ترقی یافتہ دور میں اس قسم کا مذہبی ڈھانچہ سماج کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ ان حضرات کے نزدیک دورِ جدید کا خدا خود سماج اور اس کے سیاسی اور معاشی مقاصد ہیں۔ اس خدا کا پیغمبر پارلیمنٹ ہے، جس کے ذریعہ وہ اپنی مرضی سے انسانوں کو باخبر کرتا ہے، اور اس کی عبادت گاہیں، مسجد اور گرجا نہیں، بلکہ ڈیم اور کارخانے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ (ملاحظہ ہو جولین ہکسلے کی کتاب ''مذہب بغیر الہام'')

مذہب کو اقرارِ خدا سے انکارِ خدا تک پہنچانے میں ارتقائی مطالعہ کا بھی دخل ہے۔ یہ حضرات یہ کرتے ہیں کہ پہلے ان تمام چیزوں کو جمع کر لیتے ہیں جو کبھی مذہب کے نام سے منسوب رہی ہیں، اور اس کے بعد اپنی مرضی کے مطابق ان کے درمیان ایک ارتقائی ترتیب قائم کر لیتے ہیں، جس میں ایسے

تمام پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جس سے ان کی مزعومہ ارتقائی ترتیب مشتبہ ہوسکتی ہو، مثلاً انسانیات (anthropology) اور سماجیات (sociology) کے ماہرین نے زبردست مطالعہ اور تحقیق کے بعد یہ ''دریافت'' کیا ہے کہ خدا کا تصور کئی خداؤں سے شروع ہوا اور بتدریج ترقی کرتے کرتے ایک خدا تک پہونچا، لیکن یہ ترقی ان کے نزدیک الٹی ہوئی ہے۔ کیوں کہ خدا کے تصور نے ایک خدا کی شکل اختیار کر کے اپنے آپ کو تضاد میں مبتلا کر لیا ہے، ''کئی خدا'' کا تصور کم از کم اپنے اندر یہ قدرت رکھتا تھا کہ مختلف خداؤں کو ماننے والے ایک دوسرے کو تسلیم کرتے ہوئے باہم مل جل کر رہیں۔ مگر ''ایک خدا'' کے عقیدے نے قدرتی طور پر تمام دوسرے خداؤں اور ان کے ماننے والوں کو باطل ٹھہرایا اور برتر مذہب (Higher Religion) کا تصور پیدا کیا، جس کی وجہ سے قوموں اور گروہوں میں کبھی نہ ختم ہونے والی جنگیں شروع ہوگئیں، اس طرح خدا کے تصور نے غلط سمت میں ارتقا کر کے خود ہی اپنے لیے موت کا سامان مہیا کر دیا ہے، کیوں کہ ارتقا کا قانون یہی ہے۔

Man in the Modren World, p. 112

مگر اس ارتقائی ترتیب میں صریح طور پر اصل واقعہ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، کیوں کہ معلوم تاریخ کے مطابق سب سے پہلے پیغمبر حضرت نوح تھے، اور ان کی دعوت کے متعلق ثابت ہے کہ وہ ایک خدا کی دعوت تھی، اس کے علاوہ تعدد آلہہ (Polytheism) کا مطلب بھی مطلق تعدد نہیں ہے، کبھی کوئی قوم ان معنوں میں مشرک نہیں رہی ہے کہ وہ بالکل یکساں نوعیت کے کئی خدا مانتی ہو۔ اس کے برعکس تعدد آلہہ کا مطلب ایک بڑے خدا کو مان کر کچھ اس کے مقربین خاص کا اقرار کرنا ہے، جو ذیلی خداؤں کے طور پر کام کرتے ہیں۔ شرک کے ساتھ ہمیشہ ایک ''خدائے خدائگان'' کا تصور پایا جاتا رہا ہے۔ ایسی حالت میں ''ارتقائی مذہب'' ایک بے دلیل عقیدہ کے سوا اور کیا ہے۔

مارکسی نظریۂ تاریخ اور زیادہ بے معنی ہے۔ یہ نظریہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ اقتصادی حالات ہی وہ اصل عامل ہیں، جو انسان کی تعمیر وتشکیل کرتے ہیں، مذہب جس زمانے میں پیدا ہوا وہ جاگیر داری اور سرمایہ داری نظام کا زمانہ تھا۔ اب چوں کہ جاگیر داری اور سرمایہ داری نظام استحصال

اور لوٹ کھسوٹ کا نظام ہے، اس لیے اس کے درمیان پیدا ہونے والے اخلاقی و مذہبی تصورات بھی یقینی طور پر اپنے ماحول ہی کا عکس ہوں گے وہ لوٹ کھسوٹ کے نظریات ہوں مگر یہ نظریہ علمی حیثیت سے کوئی وزن رکھتا ہے، اور نہ تجزیہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

یہ نظریہ انسانی ارادہ کی بالکلیہ نفی کر دیتا ہے، اور اس کو صرف معاشی حالات کی پیداوار قرار دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی اپنی کوئی ہستی نہیں، جس طرح صابن کے کارخانے میں صابن ڈھلتے ہیں، اسی طرح آدمی بھی اپنے ماحول کے کارخانے میں ڈھلتا ہے، وہ الگ سے سوچ کر کوئی کام نہیں کرتا بلکہ جو کچھ کرتا ہے، اسی کے مطابق سوچنے لگتا ہے، اگر یہ واقعہ ہے تو مارکس، جو خود بھی ''سرمایہ دارانہ نظام'' کے اندر پیدا ہوا تھا، اس کے لیے کس طرح ممکن ہوا کہ وہ اپنے وقت کے معاشی حالات کے خلاف سوچ سکے۔ کیا اس نے زمین کا مطالعہ چاند پر جا کر کیا تھا، اگر مذہب کو پیدا کرنے والی چیز وقت کا اقتصادی نظام ہے تو آخر مارکس ازم بھی وقت کے اقتصادی نظام کی پیداوار کیوں نہیں ہے۔ مذہب کی جو حیثیت مارکس ازم کو تسلیم نہیں ہے، وہی حیثیت اس کے اپنے لیے کس طرح جائز ہوگی — حقیقت یہ ہے کہ یہ نظریہ اشتعال انگیز حد تک لغو ہے، اس کے پیچھے کوئی بھی علمی اور عقلی دلیل موجود نہیں۔

تجربے سے بھی اس نظریے کی غلطی واضح ہو چکی ہے۔ روس کی مثال اس کو سمجھنے کے لیے کافی ہے، جہاں تقریباً آدھی صدی سے اس نظریہ کو مکمل غلبہ حاصل ہے، طویل ترین مدت سے زبردست پروپیگنڈہ ہو رہا ہے کہ روس کے مادی حالات بدل گئے ہیں، وہاں کا نظام پیداوار، نظام تبادلہ اور نظامِ تقسیم دولت سب غیر سرمایہ دارانہ ہو چکا ہے، مگر اسٹالن کے مرنے کے بعد خود روسی لیڈروں کی طرف سے تسلیم کیا گیا ہے کہ اسٹالن کے زمانۂ حکومت میں روس کے اندر ظلم و جبر کا نظام رائج تھا، اور عوام کا اسی طرح استحصال کیا جا رہا تھا، جیسے سرمایہ دارانہ ملکوں میں ہوتا ہے، اور اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ روس میں پریس پر حکومت کا مکمل کنٹرول ہونے کی وجہ سے اسٹالن کے لیے یہ ممکن ہو سکا کہ وہ اپنے ظلم اور استحصال کو دنیا کے سامنے عدل و انصاف کے نام سے مشہور کرے، اور پریس

کا یہی کنٹرول اب بھی وہاں جاری ہے، تو یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے آج بھی خوبصورت پروپیگنڈے کے پس منظر میں روس کے اندر وہی سب کچھ ہو رہا ہے، جو اسٹالن کے زمانے میں ہوتا تھا۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگریس (فروری 1956ء) نے اسٹالن کے مظالم کا انکشاف کیا تھا۔ اس کے بعد اگر پارٹی کی مثلاً پچیسویں کانگریس اس کے دوسرے جانشینوں کی درندگی کا راز فاش کرے تو اس میں ہرگز اچنبھے کی کوئی بات نہ ہوگی (اکتوبر 1964ء میں خروشچیف کی برطرفی اور اس کے بعد کے واقعات سے اس کی تصدیق ہو چکی ہے) — آدھی صدی کے اس تجربے سے جو نتیجہ نکلا ہے، اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ پیداوار اور تبادلہ کا نظام خیالات کی صورت گری سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، اگر انسانی ذہن نظام پیداوار کا تابع ہوتا اور اسی کے مطابق خیالات پیدا ہوا کرتے تو اشتراکی حکومت میں ظلم اور استحصال کی ذہنیت بھی یقینی طور پر ختم ہو جانی چاہیے تھی۔ جب کہ وہاں پیداوار کا نظام اشتراکی اصول کے مطابق بالکل بدل دیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کے خلاف دورِ جدید کا پورا استدلال ایک قسم کا علمی سفسطہ (Scientific Sophism) ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس نام نہاد علمی استدلال کی حقیقت صرف یہ ہے کہ ''کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا'' یہ صحیح ہے کہ واقعات کے مطالعہ کے لیے ''علمی طریقہ'' اختیار کیا جاتا ہے، مگر علمی طریقہ محض ایک طریقہ ہونے کی وجہ سے صحیح نتائج تک نہیں پہونچا سکتا، اسی کے ساتھ دوسرے ضروری پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ مثلاً ادھوری اور یک رخی معلومات پر اگر علمی طریقہ کو آزمایا جائے تو وہ بظاہر علمی ہونے کے باوجود ناقص اور غلط نتیجے ہی تک پہنچائے گا۔

جنوری 1964ء کے پہلے ہفتہ میں نئی دہلی میں مستشرقین کی ایک بین الاقوامی کانگرس ہوئی، جس میں بارہ سو علمائے مشرقیات (orientalists) شریک ہوئے۔ اس موقع پر ایک صاحب نے ایک مقالہ پڑھا جس میں کئی مسلم یادگاروں کے بارے میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی بنوائی ہوئی نہیں ہیں بلکہ ہندو راجاؤں کی بنوائی ہوئی ہیں۔ مثلاً قطب مینار جو قطب الدین ایبک کی طرف منسوب

ہے، وہ دراصل وشنودھوج ہے، جس کو اب سے 23 سو سال پہلے سمندر گپت نے بنوایا تھا، بعد کے مسلم مورخین نے اس کو غلط طور پر قطب مینار کے نام سے پیش کیا، اس کی دلیل یہ ہے کہ قطب مینار میں ایسے پتھر لگے ہوئے ہیں، جو بہت پرانے ہیں، اور قطب الدین ایبک سے بہت پہلے تراشے گئے تھے۔

بظاہر یہ ایک علمی استدلال ہے، کیوں کہ یہ واقعہ ہے کہ قطب مینار میں ایسے کچھ پتھر موجود ہیں، مگر قطب مینار کے مطالعہ کے لیے صرف اس کے پرانے پتھروں کا حوالہ دینے سے علمی استدلال کا حق ادا نہیں ہوتا، اسی کے ساتھ اور بہت سے پہلوؤں کو سامنے رکھنا ضروری ہے، اور جب ہم ایسا کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ توجیہ قطب مینار پر پوری طرح چسپاں نہیں ہوتی، اس کے بجائے یہ دوسری توجیہ زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ اس کے پرانے پتھر دراصل پرانی عمارتوں کے کھنڈر سے حاصل کیے گئے جس طرح دوسری قدیم سنگی عمارتوں میں کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں، پھر جب اس دوسری توجیہ کو قطب مینار کی ساخت، اس کے نقشۂ تعمیر، پرانے پتھروں کا اندازِ نصب، مینار کے ساتھ ناتمام مسجد اور جوابی مینار کے بقیہ آثار نیز تاریخی شہادتوں کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو ثابت ہو جاتا ہے کہ یہی دوسری توجیہ صحیح ہے، اور پہلی توجیہ ایک مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں۔

مخالفین مذہب کا مقدمہ بھی بالکل ایسا ہی ہے، جس طرح مذکورہ بالا مثال میں چند پتھروں کو ایک خاص رنگ دے کر سمجھ لیا گیا ہے کہ علمی استدلال حاصل ہو گیا۔ اسی طرح چند جزئی اور اکثر اوقات غیر متعلق واقعات کو ناقص رخ سے پیش کر کے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ علمی طریق مطالعہ نے مذہب کی تردید کر دی، حالانکہ واقعہ کے تمام اجزاء کو صحیح رخ سے دیکھا جائے تو بالکل دوسرا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کی صداقت کا یہ بذاتِ خود ایک کافی ثبوت ہے کہ اس کو چھوڑنے کے بعد بہترین ذہن بھی الل ٹپ باتیں کرنے لگتے ہیں، اس کے بعد آدمی کے پاس مسائل پر غور و فکر کے لیے کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی، مخالفینِ مذہب کی فہرست میں جو نام ہیں، وہ اکثر نہایت ذہین اور ذی علم افراد ہیں۔ بہترین دماغ، وقت کے بہترین علوم سے آراستہ ہو کر اس میدان میں اترے ہیں،

مگر ان اہل دماغ نے ایسی ایسی مہمل باتیں لکھی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو لکھتے وقت آخر ان کا دماغ کہاں چلا گیا تھا۔ یہ سارا لٹریچر بے یقینی، تضاد، اعتراف ناواقفیت اور الل ٹپ استدلال سے بھرا ہوا ہے۔ کھلی ہوئی حقیقتوں کو نظر انداز کرنا اور معمولی تنکے کے سہارے دعووں کے پل کھڑے کرنا۔ یہ ان کا کل کارنامہ ہے۔ صورتِ حال بلا شبہ اس بات کا ایک قطعی ثبوت ہے کہ ان حضرات کا مقدمہ صحیح نہیں، کیوں کہ بیان اور استدلال کی یہ خرابیاں صرف غلط مقدمہ کی خصوصیت ہیں، صحیح مقدمے میں کبھی یہ چیزیں پائی نہیں جاسکتی۔

مذہب کی صداقت اور مخالفین مذہب کے نظریے کی غلطی اس سے بھی واضح ہے کہ مذہب کو مان کر زندگی اور کائنات کا جو نقشہ بنتا ہے، وہ ایک نہایت حسین و جمیل نقشہ ہے، وہ انسان کے اعلیٰ افکار سے اسی طرح مطابق ہے، جیسے مادی کائنات ریاضیاتی معیاروں کے عین مطابق ہے، اس کے برعکس مخالفِ مذہب فلسفہ کے تحت جو نقشہ بنتا ہے، وہ انسانی ذہن سے بالکل غیر متعلق ہے، یہاں میں برٹرینڈ رسل کا ایک اقتباس نقل کروں گا۔

''انسان ایسے اسباب کی پیداوار ہے، جن کا پہلے سے سوچا سمجھا کوئی مقصد نہیں۔ اس کا آغاز، اس کی نشوونما، اس کی تمنائیں اور اس کے اندیشے، اس کی محبت اور اس کے عقائد، سب محض ایٹموں کی اتفاقی ترتیب کا نتیجہ ہیں۔ اس کی زندگی کی انتہا قبر ہے، اور اس کے بعد کوئی چیز بھی اسے زندگی عطا نہیں کرسکتی۔ صدیوں کی جدوجہد، تمام قربانیاں، بہترین احساسات اور عبقریت کے روشن کارنامے سب نظامِ شمسی کے خاتمہ کے ساتھ فنا ہو جانے والی چیزیں ہیں۔ انسانی کامرانیوں کا پورا محل ناگزیر طور پر کائنات کے ملبے کے نیچے دب کر رہ جائے گا، یہ باتیں اگر بالکل قطعی نہیں تو وہ حقیقت سے اتنی قریب (so nearly certain) ہیں کہ جو فلسفہ بھی اس کا انکار کرے گا وہ باقی نہیں رہ سکتا۔''

Limitations of Science, p. 133

یہ اقتباس گویا غیر مذہبی مادی فکر کا خلاصہ ہے۔ اس کے مطابق ساری زندگی نہ صرف یہ کہ بالکل

تیرہ وتار نظر آتی ہے، بلکہ اگر زندگی کی مادی تعبیر کو لیا جائے تو پھر خیر وشر کا کوئی قطعی معیار باقی نہیں رہتا، اس کی رو سے انسانوں پر بم گرانا کوئی ظالمانہ فعل نہیں، کیوں کہ انسانوں کو بہر حال ایک دن مرنا ہے۔ اس کے برعکس مذہبی فکر میں امید کی روشنی ہے، اس میں زندگی اور موت دونوں بامعنی نظر آتے ہیں، اس میں ہماری نفسیات کے تمام تقاضے اپنی جگہ پا لیتے ہیں، ایک تصور کے ریاضیاتی ڈھانچے فٹ ہوجانے کے بعد اگر سائنسداں مطمئن ہوجاتا ہے کہ اس نے حقیقت پالی تو مذہبی تصور کا انسانی ذہن میں پوری طرح بیٹھ جانا یقینی طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ یہی وہ حقیقت ہے، جس کو انسان کی فطرت تلاش کررہی تھی، اس کے بعد ہمارے پاس اس کے انکار کے لیے کوئی واقعی بنیاد نہیں رہتی۔

یہاں میں ایک امریکی ریاضی داں (Earl Chester Rex) کے الفاظ نقل کروں گا: ''میں سائنس کے اس تسلیم شدہ اصول کو استعمال کرتا ہوں جو زیادہ مختلف نظریوں میں سے کسی ایک انتخاب کے لیے کام میں لایا جاتا ہے۔ اس اصول کے مطابق اس نظریے کو اختیار کرلیا جاتا ہے، جو مقابلتاً نہایت سادگی کے ساتھ تمام متنازعہ فیہ مسائل کی تشریح کردے، بہت عرصہ ہوا جب یہی اصول ٹالمی کے نظریے (Ptolemaic Theory) اور کوپرنیکس کے نظریے کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے استعمال کیا گیا، اول الذکر کا دعویٰ تھا کہ زمین نظامِ شمسی کا مرکز ہے، اسکے برعکس ثانی الذکر کہتا تھا کہ سورج نظامِ شمسی کا مرکز ہے، ٹولومی کا نظریہ اس قدر پیچیدہ اور الجھا ہوا تھا کہ زمین کی مرکزیت کا نظریہ رد کردیا گیا۔''

The Evidence of God, p. 179

مجھے اعتراف ہے کہ میرا یہ استدلال بہت سے لوگوں کے لیے کافی نہیں ہوگا، ان کے مادی ذہن کے چوکھٹے میں کسی طرح خدا اور مذہب کی بات نہیں بیٹھے گی۔ مگر جو چیز مجھے مطمئن کرتی ہے، وہ یہ کہ ان حضرات کا عدمِ اطمینان حقیقۃً مذہب کے حق میں استدلال کی کمی کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ ان کا وہ کنڈیشنڈ ذہن ہے، جو مذہبی استدلال کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا، جیمز جنیز نے اپنی کتاب ''پراسرار کائنات'' کے آخر میں نہایت صحیح لکھا ہے کہ میرے خیال میں ہمارے جدید

ذہن واقعات کی مادی توجیہ کے حق میں ایک طرح کا تعصب رکھتے ہیں:

Our modem minds have, I think, a bias towards mechanical interpretation. (*Mysterious Universe*, p. 189)

وھٹکر چیمبرز (Whittaker Chambers, 1901-1961) نے اپنی کتاب شہادت (Witness) میں اپنے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے، جو بلاشبہ اس کی زندگی کے لیے ایک نقطۂ انقلاب (turning point) بن سکتا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی بچی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر بچی کے کان پر جا پڑی اور غیر شعوری طور پر وہ اس کی ساخت کی طرف متوجہ ہو گیا، اس نے اپنے جی میں سوچا۔ ''یہ کتنی غیر ممکن بات ہے کہ ایسی پیچیدہ اور نازک چیز محض اتفاق سے وجود میں آجائے، یقیناً یہ پہلے سے سوچے سمجھے نقشے کے تحت ہی ممکن ہوئی ہوگی''۔ مگر اس نے جلد ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیا، کیوں کہ اسے احساس ہوا کہ اگر وہ اس کو ایک منصوبہ مان لے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے منصوبہ ساز (خدا) کو بھی ماننا ہوگا، اور یہ ایک ایسا تصور تھا، جسے قبول کرنے کے لیے اس کا ذہن آمادہ نہیں تھا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ٹامس ڈیوڈ پارکس (Thomas David Parks) لکھتا ہے:

''میں اپنے پروفیسروں اور ریسرچ کے سلسلے میں اپنے رفقائے کار میں بہت سے سائنس دانوں کے بارے میں جانتا ہوں کہ علم کیمیا اور طبیعیات کے مطالعہ و تجربہ کے دوران میں انھیں بھی متعدد مرتبہ اس طرح کے احساسات سے دوچار ہونا پڑا۔''

The Evidence of God in an Expanding Universe. Edited by John Clover Monsma, New York ,1958, p.73-74

نظریۂ ارتقا کی صداقت پر موجودہ زمانے کے ''سائنسداں'' متفق ہو چکے ہیں۔ ارتقا کا تصور ایک طرف تمام علمی شعبوں پر چھاتا جا رہا ہے، ہر وہ مسئلہ جس کو سمجھنے کے لیے خدا کی ضرورت تھی، اس کی جگہ بے تکلف ارتقا کا ایک خوبصورت بت بنا کر رکھ دیا گیا ہے، مگر دوسری طرف عضویاتی ارتقا (Organic Evolution) کا نظریہ، جس سے تمام ارتقائی تصورات اخذ کیے گئے ہیں، اب تک

بے دلیل ہے، حتیٰ کہ بعض علما نے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ اس تصور کو ہم صرف اس لیے مانتے ہیں کہ اس کا کوئی بدل ہمارے پاس موجود نہیں ہے ۔ سر آرتھر کیتھ (Sir Arthur Keith, 1866-1955) نے 1953ء میں کہا تھا:

"Evolution is unproved and unprovable. We believe it only because the only alternative is special creation and that is unthinkable." (*Islamic Thought,* Dec. 1961)

یعنی ارتقا ایک غیر ثابت شدہ نظریہ ہے، اور وہ ثابت بھی نہیں کیا جا سکتا، ہم اس پر صرف اس لیے یقین کرتے ہیں کہ اس کا واحد بدل تخلیق کا عقیدہ ہے جو سائنسی طور پر نا قابلِ فہم ہے، گویا سائنسدان ارتقا کے نظریے کی صداقت پر صرف اس لیے متفق ہو گئے ہیں کہ اگر وہ چھوڑ دیں تو لازمی طور پر انھیں خدا کے تصور پر ایمان لانا پڑے گا۔

ظاہر ہے کہ جو لوگ مادی طرز تعبیر کے حق میں اس قسم کے تعصّبات رکھتے ہوں، وہ انتہائی کھلے ہوئے واقعات سے بھی کوئی سبق نہیں لے سکتے تھے، اور مجھے اعتراف ہے کہ ایسے لوگوں کو مطمئن کرنا میرے بس سے باہر ہے۔

اس تعصب کی بھی ایک خاص وجہ ہے، یہاں میں ایک امریکی عالم طبیعیات (George Herbert Blount) کے الفاظ نقل کروں گا:

’’خدا پرستی کی معقولیت اور انکار خدا کا پھسپھسا پن بجائے خود ایک آدمی کے لیے عملاً خدا پرستی اختیار کرنے کا سبب نہیں بن سکتا، لوگوں کے دل میں یہ شبہ چھپا ہوا ہے کہ خدا کو ماننے کے بعد آزادی کا خاتمہ ہو جائے گا، وہ علما جو ذہنی آزادی (intellectual liberty) کو دل و جان سے پسند کرتے ہیں، آزادی کی محدودیت کا کوئی تصور ان کے لیے وحشت ناک ہے۔‘‘

The Evidence of God, P.130

چنانچہ جولین ہکسلے نے نبوت کے تصور کو ’’نا قابل برداشت اظہار برتری‘‘ قرار دیا ہے ۔ کیوں کہ کسی کو نبی ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو یہ حیثیت دی جائے کہ اس کی بات خدا کی بات ہے،

اور اس کو حق ہے کہ وہ جو کچھ کہے تمام لوگ اس کو قبول کر لیں۔ لیکن جب انسان کی حیثیت یہی ہے کہ وہ خالق نہیں مخلوق ہے، وہ خدا نہیں بلکہ خدا کا بندہ ہے، تو اس صورت واقعہ کو کسی خودساختہ تصور کی بنا پر ختم نہیں کیا جاسکتا۔ ہم حقیقت کو بدل نہیں سکتے، ہم صرف اس کا اعتراف کر سکتے ہیں۔ اب اگر شترمرغ کا انجام ہم اپنے لیے پسند نہیں کرتے تو ہماری بہترین عقلمندی یہ ہے کہ جو کچھ ہے، اسے مان لیں، نہ یہ کہ جو کچھ ہے، اس کا انکار کر دیں۔ حقیقت کا انکار کر کے آدمی صرف اپنا نقصان کرتا ہے، وہ حقیقت کا کچھ نہیں بگاڑتا۔

استدلال کا طریقہ

مذہب کے خلاف دورِ جدید کا جو مقدمہ ہے، وہ اصلاً طریقِ استدلال کا مقدمہ ہے، یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ علم کی ترقی نے حقیقت کے مطالعہ کا جو اعلیٰ اور ارتقا یافتہ طریقہ معلوم کیا ہے، مذہب کے دعوے اور عقیدے اس پر پورے نہیں اترتے۔ یہ جدید طریقۂ مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ حقائق کو معلوم کرنے کا طریقہ ہے، اب چوں کہ مذہب کے عقائد ماورائے احساس دنیا سے متعلق ہونے کی وجہ سے تجربہ اور مشاہدہ میں نہیں آسکتے، اور ان کا استدلال تمام تر قیاس اور استقراء پر مبنی ہے، اس لیے وہ غیر حقیقی ہیں، ان کی کوئی علمی بنیاد نہیں۔

مثلاً خدا کے اثبات کے لیے ہم یہ نہیں کرتے کہ خود خدا کو کسی دوربین کے ذریعہ سے دکھا دیں، بلکہ یوں استدلال کرتے ہیں کہ کائنات کا نظم اور اس کی معنویت اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے پیچھے کوئی خدائی ذہن موجود ہے، اس طرح ہماری دلیل براہِ راست خدا کو ثابت نہیں کرتی بلکہ ایک ایسے قرینہ کو ثابت کرتی ہے، جس کے منطقی نتیجہ کے طور پر خدا کو ماننا پڑے۔

مگر یہ مقدمہ بجائے خود صحیح نہیں۔ جدید طریقۂ مطالعہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف وہی چیز اپنا حقیقی وجود رکھتی ہے، جو براہ راست ہمارے تجربے میں آئی ہو، بلکہ براہِ راست تجربے میں آنے والی چیزوں کی بنیاد پر جو علمی قیاس (inference) کیا جاتا ہے، وہ بھی اسی طرح حقیقت ہوسکتا ہے، جیسے کوئی تجربہ۔ نہ تجربہ محض تجربہ ہونے کی بنا پر صحیح ہے، اور نہ قیاس محض قیاس ہونے کی بنا پر غلط، ہر ایک میں صحت اور غلطی دونوں کا امکان ہے۔

پہلے زمانے میں سمندری جہاز لکڑی کے بنائے جاتے تھے۔ کیوں کہ تصور یہ تھا، پانی پر وہی چیز تیر سکتی ہے، جو وزن میں پانی سے ہلکی ہو۔ جب یہ دعویٰ کیا گیا کہ لوہے کے جہاز بھی پانی پر اسی طرح تیر سکتے ہیں، جس طرح لکڑی کے جہاز سطح بحر پر چلتے ہیں تو اس بنا پر اس کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا گیا کہ لوہا وزنی ہونے کی وجہ سے پانی کی سطح پر تیر ہی نہیں سکتا۔ کسی لوہار نے اس دعویٰ

کو غلط ثابت کرنے کے لیے پانی کے ٹب میں لوہے کا نعل ڈال کر دکھا دیا کہ وہ پانی کی سطح پر تیرنے کے بجائے ٹب کی تہ میں بیٹھ جاتا ہے۔ بظاہر یہ ایک تجربہ تھا، مگر یہ تجربہ صحیح نہیں تھا۔ کیوں کہ اس نے اگر پانی میں نعل کے بجائے لوہے کا تسلہ ڈالا ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ دعویٰ کرنے والے کا دعویٰ صحیح ہے۔

اسی طرح ابتداء میں جب کم طاقت کی دوربینوں سے آسمان کا مشاہدہ کیا گیا تو بہت سے ایسے اجسام مشاہدے میں آئے جو پھیلے ہوئے نور کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ اس مشاہدہ کی بنا پر یہ نظریہ قائم کرلیا گیا کہ یہ گیسی بادل ہیں، جو ستارے بننے پہلے مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ مگر جب مزید طاقت کی دوربینیں تیار ہوئیں اور ان کے ذریعہ ازسرِ نو ان اجسام کو دیکھا گیا تو نظر آیا کہ جو چیز پہلے نورانی بادل کی شکل میں دکھائی دیتی تھی، وہ دراصل بے شمار ستاروں کا مجموعہ تھا، جو غیر معمولی دوری کی وجہ سے بادل کی مانند نظر آرہا تھا۔

معلوم ہوا کہ مشاہدہ اور تجربہ نہ صرف یہ کہ بذاتِ خود علم کے قطعی ذرائع نہیں ہیں، بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ علم صرف ان چیزوں کا نام نہیں ہے جو براہِ راست ہمارے مشاہدہ و تجربہ میں آتی ہوں۔ دورِ جدید نے بیشک بہت سے آلات اور ذرائع دریافت کرلیے ہیں، جن سے وسیع پیمانے پر تجربہ و مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ آلات و ذرائع جن چیزوں کا ہمیں تجربہ کراتے ہیں، وہ صرف کچھ اوپری اور نسبتاً غیر اہم چیزیں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد ان مشاہدات و تجربات کی بنیاد پر جو نظریات قائم کیے جاتے ہیں، وہ سب کے سب غیر مرئی ہوتے ہیں۔ نظریات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ساری سائنس کچھ مشاہدات کی توجیہ کا نام ہے، یعنی خود نظریات وہ چیزیں نہیں ہیں، جو ہمارے مشاہدہ یا تجربے میں آئے ہوں۔ بلکہ کچھ تجربات و مشاہدات نے سائنس دانوں کو یہ ماننے پر مجبور کیا ہے کہ یہاں فلاں حقیقت موجود ہے۔ اگرچہ وہ خود مشاہدہ میں نہیں آئی، کوئی سائنس داں یا مادہ پرست فورس، انرجی، نیچر، قانونِ فطرت، وغیرہ الفاظ استعمال کیے بغیر ایک قدم آگے نہیں چل سکتا۔ مگر کوئی بھی سائنس داں نہیں جانتا کہ قوت یا نیچر کیا ہے۔ سوا اس کے معلوم واقعات وظواہر کی

نامعلوم اورناقابلِ مشاہدہ علّت کے لیے چند تعبیری الفاظ وضع کر لیے گئے ہیں، جن کی حقیقت معنوی کی تشریح سے ایک سائنس داں بھی اسی طرح عاجز ہے، جس طرح اہلِ مذاہب خدا کی تشریح وتوصیف سے۔ دونوں اپنی جگہ ایک نامعلوم علت کائنات پر غیبی اعتقاد رکھتے ہیں، ڈاکٹر الکسس کیرل کے الفاظ میں—

''ریاضیاتی کائنات قیاسات اور مفروضات کا ایک شاندار جال ہے، جس میں علامتوں کی مساوات (equation of symbols) پر مشتمل ناقابلِ بیان مجردات (abstractions) کے سوا اور کچھ نہیں۔''

Man the Unknown, p. 15

سائنس ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرتی اور نہیں کرسکتی کہ حقیقت صرف اسی قدر ہے، جو حواس کے ذریعہ بلاواسطہ ہمارے تجربہ میں آئی ہو۔ یہ واقعہ کہ پانی ایک رقیق اور سیال چیز ہے، اس کو ہم براہ راست اپنی آنکھوں کے ذریعہ دیکھ لیتے ہیں، مگر یہ واقعہ کہ پانی کا ہر مالے کیول ہائیڈروجن کے دو ایٹم اور آکسیجن کے ایک ایٹم پر مشتمل ہے، یہ ہم کو آنکھ سے یا کسی خوردبین سے نظر نہیں آتا، بلکہ صرف منطقی استنباط کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے، اور سائنس ان دونوں واقعات کی موجودگی یکساں طور پر تسلیم کرتی ہے، اس کے نزدیک جس طرح وہ عام پانی ایک حقیقت ہے، جو مشاہدہ میں نظر آرہا ہے، اسی طرح وہ تجزیاتی پانی بھی ایک حقیقت ہے، جو قطعاً ناقابل مشاہدہ ہے، اور صرف قیاس کے ذریعہ معلوم کیا گیا ہے، یہی حال دوسرے تمام حقائق کا ہے۔ اے۔ ای مینڈر (Alfred Ernest Mander, 1894-1985) لکھتا ہے:

''جو حقیقتیں (facts) ہم کو براہ راست حواس کے ذریعہ معلوم ہوں، وہ محسوس حقائق (perceived facts) ہیں، مگر جن حقیقتوں کو ہم جان سکتے ہیں، وہ صرف انھیں محسوس حقائق تک محدود نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے حقیقتیں ہیں جن کا علم اگرچہ براہِ راست ہم حاصل نہیں کرسکتے۔ پھر بھی ہم ان کے بارے میں جان سکتے ہیں۔ اس علم

کا ذریعہ استنباط ہے۔ اس طرح جو حقیقتیں معلوم ہوں، ان کو استنباطی حقائق (inferred facts) کہا جا سکتا ہے۔ یہاں یہ بات اہمیت کے ساتھ سمجھ لینے کی ہے کہ دونوں میں اصل فرق ان کے حقیقت ہونے کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ اس لحاظ سے ہے کہ ایک صورت میں ہم ''اس کو'' جانتے ہیں، اور دوسری صورت میں ''اس کے بارے میں'' معلوم کرتے ہیں۔ حقیقت بہر حال حقیقت ہے، خواہ ہم اس کو براہ راست مشاہدہ سے جانیں یا بہ طریق استنباط معلوم کریں۔''

Clearer Thinking, London, 1949, p. 46

وہ مزید لکھتا ہے:

''کائنات میں جو حقیقتیں ہیں، ان میں سے نسبتاً تھوڑی تعداد کو ہم حواس کے ذریعہ معلوم کر سکتے ہیں، پھر ان کے علاوہ جو اور چیزیں ہیں، ان کو ہم کیسے جانیں، اس کا ذریعہ استنباط (inference) یا تعقل (reasoning) ہے۔ استنباط یا تعقل ایک طریق فکر ہے، جس کے ذریعہ سے ہم کچھ معلوم واقعات سے آغاز کر کے بالآخر یہ عقیدہ بناتے ہیں کہ فلاں حقیقت یہاں موجود ہے، اگر چہ وہ کبھی دیکھی نہیں گئی۔'' (ایضاً صفحہ 49)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عقلی اور منطقی طریقہ حقیقت کو معلوم کرنے کا ذریعہ کیوں کر ہے، جس چیز کو ہم نے آنکھ سے نہیں دیکھا اور نہ کبھی اس کے وجود کا تجزیہ کیا، اس کے متعلق محض عقلی تقاضے کی بنا پر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ حقیقت ہے، مینڈر کے الفاظ میں اس کا جواب یہ ہے:

"The reasoning process is valid because the universe of fact is rational." (*Clearer Thinking*, p. 50)

یعنی منطقی استدلال کے ذریعہ حقیقت کو معلوم کرنے کا طریقہ صحیح ہے۔ کیوں کہ حقائق کی دنیا عقلی دنیا ہے۔ عالم واقعات ایک ہم آہنگ کل ہے، کائنات کے تمام حقائق ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں، اور ان کے درمیان زبردست نظم اور باقاعدگی پائی جاتی ہے۔ اس لیے مطالعہ کا کوئی ایسا طریقہ جو واقعات کی ہم آہنگی اور ان کی موزونیت کو ہم پر واضح نہ کرے، صحیح نہیں ہو سکتا۔

مینڈر یہ بتاتے ہوئے لکھتا ہے:

''نظر آنے والے واقعات محض عالم حقیقت کے کچھ اجزاء(patches of fact) ہیں، وہ سب کچھ جن کو ہم حواس کے ذریعہ جانتے ہیں، وہ محض جزئی اور غیر مربوط واقعات ہوتے ہیں، اگر الگ سے صرف انھیں کو دیکھا جائے تو وہ بے معنی معلوم ہوں گے۔ براہِ راست محسوس ہونے والے واقعات کے ساتھ اور بہت سے غیر محسوس واقعات کو ملا کر جب ہم دیکھتے ہیں، اس وقت ہم ان کی معنویت کو سمجھتے ہیں۔'' (صفحہ 51)

اس کے بعد وہ ایک سادہ سی مثال سے اس حقیقت کو سمجھا تا ہے:

''ہم دیکھتے ہیں کہ ایک چڑیا مرتی ہے تو زمین پر گر پڑتی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک پتھر کو زمین سے اٹھانے کے لیے طاقت خرچ کرنی ہوتی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ چاند آسمان میں گھوم رہا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ پہاڑی سے اترنے کے مقابلے میں چڑھنا زیادہ مشکل ہے، اس طرح کے ہزاروں مشاہدات ہمارے سامنے آتے ہیں جن کے درمیان بظاہر کوئی تعلق نہیں، اس کے بعد ایک استنباطی حقیقت(inferred facts) انکشاف ہوتا ہے یعنی تجاذب(gravitation) کا قانون ،اس کے فوراً بعد ہمارے یہ تمام مشاہدات اس استنباطی حقیقت کے ساتھ مل کر باہم مربوط ہوجاتے ہیں، اور اس طرح بالکل پہلی بار ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان مختلف واقعات کے درمیان نظم، باقاعدگی اور موافقت ہے۔ محسوس واقعات کو اگر الگ سے دیکھا جائے تو وہ بے ترتیب ،غیر مربوط اور متفرق معلوم ہوں گے، مگر محسوس واقعات اور استنباطی حقائق دونوں کو ملا دیا جائے تو وہ ایک منظم شکل اختیار کر لیتے ہیں۔'' (صفحہ 51)

اس مثال میں تجاذب کا قانون (law of gravitation) ایک تسلیم شدہ سائنسی حقیقت ہونے کے باوجود بذاتِ خود قطعًا ناقابل مشاہدہ ہے، سائنس دانوں نے جس چیز کو دیکھا یا تجربہ کیا وہ خود قانونِ کشش نہیں، کچھ دوسری چیزیں ہیں، اور ان دوسری چیزوں کو منطقی توجیہ کے

طور پر وہ ماننے پر مجبور ہوئے ہیں کہ یہاں کوئی ایسی چیز موجود ہے، جس کو ہم قانونِ تجاذب سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

یہ قانون تجاذب آج ایک مشہور ترین سائنسی حقیقت کے طور پر ساری دنیا میں جانا جاتا ہے، اس کو پہلی بار نیوٹن نے دریافت کیا، مگر خالص تجرباتی نقطۂ نظر سے اس کی حقیقت کیا ہے، اس کو نیوٹن کی زبان سے سنیے، اس نے بنٹلی کو ایک خط لکھا تھا، جو اس کے مجموعے میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

''یہ ناقابل فہم ہے کہ بے جان اور بے حس مادہ کسی درمیانی واسطہ کے بغیر دوسرے مادہ پر اثر ڈالتا ہے، حالانکہ دونوں کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہوتا۔''

Works of W. Bently III, P.221

ایک ایسی ناقابل مشاہدہ اور ناقابل فہم چیز کو آج بلا اختلاف سائنسی حقائق سمجھا جاتا ہے، کیوں ،صرف اس لیے کہ اگر ہم ان کو مان لیں تو ہمارے کچھ مشاہدات کی اس سے توجیہ ہو جاتی ، گویا کسی چیز کے حقیقت ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کی واقعیت براہِ راست ہمارے تجربے اور مشاہدے میں آ رہی ہو، بلکہ وہ غیر مرئی عقیدہ بھی اسی درجہ کی ایک حقیقت ہے، جس سے ہم مختلف مشاہدات کو اپنے ذہن میں مربوط کر سکتے ہوں، جو معلوم واقعات کی معنویت ہم پر واضح کر سکے، مینڈر لکھتا ہے:

''یہ کہنا کہ ہم نے ایک حقیقت کو معلوم کر لیا ہے، دوسرے لفظوں میں گویا یہ کہنا ہے کہ ہم نے اس کی معنویت (meaning) کو معلوم کر لیا ہے، یا اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہم کسی چیز کی موجودگی کے سبب اور اس کے حالات کو معلوم کر کے اس کی تشریح کرتے ہیں، ہماری بیشتر یقینیات (beliefs) اسی نوعیت کی ہیں، وہ دراصل مشاہدات کی توضیح (Statements of Observation) ہیں۔''

Clearer Thinking, p. 52

اس بحث کے بعد مینڈر مشہور حقائق (Observed Facts) کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''جب ہم کسی مشاہدے (Observation) کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیشہ ہم مجرد حسّیاتی مشاہدے سے کچھ زیادہ مراد لیتے ہیں، اس سے مراد حسّیاتی مشاہدہ نیز معرفت (Recognition) ہوتا ہے، جس میں تعبیر کا جز بھی شامل ہو۔'' (صفحہ 56)

یہی وہ اصول ہے جس کی بنیاد پر عضویاتی ارتقا (Organic Evolution) کے حقیقت ہونے پر سائنس دانوں کا اجماع ہو گیا ہے، مینڈر کے نزدیک یہ نظریہ ''اب اتنے دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس کو تقریباً حقیقت (Approximate Certainty) کہا جا سکتا ہے''۔

Clearer Thinking, p. 113

سمپسن (G.G. Simpson) کے الفاظ میں نظریۂ ارتقا آخری اور مکمل طور پر ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، نہ کہ محض ایک قیاس یا متبادل مفروضہ جو سائنس کی تحقیق کے لیے قائم کر لیا گیا ہو''

Meaning of Evolution, p. 127

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1958ء) کے مقالہ نگار نے حیوانات میں ارتقا کو بطور ایک حقیقت (truth) تسلیم کیا ہے، اور کہا ہے کہ ڈارون کے بعد اس نظریے کو سائنس دانوں اور تعلیم یافتہ طبقے کا قبول عام (general acceptance) حاصل ہو چکا ہے۔ رچرڈ لول (Richard Swann Lull, 1867-1957) لکھتا ہے:

> ''ڈارون کے بعد نظریہ ارتقا دن بدن زیادہ قبولیت حاصل کرتا رہا ہے، یہاں تک کہ اب سوچنے اور جاننے والے لوگوں میں اس بارے میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا ہے کہ یہ واحد منطقی طریقہ ہے، جس کے تحت عمل تخلیق کی توجیہ ہو سکتی ہے، اور اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔''

Organic Evolution, p.15

یہ نظریہ جس کی صداقت پر سائنس دانوں کا اس قدر اتفاق ہو گیا ہے۔ کیا اسے کسی نے دیکھا

ہے، یااس کا تجربہ کیا ہے — ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے اور نہ ایسا ہوسکتا ہے۔ ارتقا کا مزعومہ عمل اتنا پیچیدہ ہے، اوراتنے بعیدترین ماضی سے متعلق ہے، جس کو دیکھنے یا تجربہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لول (Lull) کے مذکورہ بالاالفاظ کے مطابق یہ ایک ''منطقی طریقہ'' ہے، جس سے تخلیقی مظاہر کی توجیہ کی جاتی ہے، نہ کہ تخلیق کے واقعہ کا مشاہدہ۔ چنانچہ سر آرتھر کیتھ جوخود بھی ارتقا کا حامی ہے، اس نے ارتقا کو مشاہداتی یا تجرباتی حقیقت کے بجائے ایک ''عقیدہ'' قرار دیا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

Evolution is a basic dogma of rationalism

Revolt Against Reason, p.112

یعنی نظریۂ ارتقا مذہب عقلیت کا ایک بنیادی عقیدہ ہے، چنانچہ ایک سائنسی انسائیکلو پیڈیا میں ڈارونزم کو ایک ایسا نظریہ کہا گیا ہے، جس کی بنیاد توجیہ بلا مشاہدہ (explanation without demonstration) پر قائم ہے۔

Revolt against Reason, p. 111

پھر ایک ایسی غیر مشاہد اور ناقابل تجربہ چیز کو علمی حقیقت کیوں سمجھا جاتا ہے، اس کی وجہ اے، ای مینڈر کے الفاظ میں یہ ہے:

1۔ یہ نظریہ تمام معلوم حقیقتوں سے ہم آہنگ (consistent) ہے۔

2۔ اس نظریے میں ان بہت سے واقعات کی توجیہ مل جاتی ہے، جو اس کے بغیر سمجھے نہیں جاسکتے۔

3۔ دوسرا کوئی نظریہ ابھی تک ایسا سامنے نہیں آیا جو واقعات سے اس درجہ مطابقت رکھتا ہو۔

Clearer Thinking, p. 112

اگر یہ استدلال نظریہ ارتقا کو حقیقت قرار دینے کے لیے کافی ہے تو یہی استدلال بدرجہا زیادہ شدت کے ساتھ مذہب کے حق میں موجود ہے۔ ایسی حالت میں نظریۂ ارتقا کو سائنسی حقیقت قرار دینا، اور مذہب کو سائنسی ذہن کے لیے ناقابل قبول ٹھہرانا صرف اس بات کا مظاہرہ ہے کہ آپ کا مقدمہ اصلاً ''طریق استدلال'' کا مقدمہ نہیں ہے، بلکہ وہ نتیجہ سے متعلق ہے۔ ایک ہی طریق

استدلال سے اگر کوئی خالص طبیعیاتی نوعیت کا واقعہ ثابت ہو تو آپ فوراً اسے قبول کر لیں گے اور اگر کوئی الٰہیاتی نوعیت کی چیز ثابت ہو تو آپ اسے رد کر دیں گے، کیوں کہ یہ نتیجہ آپ کو پسند نہیں۔

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ مذہب ایمان بالغیب کا نام ہے، اور سائنس ایمان بالشہود کا۔ حقیقت یہ ہے مذہب اور سائنس دونوں ہی ایمان بالغیب پر عمل کرتے ہیں، مذہب کا اصل دائرہ اشیا کی اصلی اور آخری حقیقت متعین کرنے کا دائرہ ہے، سائنس اسی وقت تک مشاہداتی علم ہے، جب تک وہ ابتدائی اور خارجی مظاہر پر کلام کر رہی ہو، جہاں وہ اشیاء کی آخری اور حقیقی حیثیت متعین کرنے کے میدان میں آتی ہے، جو کہ مذہب کا اصلی میدان ہے، تو وہ بھی ٹھیک اسی طرح ''ایمان بالغیب'' کا طریقہ اختیار کرتی ہے، جس کا الزام مذہب کو دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس میدان میں اس کے سوا چارہ نہیں۔ بقول آرتھر اڈنگٹن (Sir Arthur Eddington) دور جدید کا سائنس داں جس میز پر کام کر رہا ہے، وہ بیک وقت دو میزیں ہیں، ایک میز تو وہی ہے، جو عام انسان استعمال کرتا ہے، اور جس کو چھونا اور دیکھنا ممکن ہے — دوسری میز اس کی علمی میز (scientific table) ہے، اس کا بیشتر حصہ خلا ہے، اور اس میں بے شمار نا قابل مشاہدہ الیکٹران دوڑ رہے ہیں۔ اسی طرح ہر چیز کے مثنّٰی (duplicate) ہیں، جن میں سے ایک تو قابل مشاہدہ ہے، اور دوسرا صرف تصوراتی ہے۔ اس کو کسی بھی خوردبین یا دوربین سے دیکھا نہیں جا سکتا۔

Eddington, *The Nature of the Physical World*, (Cambridge, The University Press 1948), p. 261.

جہاں تک چیزوں کی شکلِ اول کا تعلق ہے، اس کو بیشک سائنس دیکھتی ہے، اور بہت دور تک دیکھتی ہے۔ مگر اس نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے شکل ثانی کو بھی دیکھ لیا ہے، اس میدان میں اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کسی حقیقت کے مظاہر کو دیکھ کر اس کے بارے میں ایک رائے قائم کرتی ہے، گویا جہاں تک اس دوسرے میدان — اشیا کی حقیقت معلوم کرنے کا میدان —

کا تعلق ہے، سائنس نام ہے، معلوم حقائق کی مدد سے نامعلوم حقائق کو جاننا۔

جب سائنس داں کے پاس مشاہداتی حقائق (جن کو در حقیقت وجدان صورت پذیر کرتا ہے) کی کچھ تعداد فراہم ہوجاتی ہے تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اب اسے ایک ایسے مفروضہ یا نظریہ زیادہ صحیح الفاظ میں ایک وجدانی یا اعتقادی تصور کی ضرورت ہے، جو ان مشاہدات کی تشریح کرے، ان کو منظم کرے اور انھیں ایک وحدت میں پِرو دے۔ لہٰذا وہ اس قسم کا ایک وجدانی مفروضہ ایجاد کرتا ہے۔ اگر یہ مفروضہ فی الواقع ان تمام حقائق کی معقول تشریح کر رہا ہو، تو وہ بھی ایک ایسی ہی قابل یقین حقیقت شمار کیا جاتا ہے، جیسی کہ کوئی اور علمی حقیقت جس کو سائنس داں ''مشاہدہ'' قرار دیتا ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت سائنس دانوں کے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کبھی مشاہدہ میں نہ آئی ہو، مگر یہ غیر مرئی حقیقت صرف اس لیے حقیقت سمجھی جاتی ہے کہ دوسرا مفروضہ ایسا موجود نہیں ہے، جو ان مشہود حقائق کی واقعی تشریح کرتا ہو۔

گویا سائنس داں ایک غائب چیز کی موجودگی پر اس کے نتائج واثرات کی وجہ سے یقین کر لیتا ہے، ہر وہ حقیقت جس پر یقین کرتے ہیں، شروع میں ایک مفروضہ ہی ہوتی ہے، پھر جوں جوں نئے حقائق منکشف ہو کر اس مفروضے کی تائید کرتے جاتے ہیں، اس مفروضہ کی صداقت نمایاں ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ اس پر ہمارا یقین، حق الیقین کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر ظاہر ہونے والے حقائق اس مفروضہ کی تائید نہ کریں تو ہم اس مفروضہ کو غلط سمجھ کر ترک کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی ناقابل انکار حقیقت کی ایک مثال جس پر سائنس داں ایمان بالغیب رکھتا ہے، وہ ایٹم ہے۔ ایٹم کو آج تک معروف معنوں میں دیکھا نہیں گیا، مگر اس کے باوجود وہ جدید سائنس کی سب سے بڑی تسلیم شدہ حقیقت ہے، اسی بنا پر ایک عالم نے سائنسی نظریات کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے — نظریات دراصل ذہنی نقشے ہیں، جو معلوم قوانین کی توجیہ کرتے ہیں:

"Theories and mental pictures that explain known laws."

سائنس کے میدان میں جن ''حقائق'' کو مشاہداتی حقائق (observed facts) کہا جاتا ہے،

وہ دراصل مشاہداتی حقائق نہیں بلکہ کچھ مشاہدات کی تعبیریں ہیں، اور چوں کہ انسانی مشاہدہ کو کامل نہیں کہا جاسکتا، اس لیے یہ تعبیریں بھی تمام کی تمام اضافی ہیں، اور مشاہدہ کی ترقی سے تبدیل ہوسکتی ہیں۔ جے، ڈبلو، سولیون (John William Navin Sullivan, 1886-1037) سائنسی نظریات پر ایک تبصرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے:

''سائنسی نظریات کے اس جائزے سے یہ ثابت ہوجاتی ہے کہ ایک صحیح سائنسی نظریہ محض یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ ایک کامیاب عملی مفروضہ (Successful Working Hypothesis) ہے، یہ بہت ممکن ہے کہ تمام سائنسی نظریات اصلاً غلط ہوں، جن نظریات کو آج ہم تسلیم کرتے ہیں، وہ محض ہمارے موجودہ حدود مشاہدہ کے اعتبار سے حقیقت ہیں، حقیقت (Truth) اب بھی سائنس کی دنیا میں ایک علمی اور افادی مسئلہ (Pragmatic Affair) ہے۔''

The Limitation of Science, p. 158

اس کے باوجود سائنس داں ایک مفروضہ کو جو اس کے مشاہداتی حقائق کی معقول تشریح کرتا ہو، مشاہداتی حقائق سے کم درجہ کی علمی حقیقت نہیں سمجھتا، وہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مشاہداتی حقائق تو سائنس ہیں، لیکن وہ نظریہ جو ان کی تشریح کرتا ہے وہ سائنس نہیں — اسی کا نام ایمان بالغیب ہے۔ ایمان بالغیب مشہود حقائق سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ محض ایک اندھا عقیدہ نہیں ہے، بلکہ وہ مشہود کی صحیح ترین توجیہ ہے، جس طرح نیوٹن کے نظریۂ روشنی (Corpuscular Theory of Light) کو بیسویں صدی کے سائنس دانوں نے اس لیے رد کردیا کہ وہ مظاہر نور کی تشریح میں ناکام نظر آیا۔ اسی طرح ہم بے خدا مفکرین کے نظریۂ کائنات کو اس بنا پر ردّ کرتے ہیں کہ وہ حیات وکائنات کے مظاہر کی تشریح میں ناکام ہے۔ مذہب کے بارے میں ہمارے یقین کا ماخذ عین وہی چیز ہے، جو ایک سائنس داں کے لیے کسی سائنسی نظریے کے بارے میں ہوتا ہے۔ ہم مشاہداتی حقائق کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ مذہب کی تشریحات عین حق ہیں، اور اس درجہ حق ہیں کہ ہزاروں برس گزرنے کے باوجود ان کی صداقت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہر وہ انسانی نظریہ جو آج سے

چندسو برس پہلے بنایا گیا، وہ نئے مشاہدات وتجربات کے ظہور میں آنے کے بعد مشتبہ اور متروک ہو چکا ہے۔ اِس کے برعکس، مذہب ایک ایسی صداقت ہے، جو ہر نئی تحقیق سے اور نکھرتی چلی جارہی ہے، ہر واقعی دریافت اس کے لیے تصدیق بنتی چلی جاتی ہے۔

اگلے صفحات میں ہم اسی پہلو سے مذہب کے بنیادی تصورات کا مطالعہ کریں گے۔

کائنات خدا کی گواہی دیتی ہے

کیرالا کے ایک عیسائی مشن نے ایک کتابچہ شائع کیا تھا، جس کا نام تھا:

Nature and Science Speak about God

اس باب کے عنوان کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ الفاظ موزوں ترین ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کا سب سے بڑا ثبوت اس کی وہ مخلوق ہے، جو ہمارے سامنے موجود ہے، فطرت اور اس کے بارے میں ہمارا بہترین علم پکار رہا ہے کہ بے شک اس دنیا کا ایک خدا ہے، اس کے بغیر ہم کائنات کو اور اپنے آپ کو سمجھ نہیں سکتے۔

کائنات کی موجودگی، اس کے اندر حیرت انگیز تنظیم اور اس کی اتھاہ معنویت کی اس کی سوا کوئی توجیہ نہیں ہوسکتی کہ اس کو کسی نے بنایا ہے، اور یہ بنانے والا ایک لامحدود ذہن ہے، نہ کہ کوئی اندھی طاقت۔

1۔ فلسفیوں میں سے ایک گروہ، نہایت مختصر گروہ، ایسا ہے جو کسی قسم کے وجود ہی میں شک کرتا ہے۔ اس کے نزدیک نہ یہاں کوئی انسان ہے اور نہ کوئی کائنات۔ بس ایک عدم محض ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر اس نقطۂ نظر کو صحیح مان لیا جائے تو یقیناً خدا کا وجود مشتبہ ہوجاتا ہے۔ لیکن جیسے ہم کائنات کو مانتے ہیں، ہمارے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ ہم خدا کو مانیں — کیوں کہ عدم سے وجود کا پیدا ہونا ایک ناقابل قیاس بات ہے۔

جہاں تک اس مخصوص قسم کی تشکیک اور لاادریت کا تعلق ہے، وہ ایک فلسفیانہ نکتہ تو ہوسکتا ہے مگر اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ جب ہم سوچتے ہیں تو ہمارا سوچنا خود اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ ہمارا کوئی وجود ہے۔ جب راستہ چلتے ہوئے کسی پتھر سے ٹکراتے ہیں، اور ہمیں تکلیف ستانے لگتی ہے تو یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ ہمارے باہر کوئی دنیا ہے، جس کا اپنا وجود ہے، اسی طرح ہمارا ذہن اور ہمارے تمام حواس ہر آن بے شمار چیزوں کو محسوس کرتے ہیں، اور یہ علم و احساس

ہر شخص کے لیے اس بات کا ایک ذاتی ثبوت ہے کہ وہ ایک ایسی دنیا میں ہے، جو واقعی طور پر اپنا وجود رکھتی ہے۔ اب اگر کسی کا فلسفیانہ تفکر اس کے لیے دنیا کے وجود کو مشتبہ کر دیتا ہے، تو یہ ایک ایسی مستثنیٰ حالت ہے جو کروڑوں انسانوں کے تجربات سے غیر متعلق ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی مخصوص قسم کی ذہنی فضا میں گم ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو گیا ہے۔

اگرچہ کائنات کا موجود نہ ہونا بذاتِ خود اس بات کا کوئی لازمی ثبوت نہیں ہے کہ خدا بھی موجود نہ ہو، تاہم اپنی انتہائی لغویت کے باوجود یہی ایک نقطۂ نظر ہے، جس کے لیے خدا کا وجود مشتبہ ہو سکتا ہے۔ مگر یہ نقطۂ نظر خود اتنا بے معنی ہے کہ آج تک نہ تو عام انسانوں کے لیے وہ قابلِ فہم ہو سکا، اور نہ علمی دنیا میں اس کو قبول عام حاصل ہوا ہے۔ عام انسان اور عام اہل علم بہر حال اس واقعہ کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا اپنا ایک وجود ہے، اور کائنات بھی اپنا وجود رکھتی ہے۔ سارے علوم اور زندگی کی تمام سرگرمیاں اسی علم و یقین کی بنیاد پر قائم ہیں۔

پھر جب ایک کائنات ہے تو لازماً اس کا ایک خدا ہونا چاہیے۔ یہ بالکل بے معنی بات ہے کہ ہم مخلوق کو مانیں مگر خالق کا وجود تسلیم نہ کریں۔ ہمیں کسی بھی ایسی چیز کا علم نہیں جو پیدا کیے بغیر وجود میں آ گئی ہو۔ ہر چھوٹی بڑی چیز لازمی طور اپنا ایک سبب رکھتی ہے پھر اتنی بڑی کائنات کے بارے میں کیسے یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ یونہی وجود میں آ گئی، اس کا کوئی خالق نہیں۔

جان اسٹوارٹ مل (John Stuart Mill, 1806-1873) نے اپنی آٹو بیا گرافی میں لکھا ہے کہ میرے باپ، جیمس مل (James Mill, 1773-1836) نے مجھے یہ سبق دیا کہ یہ سوال کہ کس نے مجھے پیدا کیا (who made me)، خدا کے اثبات کے لیے کافی نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد فوراً دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا (who made God)، چنانچہ برٹرینڈ رسل نے بھی اسی اعتراض کو تسلیم کرتے محرک اول کے استدلال کو رد کر دیا ہے:

The Age of Analysis by Morton White, P.21. 22.

یہ منکرین خدا کا بہت پرانا استدلال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا اگر کوئی خالق مانیں تو اس خالق کو لازمی طور پر ازلی ماننا پڑے گا۔ پھر جب خدا کو ازلی ماننا ہے تو کیوں نہ کائنات ہی کو ازلی مان لی جائے اگر چہ یہ بالکل بے معنی بات ہے۔ کیوں کہ کائنات کی کوئی ایسی صفت ہمارے علم میں نہیں آئی ہے، جس کی بنا پر اس کو خود اپنا خالق فرض کیا جا سکے — تاہم انیسویں صدی تک منکرین کی اس دلیل میں ایک ظاہر فریبِ حُسن ضرور موجود تھا، مگر اب حرکیات حرارت کے دوسرے قانون (Second Law of Thermodynamics) کے انکشاف کے بعد تو یہ دلیل بالکل بے بنیاد ثابت ہو چکی ہے۔

یہ قانون، جسے ناکارگی کا قانون (Law of Entropy) کہا جاتا ہے، ثابت کرتا ہے کہ کائنات ہمیشہ سے موجود نہیں ہو سکتی، ضابطۂ ناکارگی بتاتا ہے کہ حرارت مسلسل حرارت والے وجود سے بے حرارت وجود میں منتقل ہوتی رہتی ہے، مگر اس چکر کو الٹا چلایا نہیں جا سکتا کہ خود بخود یہ حرارت، کم حرارت کے وجود سے زیادہ حرارت کے وجود میں منتقل ہونے لگے، ناکارگی، دستیاب توانائی (available energy) اور غیر دستیاب توانائی (unavailable energy) کے درمیان تناسب کا نام ہے، اور اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کائنات کی ناکارگی برابر بڑھ رہی ہے، اور ایک وقت ایسا آنا مقدر ہے جب تمام موجودات کی حرارت یکساں ہو جائے گی، اور کوئی کارآمد توانائی باقی نہ رہے گی، اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کیمیائی اور طبعی عمل کا خاتمہ ہو جائے گا اور زندگی بھی اسی کے ساتھ ختم ہو جائے گی، لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ کیمیائی اور طبعی عمل جاری اور زندگی کے ہنگامے قائم ہیں، یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ کائنات ازل سے موجود نہیں ہے ورنہ اخراج حرارت کے لازمی قانون کی وجہ سے اس کی توانائی کبھی ختم ہو چکی ہوتی، اور یہاں زندگی کی ہلکی سی رمق بھی موجود نہ ہوتی۔

اس جدید تحقیق کا حوالہ دیتے ہوئے ایک امریکی عالم حیوانات ایڈورڈ لوتھر کیسل (Edward Luther Kessel, 1904-1997) لکھتا ہے:

''اس طرح غیر ارادی طور پر سائنس کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کائنات اپنا ایک آغاز (beginning) رکھتی ہے اور ایسا کرتے ہوئے اس نے خدا کی صداقت کو ثابت کر دیا ہے، کیوں کہ جو چیز اپنا ایک آغاز رکھتی ہو وہ اپنے آپ شروع نہیں ہو سکتی، یقیناً وہ ایک محرک اول، ایک خالق، ایک خدا کی محتاج ہے۔''

The Evidence of God, p.51

یہی بات سر جیمز نے ان الفاظ میں کہی ہے:

''موجودہ سائنس کا یہ خیال ہے کہ کائنات میں ناکارگی (Entropy) کا عمل ہمیشہ جاری رہے گا یہاں تک کہ اس کی توانائی بالکل ختم ہو جائے، یہ ناکارگی ابھی اپنے درجہ کو نہیں پہنچی ہے، اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو ہم اس کے متعلق سوچنے کے لیے موجود نہ ہوتے، یہ ناکارگی اس وقت بھی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے، اور اس بنا پر اس کا ایک آغاز ہونا ضروری ہے، کائنات میں لازماً اس قسم کا کوئی عمل ہوا ہے، جس کو ہم ایک وقت خاص میں تخلیق (creation at a time) کہہ سکتے ہیں، نہ یہ کہ وہ لامتناہی مدت سے موجود ہے۔''

Mysterious Universe, p.133

اس طرح کے اور بھی طبیعیاتی شواہد ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ کائنات ازل سے موجود نہیں ہے، بلکہ وہ ایک محدود عمر رکھتی ہے، مثلاً فلکیات کا یہ مشاہدہ ہے کہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے، تمام کہکشائیں اور فلکیاتی اجسام مشاہدہ میں نہایت تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے ہٹتے ہوئے نظر آتے ہیں، اس صورت حال کی اس وقت نہایت عمدہ توجیہ ہو جاتی ہے، جب ہم ایک ایسے ابتدائی وقت کو تسلیم کر لیں، جب تمام اجزائے ترکیبی مجتمع اور مرکوز حالت میں تھے، اور اس کے بعد ان میں حرکت و توانائی کا آغاز ہوا، اس طرح کے مختلف قرائن کی بنا پر عام اندازہ یہ ہے کہ لگ بھگ پچاس کھرب سال پہلے ایک غیر معمولی دھماکے سے یہ سارا عالم وجود میں آیا۔ اب سائنس کی اس دریافت کو ماننا کہ کائنات محدود عمر رکھتی ہے، اور اس کے موجد کو نہ ماننا، ایسا ہی ہے، جیسے کوئی شخص یہ تو تسلیم

کرے کہ تاج محل ہمیشہ سے موجود نہیں تھا، بلکہ سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں بنا، مگر اس کے باوجود اس کا کوئی معمار اور انجینئر تسلیم نہ کرے اور کہے کہ وہ بس اپنے آپ ایک مخصوص تاریخ کو بن کر کھڑا ہو گیا ہے!

2۔ فلکیات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا کے تمام سمندروں کے کنارے ریت کے جتنے ذرے ہیں شاید اسی قدر آسمان میں ستاروں کی تعداد ہے، ان میں کچھ ستارے ایسے ہیں، جو زمین سے کسی قدر بڑے ہیں، مگر بیشتر ستارے اتنے بڑے ہیں کہ ان کے اندر لاکھوں زمینیں رکھی جا سکتی ہیں، اور بعض ستارے تو اس قدر بڑے ہیں کہ اربوں زمینیں ان کے اندر سما سکتی ہیں، پھر بھی کچھ جگہ خالی رہے گی۔ یہ کائنات اس قدر وسیع ہے کہ روشنی کی مانند ایک انتہائی ممکن حد تک تیز اڑنے والا راکٹ جس کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہو، وہ کائنات کے گرد گھومے تو اس ہوائی جہاز کو کائنات کا پورا چکر لگانے میں تقریباً ایک ارب سال لگیں گے پھر اتنی وسعت کے باوجود یہ کائنات ٹھہری ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ ہر لمحہ اپنے چاروں طرف پھیل رہی ہے، اس پھیلنے کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ایڈنگٹن کے اندازے کے مطابق، ہر 1300 ملین سال کے بعد کائنات کے تمام فاصلے دگنے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ہمارا یہ خیالی قسم کا غیر معمولی تیز رفتار خلائی راکٹ بھی کائنات کا چکر کبھی پورا نہیں کر سکتا، وہ ہمیشہ اس بڑھتی ہوئی کائنات کے راستہ میں رہے گا۔ (یہ کائنات کی وسعت کے بارے میں آئن سٹائن کا نظریہ ہے۔ مگر یہ صرف ایک ''ریاضی داں کا قیاس ہے''۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ابھی تک کائنات کی وسعت کو سمجھ نہیں سکا ہے)۔

آسمان گرد و غبار سے پاک ہو تو پانچ ہزار ستارے خالی آنکھ سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن معمولی دوربینوں کی مدد سے یہ تعداد بیس لاکھ سے زیادہ ہو جاتی ہے، اور وقت کی سب سے بڑی دوربین جو ماؤنٹ پیلومر پر لگی ہوئی ہے، اس سے اربوں ستارے نظر آتے ہیں۔ مگر یہ تعداد اصل تعداد کے مقابلے میں بہت کم ہے، کائنات ایک بے انتہا وسیع خلا ہے، جس میں لاتعداد ستارے غیر معمولی رفتار سے مسلسل حرکت کر رہے ہیں، کچھ ستارے تنہا سفر کر رہے ہیں، کوئی دو یا زیادہ ستاروں کے مجموعوں کی

شکل میں ہیں اور بے شمار ستارے ایسے ہیں، جو ستاروں کے جھرمٹ کی صورت میں متحرک ہیں، روشن دان سے کمرے میں آنے والی روشنی کے اندر آپ نے بے شمار ذرے اِدھر اُدھر دوڑتے ہوئے دیکھے ہوں گے اسی کو اگر آپ بہت بڑے پیمانے پر قیاس کرسکیں تو کائنات کے اندر ستاروں کی گردش کا آپ ہلکا سا اندازہ کرسکتے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ ذرے باہم ملے ہوئے حرکت کرتے ہیں، اور ستارے تعداد کی اس کثرت کے باوجود دوسرے ستاروں سے بے اندازہ فاصلے پر سرگرم سفر ہیں، جیسے وسیع سمندروں میں چند جہاز جو ایک دوسرے سے اتنی دوری پر چل رہے ہوں کہ انھیں ایک دوسرے کی خبر نہ ہو۔

یہ ساری کائنات ستاروں کے بے شمار جھرمٹوں کی صورت میں ہے۔ ہر جھرمٹ کو کہکشاں کہتے ہیں، اور یہ سب کے سب مسلسل حرکت میں ہیں۔ سب سے قریبی حرکت جس سے ہم واقف ہیں، وہ چاند ہے، چاند زمین سے دو لاکھ چالیس ہزار میل دور رہ کر اس کے گرد مسلسل اس طرح گھوم رہا ہے کہ ہر ساڑھے 29 دن میں زمین کے گرد اس کا ایک چکر پورا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہماری زمین جو سورج سے ساڑھے نو کروڑ میل دور ہے، وہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتی ہوئی سورج کے گرد انیس کروڑ میل کا دائرہ بناتی ہے جو ایک سال میں پورا ہوتا ہے۔ اسی طرح زمین سمیت نو سیارے ہیں، اور وہ سب کے سب سورج کے گرد مسلسل دوڑ رہے ہیں۔ ان سیاروں میں بعید ترین سیارہ پلوٹو ہے جو ساڑھے سات ارب میل کے دائرہ میں چکر لگا رہا ہے۔ یہ تمام سیارے اپنے سفر میں اس طرح مصروف ہیں کہ ان کے گرد اکتیس چاند (2020 کی سائنسی تحقیق کے مطابق، 640 چاند) بھی اپنے اپنے سیاروں کے گرد گھوم رہے ہیں۔ ان کے علاوہ تیس ہزار چھوٹے سیاروں (asteroids) کا ایک حلقہ (2020 میں امریکن خلائی ادارہ ناسا کے مطابق، چھوٹے سیاروں کی تعداد 1,068,760) ہے۔ ہزاروں دم دار ستارے اور لاتعداد شہاب ثاقب ہیں، جو اسی طرح گردش میں مصروف ہیں۔ ان سب کے بیچ میں وہ ستارہ ہے، جس کو ہم سورج کہتے ہیں، اور جس کا قطر (diameter) آٹھ لاکھ 65 ہزار میل ہے، اور وہ زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا ہے۔

یہ سورج خود بھی رکا ہوا نہیں ہے بلکہ اپنے تمام سیاروں اور سیارچوں کو لیے ہوئے ایک عظیم کہکشانی نظام کے اندر چھ لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گردش کررہا ہے، اسی طرح ہزاروں حرکت کرتے ہوئے نظام ہیں، جن سے مل کر ایک کہکشاں وجود میں آتی ہے، کہکشاں گویا ایک بہت بڑی پلیٹ ہے، جس پر بے شمار ستارے انفرادی طور پر اور جھرمٹ کی شکل میں لٹوؤں کی طرح مسلسل گھوم رہے ہیں، پھر یہ کہکشائیں خود بھی حرکت کرتی ہیں، چنانچہ وہ قریبی کہکشاں جس میں ہمارا شمسی نظام واقع ہے، وہ اپنے محور پر اس طرح گردش کررہی ہے کہ اس کا ایک دور بیس کروڑ سال میں پورا ہوتا ہے۔

علمائے فلکیات کے اندازے کے مطابق کائنات پانچ سوملین، (2020 کی تحقیق کے مطابق، ایک سو بلین سے دوسو بلین) کہکشاؤں پر مشتمل ہے، اور ہر کہکشاں میں ایک لاکھ ملین یا اس سے کم و بیش ستارے پائے جاتے ہیں، قریبی کہکشاں جس کے ایک حصے کو ہم رات کے وقت سفید دھاری کی شکل میں دیکھتے ہیں، اس کا رقبہ ایک لاکھ سال نور ہے، اور ہم زمین کے رہنے والے کہکشاں کے مرکز سے تیس ہزار نوری سال کے بقدر دور ہیں، پھر یہ کہکشاں ایک اور بڑی کہکشاں کا جزء ہے، جس میں اسی طرح سترہ کہکشائیں حرکت کررہی ہیں، اور پورے مجموعہ کا قطر بیس لاکھ سال نور ہے۔

ان تمام گردشوں کے ساتھ ایک اور حرکت جاری ہے، اور وہ یہ کہ ساری کائنات غبار کی طرح چاروں طرف پھیل رہی ہے ہمارا سورج ہیبت ناک تیزی کے ساتھ چکر کھاتا گھومتا ہوا بارہ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے اپنی کہکشاں کے بیرونی حاشیے کی طرف مسلسل بھاگ رہا ہے، اور اپنے ساتھ نظام شمسی کے تمام توابع کو بھی لیے جارہا ہے اسی طرح تمام ستارے اپنی گردش کو قائم رکھتے ہوئے کسی نہ کسی طرف کو بھاگ رہے ہیں، کسی کے بھاگنے کی رفتار آٹھ میل فی سیکنڈ ہے، کسی کی 33 میل فی سیکنڈ کسی کی 84 میل فی سیکنڈ، اسی طرح تمام ستارے انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ دور بھاگے چلے جارہے ہیں۔

یہ ساری حرکت حیرت انگیز طور پر نہایت تنظیم اور باقاعدگی کے ساتھ ہورہی ہے، نہ ان میں باہم کوئی ٹکراؤ ہوتا اور نہ رفتاریں کوئی فرق پڑتا، زمین کی حرکت سورج کے گرد حد درجہ منضبط ہے، اسی

طرح اپنے محور کے اوپر اس کی گردش اتنی صحیح ہے کہ صدیوں کے اندر بھی اس میں ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آنے پاتا، زمین کا سیارہ جس کو چاند کہتے ہیں، اس کی گردش بھی پوری طرح مقرر ہے، اس میں جو تھوڑا سا فرق ہوتا ہے، وہ بھی ہر ساڑھے 18 سال کے بعد نہایت صحت کے ساتھ دہرا دیا جاتا ہے، یہی تمام اجرام سماوی کا حال ہے، حتّٰی کہ ماہرین فلکیات کے اندازے کے مطابق اکثر خلائی گردش کے دوران ایک پورا کہکشانی نظام، جو اربوں متحرک ستاروں پر مشتمل ہوتا ہے، دوسرے کہکشانی نظام میں حرکت کرتا ہوا داخل ہوتا ہے اور پھر اس سے نکل جاتا ہے مگر باہم کسی قسم کا کوئی ٹکراو پیدا نہیں ہوتا — اس عظیم اور حیرت انگیز تنظیم کو دیکھ کر عقل کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ اپنے آپ قائم نہیں ہے، بلکہ کوئی غیر معمولی طاقت ہے جس نے اس اتھاہ نظام کو قائم رکھا ہے۔

یہی ضبط و نظم جو بڑی بڑی دنیاؤں کے درمیان نظر آتا ہے، وہی چھوٹی دنیاؤں میں بھی انتہائی مکمل شکل میں موجود ہے، اب تک کی معلومات کے مطابق سب سے چھوٹی دنیا ایٹم ہے، ایٹم اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ کسی بھی خوردبین سے نظر نہیں آتا، حالانکہ جدید خوردبین کسی چیز کو لاکھوں گنا بڑھا کر دکھانے کی صلاحیت رکھتی ہے، ایٹم کی حقیقت انسانی قوت بصارت کے اعتبار سے ''لاشے'' سے زیادہ نہیں، مگر اس انتہائی چھوٹے ذرے کے اندر حیرت انگیز طور پر ہمارے شمسی نظام کی طرح ایک زبردست گردشی نظام موجود ہے، ایٹم برق پاروں کے ایک مجموعے کا نام ہے، مگر یہ برق پارے ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ ان کے درمیان ایک طویل خلائی حجم ہوتا ہے، سیسے (lead) کا ایک ٹکڑا جس میں ایٹمی ذرات کافی سختی اور مضبوطی کے ساتھ آپس میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں، یہ برق پارے حجم کے سو کرور حصوں میں سے ایک حصہ بھی مشکل سے گھیرتے ہیں، بقیہ حصے بالکل خالی ہوتے ہیں، اگر الیکٹرون اور پروٹون کے دو ٹکڑوں کی حیثیت سے تصویر بنائی جائے تو دونوں کا درمیانی فاصلہ تقریباً 350 گز ہوسکتا ہے یا ایٹم کا تصور گرد کے ایک غیر مرئی ذرہ کی حیثیت سے کیا جائے تو الکٹرون کی گردش سے جو حجم بنتا ہے، اس کی مقدار ایک ایسے فٹ بال کی سی ہوسکتی ہے، جس کا قطر آٹھ فٹ ہو۔

ایٹم کے منفی برق پارے جوالیکٹرون کہلاتے ہیں، وہ مثبت برق پارے کے گرد گھومتے ہیں، جن کو پروٹون کہا جاتا ہے، یہ برقیے، جوروشنی کی کرن کے ایک موہوم نقطہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے، اپنے مرکز کے گرد اسی طرح گردش کرتے ہیں، جیسے زمین اپنے مدار پر سورج کے گرد گردش کرتی ہے، اور یہ گردش اتنی تیز ہوتی ہے کہ الکٹرون کا کسی ایک جگہ تصور نہیں کیا جاسکتا، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے، گویا وہ پورے مدار پر ایک ہی وقت میں ہر جگہ موجود ہے، وہ اپنے مدار پر ایک سکنڈ میں ہزاروں ارب چکر لگا لیتا ہے۔

یہ ناقابل قیاس اور ناقابل مشاہدہ تنظیم اگر سائنس کے قیاس میں اس لیے آجاتی ہے کہ اس کے بغیر ایٹم کے عمل کی توجیہ نہیں کی جاسکتی تو ٹھیک اسی دلیل سے آخر ایک ایسے ناظم کا تصور کیوں نہیں کیا جاسکتا جس کے بغیر ایٹم کی اس تنظیم کا برپا ہونا محال ہے۔

ٹیلی فون کی لائن میں تاروں کا پیچیدہ نظام دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے ہم کو تعجب ہوتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ لندن سے ملبورن کے لیے ایک کال چند منٹ میں مکمل ہوجاتی ہے، مگر یہاں ایک اور مواصلاتی نظام ہے، جو اس سے کہیں زیادہ وسیع اور اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے، یہ ہمارا اپنا عصبی نظام (nervous system) ہے، جو قدرت نے قائم کر رکھا ہے، اس مواصلاتی نظام پر رات دن کروڑوں خبریں اِدھر سے اُدھر دوڑتی رہتی ہیں، جو دل کو بتاتی ہیں کہ وہ کب دھڑکے، مختلف اعضا کو حکم دیتی ہیں کہ وہ کب حرکت کریں، پھیپھڑے سے کہتی ہیں کہ وہ کیسے اپنا عمل کرے، اگر جسم کے اندر یہ مواصلاتی نظام نہ ہو تو ہمارا پورا وجود تاش کے پتوں کی مانند منتشر ہو کر رہ جائے۔

اس مواصلاتی نظام کا مرکز انسان کا برین (brain) ہے۔ آپ کے برین کے اندر تقریباً ایک ہزار ملین عصبی خانے (nerve cells) ہیں۔ ہر خانے سے بہت باریک تار نکل کر تمام جسم کے اندر پھیلے ہوتے ہیں جن کو عصبی ریشے (nerve fibers) کہتے ہیں۔ ان پتلے ریشوں پر خبر وصول کرنے اور حکم بھیجنے کا ایک نظام تقریباً ستر (70) میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا رہتا ہے۔ انھیں اعصاب کے ذریعہ ہم چکھتے ہیں، سنتے ہیں، دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، اور سارا عمل کرتے ہیں۔

زبان میں تین ہزار ذائقہ خانے (taste buds) ہیں، جن میں ہر ایک اپنے علیٰحدہ عصبی تار کے ذریعہ دماغ سے جڑا ہوا ہے۔ انھیں کے ذریعہ وہ ہر قسم کے مزوں کو محسوس کرتا ہے، کان میں ایک لاکھ تعداد میں سماعت خانے ہوتے ہیں۔ انھیں خانوں سے ایک نہایت پیچیدہ عمل کے ذریعہ ہمارا دماغ سنتا ہے۔ ہر آنکھ میں 130 ملین روشنی اخذ کرنے والے (light receptors) ہوتے ہیں، جو تصویری مجموعے دماغ کو بھیجتے ہیں۔ ہماری تمام جلد میں حسیاتی ریشوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ اگر ایک گرم چیز جلد کے سامنے لائی جائے تو تقریباً 30 ہزار ''گرم خانے'' اس کو محسوس کر کے فوراً دماغ کو اس کی خبر دیتے ہیں۔ اسی طرح جلد میں دو لاکھ پچاس ہزار خانے ایسے ہیں، جو سرد چیزوں کو محسوس کرتے ہیں۔ جب کوئی سرد چیز جسم سے ملتی ہے تو دماغ اس کی خبروں سے بھر جاتا ہے، جسم کانپنے لگتا ہے، جلد کی رگیں پھیل جاتی ہیں، فوراً مزید خون رگوں میں دوڑ کر آتا ہے تاکہ زیادہ گرمی پہونچائی جاسکے۔ اگر ہم شدید گرمی سے دوچار ہوں تو گرمی کے مخبرین دماغ کو اطلاع کرتے ہیں، اور تین ملین پسینہ کے غدود (glands) ایک ٹھنڈا عرق خارج کرنا شروع کرتے ہیں۔

عصبی نظام (nervous system) کی کئی تقسیمیں ہیں۔ ان میں سے ایک خودکار عصبی نظام (autonomic nervous system [ANS]) ہے۔ یہ ایسے افعال انجام دیتی ہے، جو خود بخود جسم کے اندر ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً ہضم، سانس لینا اور دل کی حرکت، وغیرہ۔ پھر اس عصبی شاخ کے بھی تین حصّے ہیں، ایک کا نام ہے، مشارک نظام (sympathetic nervous system) جو کہ حرکت پیدا کرتا ہے، اور دوسرا parasympathetic nervous system ہے، جو روک کا کام کرتا ہے، اور تیسرا enteric nervous system ہے، یہ ہضم کا نظام کنٹرول کرتا ہے۔ اگر جسم تمام تر پہلے کے قابو میں چلا جائے تو، مثال کے طور پر، دل کی حرکت اتنی تیز ہو جائے کہ موت آجائے، اور اگر بالکل دوسرے کا اختیار ہو جائے تو دل کی حرکت ہی رک جائے، وغیرہ۔ یہ تینوں شاخیں نہایت صحت کے ساتھ مل کر اپنا اپنا کام کرتی ہیں۔ جب دباؤ کے وقت فوری طاقت کی ضرورت ہوتی ہے تو مشارک

نظام کوغلبہ حاصل ہوجاتا ہے، اور دل اور پھیپھڑے تیزی سے کام کرنے لگتے ہیں، اسی طرح نیند کے وقت parasympathetic کا غلبہ ہوتا ہے۔ یہ تمام جسمانی حرکتوں پر سکوت طاری کر دیتا ہے۔ ہاضمے کا موقع آئے تو تیسرا نظام اپنا کام کرتا ہے۔ (ریڈرز ڈائجسٹ اکتوبر 1956ء)

اس طرح کے بے شمار پہلو ہیں، اوراسی طرح کائنات کی ہر چیز میں ایک زبردست نظام قائم ہے جس کے سامنے انسانی مشینوں کا بہتر سے بہتر نظام بھی مات ہے، اوراب تو قدرت کی نقل بھی سائنس کا ایک مستقل موضوع بن چکا ہے۔ اس سے پہلے سائنس کا میدان صرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ فطرت میں جو طاقتیں چھپی ہیں، ان کو دریافت کر کے استعمال کیا جائے، مگراب قدرت کے نظاموں کو سمجھ کر ان کی میکانکی نقل کو خاص اہمیت دی جا رہی ہے، اس طرح ایک نیا علم وجود میں آیا، جس کو بایونکس (Bionics) کہتے ہیں، بایونکس، یا حیاتیاتی نظام (Biological Systems) اورطریقوں کا اس غرض سے مطالعہ کرتی ہے کہ جو معلومات حاصل ہوں انھیں انجینئرنگ کے مسائل حل کرنے میں استعمال کیا جائے۔

قدرت کی نقل کرنے کی اس قسم کی مثالیں ٹیکنالوجی میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً کیمرہ دراصل آنکھ کی میکانکی نقل ہے، کیمرے کا لینس (lens) آنکھ کے ڈھیلے کا بیرونی پردہ ہے، ڈائفرام (diaphragm) پردہ شبکی (iris) ہے، اور روشنی سے متاثر ہونے والی فلم آنکھ کا پردہ ہے، جس میں عکس دیکھنے کے لیے ڈورے اورمخروطی شکلیں ہوتی ہیں۔ (کوئی ذی ہوش یہ کہنے کی غلطی نہیں کرے گا کہ کیمرہ اتفاق سے بن کر تیار ہو گیا ہے، مگراس کے باوجود دنیا کے بہت سے لوگ یہ یقین رکھتے ہیں کہ "آنکھ محض اتفاق سے وجود میں آ گئی ہے۔") ماسکو یونیورسٹی میں زیرصوتی ارتعاش (infrasonic vibrations) معلوم کرنے اوراس کی پیمائش کرنے کا ایک نمونے کا آلہ تیار کیا گیا ہے، جو طوفان کی آمد کی اطلاع 12 سے 15 گھنٹے پہلے تک دے دیتا ہے، یہ مروجہ آلوں سے پانچ گنا زیادہ طاقت ور ہے، اس کا خیال کس نے پیدا کیا؟ مچھلی (Jelly Fish) نے۔ انجینئروں نے اس کے اعضا کی نقل کی، جو زیرصورت صوتی ارتعاش محسوس کرنے میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔

Soviet Land, December 1963

اس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، طبیعیاتی سائنس اور ٹکنالوجی درحقیقت نئے تصورات کی نقل قدرت کے زندہ نمونوں سے حاصل کرتی ہے، بہت سے مسائل جو سائنس دانوں کے تخیل پر بوجھ بنے ہوئے ہیں، قدرت ان کو مدتوں پہلے حل کرچکی ہے، پھر جس طرح کیمرہ اور ٹیلی پرنٹر کا ایک نظام انسانی ذہن کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا، اسی طرح یہ بھی ناقابل تصور ہے کہ کائنات کا پیچیدہ ترین نظام کسی ذہن کے بغیر اپنے آپ قائم ہو، کائنات کی تنظیم قدرتی طور پر ایک انجینئر اور ایک ناظم کا تقاضا کرتی ہے، اسی کا نام خدا ہے، ہم کو جو ذہن ملا ہے، وہ ناظم کے بغیر تنظیم کا تصور نہیں کرسکتا، اس لیے غیر معقول بات یہ نہیں ہے کہ ہم کائناتی تنظیم کے لیے ایک ناظم کا اقرار کریں، بلکہ یہ غیر معقول رویہ ہوگا کہ ہم کائناتی تنظیم کے ناظم کو ماننے سے انکار کردیں، حقیقت یہ ہے کہ انسانی ذہن کے پاس خدا سے انکار کے لیے کوئی عقلی بنیاد نہیں ہے۔

3۔ کائنات کوڑا کرکٹ کے ڈھیر کے مانند نہیں ہے بلکہ اس کے اندر حیرت انگیز معنویت ہے، یہ واقعہ صریح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی تخلیق وتدبیر میں کوئی ذہن کام کررہا ہے ،ذہنی عمل کے بغیر کسی چیز میں ایسی معنویت پیدا نہیں ہوسکتی ،محض اندھے مادی عمل سے اتفاقی طور پر وجود میں آجانے والی کائنات میں تسلسل نظم اور معنویت پائے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔ کائنات اس قدر حیرت انگیز طور پر موزوں اور مناسب ہے کہ یہ ناقابل تصور ہے کہ یہ مناسبت اور موزونیت خود بخود محض اتفاقاً وجود میں آگئی ہو—چاڈ واش (Chadvalsh) کے الفاظ ہیں:

> ’’ایک شخص ،خواہ وہ خدا کا اقرار کرنے والا ہو یا اس کا منکر ہو، جائز طور پر اس سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ دکھائے کہ اتفاق کا توازن اس کے حق میں کس طرح ہوجاتا ہے۔‘‘

The Evidence of God, p. 88

زمین پر زندگی کے پائے جانے کے لیے اتنے مختلف حالات کی موجودگی ناگزیر ہے کہ ریاضیاتی طور پر یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ اپنے مخصوص تناسب میں محض اتفاقاً زمین کے اوپر اکٹھا ہوجائیں، اب اگر ایسے حالات پائے جاتے ہیں تو لازماً یہ ماننا ہوگا کہ فطرت میں کوئی ذی شعور

رہنمائی موجود ہے جو ان حالات کو پیدا کرنے کا سبب ہے۔

زمین اپنی جسامت کے اعتبار سے کائنات میں ایک ذرے کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی، مگر اس کے باوجود وہ ہماری تمام معلوم دنیاؤں میں اہم ترین ہے، کیوں کہ اس کے اوپر حیرت انگیز طور پر وہ حالات مہیا ہیں، جو ہمارے علم کے مطابق اس وسیع کائنات میں کہیں نہیں پائے جاتے۔

سب سے پہلے زمین کی جسامت کو لیجیے، اگر اس کا حجم کم یا زیادہ ہوتا تو اس پر زندگی محال ہو جاتی۔ مثلاً کرۂ زمین، اگر چاند اتنا چھوٹا ہوتا، یعنی اس کا قطر موجودہ قطر کی نسبت سے ایک چوتھائی 1/4 ہوتا تو اس کی کشش ثقل، زمین کی موجودہ کشش کا 1/6 رہ جاتی، کشش کی اس کمی کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہماری زمین پانی اور ہوا کو اپنے اوپر روک نہ سکتی، جیسا کہ جسامت کی اسی کمی کی وجہ سے چاند میں واقع ہوا ہے، چاند پر اس وقت نہ تو پانی ہے، اور نہ کوئی ہوائی کرہ ہے، ہوا کا غلاف نہ ہونے کی وجہ سے وہ رات کے وقت بیحد سرد ہو جاتا ہے، اور دن کے وقت تنور کے مانند جلنے لگتا ہے، اسی طرح کم جسامت کی زمین جب کشش کی کمی کی وجہ سے پانی کی اس کثیر مقدار کو روک نہ سکتی جو زمین پر موسمی اعتدال کو باقی رکھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے، اور اسی بنا پر ایک سائنس داں نے اس کو عظیم توازنی پہیہ (Great Balance-Wheel) کا نام دیا ہے (دیکھیے *The Evidence of God*)، اور ہوا کا موجودہ غلاف اڑ کر فضا میں گم ہو جاتا تو اس کا حال یہ ہوتا کہ اس کی سطح پر درجہ حرارت چڑھتا تو انتہائی حد تک چڑھ جاتا، اور گرتا تو انتہائی حد تک گر جاتا، اس کے برعکس اگر زمین کا قطر موجودہ کی نسبت سے دگنا ہوتا تو اس کی کشش ثقل بھی دگنی بڑھ جاتی، کشش کے اس اضافہ کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا، جو اس وقت زمین کے اوپر پانچ سو میل کی بلندی تک پائی جاتی ہے، وہ کھنچ کر بہت نیچے تک سمٹ جاتی، اس کے دباؤ میں فی مربع انچ 15 تا 30 پونڈ کا اضافہ ہو جاتا، جس کا ردعمل مختلف صورتوں میں زندگی کے لیے نہایت مہلک ثابت ہوتا، اور اگر زمین سورج کے برابر ہوتی اور اس کی کثافت برقرار رہتی تو اس کی کشش ثقل ڈیڑھ سو گنا بڑھ جاتی، ہوا کے غلاف کی دبازت گھٹ کر پانچ سو میل کے بجائے صرف چار میل رہ جاتی، نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا کا دباؤ ایک ٹن فی مربع انچ تک جا پہنچتا،

اس غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے زندہ اجسام کا نشو ونما ممکن نہ رہتا، ایک پونڈ وزنی جانور کا وزن ایک سو پچاس پونڈ ہو جاتا انسان کا جسم گھٹ کر گلہری کے برابر ہو جاتا اور اس میں کسی قسم کی ذہنی زندگی ناممکن ہو جاتی، کیوں کہ انسانی ذہانت حاصل کرنے کے لیے بہت کثیر مقدار میں اعصابی ریشوں کی موجودگی ضروری ہے، اور اس طرح کے پھیلے ہوئے ریشوں کا نظام ایک خاص درجہ کی جسامت ہی میں پایا جا سکتا ہے۔

بظاہر ہم زمین کے اوپر ہیں، مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ہم اس کے نیچے سر کے بل لٹکے ہوئے ہیں۔ زمین گویا فضا میں معلق ایک گیند ہے، جس کے چاروں طرف انسان بستے ہیں، کوئی شخص ہندستان کی زمین پر کھڑا ہو تو امریکا کے لوگ بالکل اس کے نیچے ہوں گے، اور امریکا میں کھڑا ہو تو ہندستان اس کے نیچے ہوگا۔ پھر زمین ٹھہری ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مسلسل گھوم رہی ہے۔ ایسی حالت میں زمین کی سطح پر ہمارا انجام وہی ہونا چاہیے، جیسے سائیکل کے پہیے پر کنکریاں رکھ کر پہیے کو تیزی سے گھما دیا جائے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ایک خاص تناسب سے زمین کی کشش اور ہوا کا دباؤ ہم کو ٹھہرائے ہوئے ہیں۔ زمین کے اندر غیر معمولی قوت کشش ہے جس کی وجہ سے وہ تمام چیزوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے، اور اوپر سے ہوا کا مسلسل دباؤ پڑتا ہے۔ اسی دوطرفہ عمل نے ہم کو زمین کے گولے پر چاروں طرف لٹکا رکھا ہے۔ ہوا کا دباؤ انسانی جسم پر ہر ایک مربع انچ کے اوپر ساڑھے پندرہ پاؤنڈ پڑتا ہے۔ آدمی اس وزن کو محسوس نہیں کرتا۔ کیوں کہ ہوا جسم کے چاروں طرف ہے۔ دباؤ ہر طرف سے پڑتا ہے۔ اس لیے آدمی کو محسوس نہیں ہوتا، جیسا کہ پانی میں غوطہ لگانے کی صورت میں ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ہوا — جو مختلف گیسوں کے مخصوص مرکب کا نام ہے، اس کے بے شمار دیگر فائدے ہیں، جن کا بیان کسی کتاب میں ممکن نہیں۔

نیوٹن اپنے مشاہدہ اور مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ تمام اجسام ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، مگر اجسام کیوں ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں۔ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا،

چنانچہ اس نے کہا کہ میں اس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کرسکتا۔ وائٹ ہیڈ (A. N. Whitehead) اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے:

''نیوٹن نے یہ کہہ کر ایک عظیم فلسفیانہ حقیقت کا اظہار کیا ہے، کیوں کہ فطرت اگر بے روح فطرت ہے، تو وہ ہم کو توجیہ نہیں دے سکتی، ویسے ہی جیسے مردہ آدمی کوئی واقعہ نہیں بتا سکتا، تمام عقلی اور منطقی توجیہات آخری طور پر ایک مقصدیت کا اظہار ہیں، جب کہ مردہ کائنات میں کسی مقصدیت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔''

The Age of Analysis, p. 85

وائٹ ہڈ کے الفاظ کو آگے بڑھاتے ہوئے میں کہوں گا کہ کائنات اگر کسی صاحبِ شعور کے زیر اہتمام نہیں ہے، تو اس کے اندر اتنی معنویت کیوں پائی جاتی ہے۔

زمین اپنے محور پر چوبیس گھنٹے میں ایک چکر پورا کرلیتی ہے، یا یوں کہیے کہ وہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی ہے۔ فرض کرو اس کی رفتار دو سو میل فی گھنٹہ ہوجائے اور یہ بالکل ممکن ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے دن اور ہماری راتیں موجودہ کی نسبت سے دس گنا زیادہ لمبے ہوجائیں گے۔ گرمیوں کا سخت سورج ہر دن تمام نباتات کو جلا دے گا اور جو بچے گا وہ لمبی رات کی ٹھنڈک میں پالے کی نذر ہوجائے گا۔ سورج جو اس وقت ہمارے لیے زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اس کی سطح پر بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ کا ٹمپریچر ہے، اور زمین سے اس کا فاصلہ تقریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے اور یہ فاصلہ حیرت انگیز طور پر مسلسل قائم ہے۔ یہ واقعہ ہمارے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اگر یہ فاصلہ گھٹ جائے۔ مثلاً سورج نصف کے بقدر قریب آجائے تو زمین پر اتنی گرمی پیدا ہو کہ اس سے کاغذ جلنے لگے، اور اگر موجودہ فاصلہ دگنا ہوجائے تو اتنی ٹھنڈک پیدا ہو کہ زندگی باقی نہ رہے۔ یہی صورت اس وقت پیدا ہوگی جب موجودہ سورج کی جگہ کوئی دوسرا غیر معمولی ستارہ آجائے۔ مثلاً کوئی بہت بڑا ستارہ جس کی گرمی ہمارے سورج سے دس ہزار گنا زیادہ ہے، اگر وہ سورج کی جگہ ہوتا تو زمین کو آگ کی بھٹی بنا دیتا۔

زمین 23 درجہ کا زاویہ بناتی ہوئی فضا میں جھکی ہوئی ہے۔ یہ جھکاؤ ہمیں ہمارے موسم دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ آبادکاری کے قابل ہو گیا ہے، اور مختلف قسم کے نباتات اور پیداوار حاصل ہوتی ہیں۔ اگر زمین اس طرح سے جھکی ہوئی نہ ہوتی تو قطبین پر ہمیشہ اندھیرا رہتا۔ سمندر کے بخارات شمال اور جنوب کی جانب سفر کرتے اور زمین پر یا تو برف کے ڈھیر ہوتے یا صحرائی میدان۔ اس طرح کے اور بہت سے اثرات ہوتے جس کے نتیجے میں بغیر جھکی ہوئی زمین پر زندگی ناممکن ہو جاتی۔

یہ کس قدر ناقابل قیاس بات ہے کہ مادہ نے خود کو اپنے آپ اس قدر موزوں اور مناسب شکل میں منظم کر لیا! اگر سائنس دانوں کا قیاس صحیح ہے کہ زمین سورج سے ٹوٹ کر نکلی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتدائی زمین کا درجۂ حرارت وہی رہا ہوگا جو سورج کا ہے، یعنی بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ، اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی، آکسیجن اور ہائیڈروجن کا ملنا اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک زمین کا درجۂ حرارت گھٹ کر چار ہزار ڈگری پر نہ آجائے، اسی موقع پر دونوں گیسوں کے باہم ملنے سے پانی بنا، اس کے بعد کروڑوں سال تک زمین کی سطح اور اس کی فضا میں زبردست انقلابات ہوتے رہے، یہاں تک کہ غالباً ایک ملین سال پہلے زمین اپنی موجودہ شکل میں تیار ہوئی، زمین کی فضا میں جو گیسیں تھیں ان کا ایک بڑا حصّہ خلا میں چلا گیا، ایک حصہ نے پانی کے مرکب کی صورت اختیار کی، ایک حصہ زمین کی تمام چیزوں میں جذب ہو گیا، اور ایک حصّہ ہوا کی شکل میں ہماری فضا میں باقی رہ گیا جس کا بیشتر جزء آکسیجن اور نائٹروجن ہے یہ ہوا اپنی کثافت کے اعتبار سے زمین کا تقریباً دس لاکھواں حصّہ ہے — کیوں نہیں ایسا ہوا کہ تمام گیسیں جذب ہو جاتیں یا کیوں ایسا نہیں ہوا کہ موجودہ کی نسبت سے ہوا کی مقدار بہت زیادہ ہوتی، دونوں صورتوں میں انسان زندہ نہیں رہ سکتا تھا، یا اگر بڑھی ہوئی گیسوں کے ہزاروں پونڈ فی مربع انچ بوجھ کے نیچے زندگی پیدا بھی ہوتی تو یہ ناممکن تھا کہ وہ انسان کی شکل میں نشوونما پا سکے۔

زمین کی اوپری پرت اگر دس فٹ موٹی ہوتی تو ہماری فضا میں آکسیجن کا وجود نہ ہوتا، جس کے

بغیر حیوانی زندگی ناممکن ہے۔ اسی طرح اگر سمندر کچھ فٹ اور گہرے ہوتے تو کاربن ڈائی آکسائڈ اور آکسیجن کو جذب کر لیتے اور زمین کی سطح پر کسی قسم کی نباتات زندہ نہ رہ سکتیں، اگر زمین کے اوپر کی ہوائی فضا موجودہ کی نسبت سے لطیف ہوتی تو شہاب ثاقب (meteoroid) جو ہر روز اوسطاً دو کروڑ کی تعداد میں اوپری فضا میں داخل ہوتے ہیں اور رات کے وقت ہم کو جلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہ زمین کے ہر حصّے میں گرتے۔ یہ شہابیے (meteoroids) چھ سے چالیس میل تک فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کرتے ہیں۔ وہ زمین کے اوپر ہر آتش پذیر مادے کو جلا دیتے اور سطح زمین کو چھلنی کر دیتے، شہاب ثاقب بندوق کی گولی سے نوے گنا زیادہ رفتار کے ساتھ انسان جیسی مخلوق کو محض اپنی گرمی سے ٹکڑے کر دیتی، مگر ہوائی کرہ اپنے نہایت مناسب موٹائی کی وجہ سے ہم کو شہابِ ثاقب کی آتشیں بوچھار سے محفوظ رکھتا ہے۔ ہوائی کرہ ٹھیک اتنی کثافت رکھتا ہے کہ سورج کی کیمیائی اہمیت رکھنے والی شعائیں (actinic rays) اسی مناسب مقدار سے زمین پر پہنچتی ہیں، جتنی نباتات کو اپنی زندگی کے لیے ضرورت ہے جس سے مضر بیکٹیریا مر سکتے ہیں، جس سے وٹامن تیار ہو سکتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

زمین پر ہر چیز کا اس طرح عین ہماری ضرورتوں کے مطابق ہونا کس قدر عجیب ہے۔

زمین کی اوپری فضا چھ گیسوں کا مجموعہ ہے، جس میں تقریباً 78 فیصد نائٹروجن اور 21 فیصد آکسیجن ہے، باقی گیسیں بہت خفیف تناسب میں پائی جاتی ہیں، اس فضا سے زمین کی سطح پر تقریباً 15 پونڈ فی مربع انچ کا دباؤ پڑتا ہے، جس میں آکسیجن کا حصّہ 3 پوند فی مربع انچ ہے، موجودہ آکسیجن کا بقیہ حصّہ زمین کی تہوں میں جذب ہے، اور وہ دنیا کے تمام پانی کا دس میں سے آٹھ حصہ بناتا ہے آکسیجن تمام خشکی کے جانوروں کے لیے سانس لینے کا ذریعہ ہے، اور اس مقصد کے لیے فضا کے سوا کہیں اور سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ انتہائی متحرک گیسیں کس طرح آپس میں مرکب ہوئیں اور ٹھیک اس مقدار اور اس تناسب میں فضا کے اندر باقی رہ گئیں جو زندگی کے لیے ضروری تھا، مثال کے طور پر آکسیجن 21 فیصد کے بجائے پچاس فیصد یا اس سے زیادہ مقدار میں فضا کا جز ہوتا تو سطح زمین کی تمام

چیزوں میں آتش پذیری کی صلاحیت اتنی بڑھ جاتی کہ ایک درخت میں آگ پکڑتے ہی سارا جنگل بھک سے اڑ جاتا، اسی طرح اگر اس کا تناسب گھٹ کر 10 فیصد رہتا تو ممکن ہے زندگی صدیوں کے بعد ہم آہنگی اختیار کرلیتی مگر انسانی تہذیب موجودہ شکل میں ترقی نہیں کرسکتی تھی، اور اگر آزاد آکسیجن بھی بقیہ آکسیجن کی طرح زمین کی چیزوں میں جذب ہوگئی ہوتی تو حیوانی زندگی سرے سے ناممکن ہوجاتی۔

آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن ڈائی آکسائڈ اور کاربن گیسیں الگ الگ مختلف شکلوں میں مرکب ہوکر حیات کے اہم ترین عناصر ہیں، یہی وہ بنیادیں ہیں، جن پر زندگی قائم ہے، اس کا ایک فی ارب بھی امکان نہیں ہے کہ وہ ایک وقت میں کسی ایک سیارہ پر اس مخصوص تناسب کے ساتھ اکٹھا ہوجائیں، ایک عالم طبیعیات کے الفاظ ہیں— سائنس کے پاس ان حقائق کی توجیہ کے لیے کوئی چیز نہیں ہے، اور اس کو اتفاق کہنا ریاضیات سے کشتی لڑنے کے ہم معنی ہے:

''Science has no explanation to offer for the facts, and to say it is accidental is to defy mathematics.'' (The Age of Analysis, p. 33)

ہماری دنیا میں بے شمار ایسے واقعات موجود ہیں جن کی توجیہ اس کے بغیر نہیں ہوسکتی کہ اس کی تخلیق میں ایک برتر ذہانت کا دخل تسلیم کیا جائے۔

پانی کی مختلف نہایت اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ برف کی کثافت (density) پانی سے کم ہوتی ہے، پانی وہ واحد معلوم مادہ ہے، جو جمنے کے بعد ہلکا ہوجاتا ہے، یہ چیز بقائے حیات کے لیے زبردست اہمیت رکھتی ہے، اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ برف پانی کی سطح پر تیرتا رہتا ہے، اور دریاؤں جھیلوں اور سمندروں کی تہ میں بیٹھ نہیں جاتا، ورنہ آہستہ آہستہ سارا پانی ٹھوس اور منجمد ہوجائے، یہ پانی کی سطح پر ایک ایسی حاجب تہہ بن جاتا ہے کہ اس کے نیچے کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے اوپر ہی اوپر رہتا ہے، اس نادر خاصیت کی وجہ سے مچھلیاں اور دیگر آبی جانور زندہ رہتے ہیں، اس کے بعد جونہی موسم بہار آتا ہے، برف فوراً پگھل جاتا ہے، اگر پانی میں یہ خاصیت نہ ہوتی تو خاص طور پر سرد ملکوں کے لوگوں کو بہت بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب کہ امریکا میں انڈوتھیا (Endothia) نام کی بیماری شاہ بلوط (Chestnut) کے درختوں پر حملہ آور ہوئی اور تیزی سے پھیلی تو بہت سے لوگوں نے جنگل کی چھتری میں شگاف دیکھ کر کہا، "یہ شگاف اب پُر نہیں ہوں گے" امریکی شاہ بلوط کی بالادستی کو ابھی تک کسی اور قسم کے اشجار نے نہیں چھینا تھا، اونچے درجے کی دیرپا عمارتی لکڑی اور اس طرح کے دوسرے فوائد اس کے لیے خاص تھے، یہاں تک کہ 1900 میں ایشیا سے انڈوتھیا نام کی بیماری کا ورود ہوا اس وقت تک یہ جنگلات کا بادشاہ خیال کیا جاتا تھا، مگر اب جنگلات میں یہ درخت تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔

لیکن جنگلات کے یہ شگاف جلد ہی پر ہو گئے، کچھ دوسرے درخت (Tulip Trees) اپنی نشوونما کے لیے شاید انھیں شگافوں کا انتظار کر رہے تھے، شگاف پیدا ہونے سے پہلے تک یہ درخت جنگلات کا معمولی سا جزء تھے، اور شاذ ہی بڑھتے اور پھولتے تھے، لیکن اب شاہ بلوط کی عدم موجودگی کا کسی کو احساس تک نہیں ہوتا، کیوں کہ اب دوسری قسم کے درخت پوری طرح ان کی جگہ لے چکے ہیں، یہ دوسرے درخت سال بھر میں ایک انچ محیط میں اور چھ فٹ لمبائی میں بڑھتے ہیں، اتنی تیزی کے ساتھ بڑھنے کے علاوہ بہترین لکڑی جو بالخصوص باریک تہوں کے کام آسکتی ہے، ان سے حاصل کی جاتی ہے۔

اسی صدی کا واقعہ ہے، ناگ پھنی کی ایک قسم آسٹریلیا میں کھیتوں کی باڑھ قائم کرنے کے لیے بوئی گئی آسٹریلیا میں اس ناگ پھنی کا کوئی دشمن کیڑا نہیں تھا، چنانچہ وہ بہت تیزی سے بڑھنا شروع ہوگئی، یہاں تک کہ انگلینڈ کے برابر رقبہ پر چھا گئی، وہ شہروں اور دیہاتوں میں آبادی کے اندر گھس گئی، کھیتوں کو ویران کر دیا اور زراعت کو ناممکن بنا دیا، کوئی تدبیر بھی اس کے خلاف کارگر ثابت نہیں ہوتی تھی، ناگ پھنی آسٹریلیا کے اوپر ایک ایسی فوج کی طرح مسلط تھی جس کا اس کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا، بالآخر ماہرین حشرات الارض دنیا بھر میں اس کا علاج تلاش کرنے کے لیے نکلے، یہاں تک کہ ان کی رسائی ایک کیڑے تک ہوئی جو صرف ناگ پھنی کھا کر زندہ رہتا تھا، اس کے سوا اس کی کوئی خوراک نہیں تھی، وہ بہت تیزی سے اپنی نسل بڑھاتا تھا، اور آسٹریلیا میں اس کا کوئی دشمن نہیں تھا، اسی کیڑے نے آسٹریلیا میں ناگ پھنی کی

ناقابل تسخیر فوج پر قابو پالیا اور وہاں سے اس مصیبت کا خاتمہ ہو گیا۔

قدرت کے نظام میں یہ ضبط وتوازن (Checks and Balances) کی عظیم تدبیریں کیا کسی شعوری منصوبے کے بغیر خود بخود وجود میں آجاتی ہیں؟

کائنات میں حیرت انگیز طور پر ریاضیاتی قطعیت پائی جاتی ہے، یہ جامد و بے شعور مادہ جو ہمارے سامنے ہے، اس کا عمل غیر منظم اور بے ترتیب نہیں بلکہ وہ متعین قوانین کا پابند ہے''پانی'' کا لفظ خواہ دنیا کے جس خطہ میں اور جس وقت بھی بولا جائے اس کا ایک ہی مطلب ہوگا— ایک ایسا مرکب جس میں 11،1 فیصد ہائیڈروجن اور 88,9 فیصد آکسیجن۔ایک سائنس داں جب تجربہ گاہ میں داخل ہو کر پانی سے بھرے ہوئے ایک پیالے کو گرم کرتا ہے، تو وہ تھرمامیٹر کے بغیر یہ بتا سکتا ہے کہ پانی کا نقطۂ جوش 100 درجہ سینٹی گریڈ ہے، جب تک کہ ہوا کا دباؤ (Atmospheric Pressure) 670 ایم ایم رہے، اگر ہوا کا دباؤ اس سے کم ہو تو اس حرارت کو وجود میں لانے کے لیے کم طاقت درکار ہوگی جو پانی کے سالمات کو توڑ کر بخارات کی شکل دیتی ہے، اس طرح نقطۂ جوش سو درجہ سے کم ہو جائے گا، یہ تجربہ اتنی بار آزمایا گیا ہے کہ اس کو یقینی طور پر پہلے سے بتایا جاسکتا ہے کہ پانی کا نقطۂ جوش کیا ہے، اگر مادہ اور توانائی کے عمل میں یہ نظم اور ضابطہ نہ ہوتا تو سائنسی تحقیقات اور ایجادات کے لیے کوئی بنیاد نہ ہوتی، کیوں کہ پھر اس دنیا میں محض اتفاقات کی حکمرانی ہوتی اور علمائے طبعیات کے لیے یہ بتانا ممکن نہ رہتا کہ فلاں حالت میں فلاں طریق عمل کے دہرانے سے فلاں نتیجہ پیدا ہوگا۔

کیمیا کے میدان میں نو وارد طالب علم سب سے پہلے جس چیز کا مشاہدہ کرتا ہے، وہ عناصر میں نظم اور دَوریت ہے، سو سال پہلے ایک روسی ماہر کیمیا منڈلیف (Mendeleev) نے جوہری قدر کے لحاظ سے مختلف کیمیائی عناصر کو ترتیب دیا تھا، جس کو دَوری نقشہ (Periodic Chart) کہا جاتا ہے، اس وقت تک موجودہ تمام عناصر دریافت نہیں ہوئے تھے، اس لیے اس کے نقشہ میں بہت سے عناصر کے خانے خالی تھے، جو عین اندازے کے مطابق بعد کو پر ہو گئے ان نقشوں میں سارے عناصر جوہری نمبروں کے تحت اپنے اپنے مخصوص گروپوں میں درج کیے جاتے ہیں، جوہری نمبر سے

مراد مثبت برقیوں (Protons) کی وہ تعداد ہے جو ایٹم کے مرکز میں موجود ہوتی ہے، یہی تعداد ایک عنصر کے ایٹم اور دوسرے عنصر کے ایٹم میں فرق پیدا کر دیتی ہے، ہائیڈروجن جو سب سے سادہ عنصر ہے۔ اس کے ایٹم کے مرکز میں ایک پروٹون ہوتا ہے، ہیلیم میں دو اور لیتھیم میں تین، مختلف عناصر کی جدول تیار کرنا اسی لیے ممکن ہوسکا کہ ان میں حیرت انگیز طور پر ایک ریاضیاتی اصول کارفرما ہے، نظم و ترتیب کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ عنصر 101 کی شناخت محض اس کے 17 پروٹونوں کے مطالعہ سے کرلی گئی، قدرت کی اس حیرت انگیز تنظیم کو ہم دوری اتفاق (Periodic Chance) نہیں کہتے، بلکہ اس کو دوری ضابطہ (Periodic Law) کہتے ہیں، مگر نقشہ اور ضابطہ جو یقینی طور پر ناظم اور منصوبہ ساز کا تقاضا کرتے ہیں، منکرِ خدا اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنس اگر خدا کو نہ مانے تو وہ خود اپنی تحقیق کے ایک لازمی نتیجے کا انکار کرے گی۔

''11 اگست 1999ء میں ایک سورج گرہن واقع ہوگا جو کارنوال (Cornwall) میں مکمل طور پر دیکھا جاسکے گا''— یہ محض ایک قیاسی پیشین گوئی نہیں ہے بلکہ علمائے فلکیات یقین رکھتے ہیں کہ نظام شمسی کے موجودہ گردشی نظام کے تحت اس گہن کا پیش آنا یقینی ہے، جب ہم آسمان میں نظر ڈالتے ہیں تو ہم لاتعداد ستاروں کو ایک نظام میں منسلک دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ ان گنت صدیوں سے اس فضائے بسیط میں جو عظیم گیندیں معلق ہیں۔ وہ ایک ہی معین راستے پر گردش کرتی چلی جارہی ہیں۔ وہ اپنے مداروں میں اس نظم کے ساتھ آتی اور جاتی ہیں کہ ان کے جائے وقوع اور ان کے درمیان ہونے والے واقعات کا صدیوں پیشتر بالکل صحیح طور پر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پانی کے ایک حقیر قطرے سے لے کر فضائے بسیط میں پھیلے ہوئے دور دراز ستاروں تک ایک بے مثال نظم وضبط پایا جاتا ہے۔ ان کے عمل میں اس درجہ یکسانیت ہے کہ اس بنیاد پر قوانین مرتب کرتے ہیں۔

نیوٹن کا نظریۂ کشش فلکیاتی کروں کی گردش کی توجیہ کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں A.C. Adams اور لاویرے (U. Leverrier) کو وہ بنیاد ملی، جس سے وہ دیکھے بغیر ایک ایسے سیارے کے وجود کی پیشین گوئی کرسکیں، جو اس وقت تک نامعلوم تھا۔ چنانچہ ستمبر 1946ء کو ایک

رات کو جب برلن آبزرویٹری کی دوربین کا رخ آسمان میں ان کے بتائے ہوئے مقام کی طرف کیا گیا تو فی الواقع نظر آیا کہ ایسا ایک سیارہ نظام شمسی میں موجود ہے، جس کو ہم اب نیپچون (Neptune) کے نام سے جانتے ہیں— کس قدر نا قابل قیاس بات ہے کہ کائنات میں یہ ریاضیاتی قطعیت خود بخود قائم ہو گئی ہو۔

کائنات کی حکمت و معنویت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اندر سے ایسے امکانات رکھے گئے ہیں کہ انسان بوقت ضرورت تصرف کر کے اس کو اپنے لیے استعمال کر سکے، مثال کے طور پر نائٹروجن کے مسئلہ کو لیجیے، ہوا کے ہر جھونکے میں نائٹروجن 78 فی صد ہوتا ہے، اس کے علاوہ بہت سے کیمیائی اجزاء ہیں، جن میں نائٹروجن شامل ہوتا ہے، ان کو ہم مرکب نائٹروجن کہہ سکتے ہیں، یہی وہ نائٹروجن ہے، جس کو پودے استعمال کرتے ہیں اور جن سے ہماری غذا کا نائٹروجنی حصّہ تیار ہوتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو انسان اور جانور بھوکے مر جائیں۔

صرف دو طریقے ہیں، جن سے قابل تحلیل نائٹروجن مٹی میں مل کر کھاد بنتا ہے، اگر یہ نائٹروجن مٹی میں شامل نہ ہو تو کوئی بھی غذائی پودا نہ اُگے، ایک طریقہ جس سے یہ نائٹروجن مٹی میں شامل ہوتا ہے وہ مخصوص بیکٹیریائی عمل ہے، یہ بیکٹیریا دال کے پودوں کی جڑوں میں رہتے ہیں، اور ہوا سے نائٹروجن لے کر اس کو مرکب نائٹروجن کی شکل دیتے رہتے ہیں، پودا جب سوکھ کر ختم ہو جاتا ہے تو اس مرکب نائٹروجن کا کچھ حصّہ زمین میں رہ جاتا ہے۔

دوسرا ذریعہ جس سے مٹی کو نائٹروجن ملتا ہے، وہ بجلی کا کڑکا ہے۔ ہر بار جب بجلی کی رو فضا میں گزرتی ہے تو وہ تھوڑے سے آکسیجن کو نائٹروجن کے ساتھ مرکب کر دیتی ہے جو کہ بارش کے ذریعہ ہمارے کھیتوں میں پہنچ جاتا ہے، اس طرح سے جو نائٹریٹ نائٹروجن حاصل ہوتا ہے، اس کا اندازہ سالانہ ایک ایکڑ زمین میں پانچ پونڈ ہے جو کہ تیس پونڈ سوڈیم نائٹریٹ کے برابر ہے۔

Lyon, Bockman and Brady, *The Nature and Properties of Soil*

یہ دونوں طریقے بہر حال ناکافی تھے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ کھیت جن میں عرصہ دراز تک کھیتی

ہوتی رہتی ہے، ان کا نائٹروجن ختم ہو جاتا ہے، اور اسی لیے کاشتکار فصلوں کا الٹ پھیر کرتے رہتے ہیں
یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایک ایسے مرحلے میں جب کہ اضافہ آبادی اور کثرت کاشت کی وجہ سے مرکب نائٹروجن کی کمی محسوس کی جانے لگی تھی، اور انسان کو مستقبل میں قحط کے آثار نظر آنے لگے تھے، اور یہ صرف موجودہ صدی کے آغاز کی بات ہے کہ عین اس وقت وہ طریقہ دریافت ہو گیا جس سے ہوا کے ذریعہ مصنوعی طور پر مرکب نائٹروجن بنایا جا سکتا ہے، مرکب نائٹروجن بنانے کے لیے جو کوششیں کی گئیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ فضا میں مصنوعی طور پر بجلی کا کڑکا پیدا کیا گیا، کہا جاتا ہے کہ ہوا میں بجلی کی چمک پیدا کرنے کے لیے تقریباً تین لاکھ ہارس پاور کی قوت استعمال کی گئی، اور جیسا کہ پہلے سے اندازہ کیا جا چکا تھا، ایک قلیل مقدار نائٹروجن کی تیار ہو گئی، مگر اب انسان کی خداداد عقل نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور انسانی تاریخ کے دس ہزار سال بعد ایسے طریقے معلوم کر لیے گئے ہیں، جن سے وہ اس گیس کو کھاد میں تبدیل کر سکتا ہے، اس کے بعد انسان اس قابل ہو گیا ہے کہ وہ اپنی غذا کے اس لازمی جزء کو تیار کر سکے جس کے بغیر وہ بھوکوں مر جاتا، یہ نہایت عجیب حسن اتفاق ہے کہ زمین کی تاریخ میں پہلی بار عین وقت پر انسان نے قلت خوراک کا حل دریافت کر لیا، یہ المیہ ٹھیک اس وقت رفع ہو گیا جب کہ اس کے واقع ہونے کا امکان تھا۔

کائنات میں اس طرح کی حکمت و معنویت کے بے شمار پہلو ہیں، ہماری تمام سائنسوں نے ہم کو صرف یہ بتایا ہے کہ جو کچھ ہم نے معلوم کیا ہے، اس سے بہت زیادہ ہے وہ چیز، جس کو معلوم کرنا ابھی باقی ہے، تاہم جو کچھ انسان معلوم کر چکا ہے، وہ بھی اتنا زیادہ ہے کہ اس کے صرف عنوانات کی فہرست دینے کے لیے موجودہ کتاب سے بہت زیادہ ضخیم کتاب کی ضرورت ہوگی، اور پھر بھی عنوانات بچ رہیں گے، انسان کی زبان سے آلاءِ رب اور آیاتِ الٰہی کا ہر اظہار ناقص اظہار ہے، اس کی جتنی بھی تفصیل کی جائے، جہاں زبان و قلم رکیں گے وہاں یہ احساس ضرور موجود ہوگا کہ ہم نے "بیان" نہیں کیا بلکہ اس کی "تحدید" کر دی، حقیقت یہ ہے کہ اگر سارے علوم منکشف ہو جائیں، اور اس کے بعد سارے انسان اس طرح لکھنے بیٹھ جائیں کہ دنیا کے تمام وسائل ان کے لیے مددگار ہوں،

جب بھی کائنات کی حکمتوں کا بیان مکمل نہیں ہوسکتا۔ قرآن کے الفاظ میں—

وَلَوْ أَنَّمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ (31:27)۔ یعنی اگر زمین کے تمام درخت قلم ہوں اور موجودہ سمندروں کے ساتھ سات اور سمندر ان کی سیاہی کا کام دیں، جب بھی خدا کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔

جس نے بھی کائنات کا کچھ مطالعہ کیا ہے، وہ بلاشبہ اعتراف کرے گا کہ کتاب الٰہی کے ان الفاظ میں ذرا بھی مبالغہ نہیں، وہ صرف ایک موجودہ حقیقت کا سادہ سا اظہار ہے۔

پچھلے صفحات میں کائنات کے حیرت انگیز نظم اور اس کے اندر غیر معمولی حکمت و معنویت کا جو حوالہ دیا گیا ہے۔ مخالفین مذہب اس کو بطور واقعہ تسلیم کرتے ہوئے اس کی دوسری توجیہ کرتے ہیں، اس میں انھیں کسی ناظم و مدبر کا اشارہ نہیں ملتا، بلکہ یہ سب کچھ ان کے نزدیک محض ''اتفاق'' سے ہو گیا ہے۔ ٹی ایچ ہکسلے کے الفاظ میں چھ بندر اگر ٹائپ رائٹر پر بیٹھ جائیں اور کروڑوں سال تک اسے پیٹتے رہیں تو ہوسکتا ہے کہ ان کے سیاہ کیے ہوئے کاغذات کے ڈھیر میں سے آخری کاغذ پر شیکسپیئر کی ایک نظم (Sonnet) نکل آئے، اسی طرح اربوں اور کھربوں سال مادہ کے اندھا دھند گردش کے دوران میں موجودہ کائنات بن گئی ہے۔

The Mysterious Universe, p. 3-4

یہ بات اگرچہ بجائے خود بالکل لغو ہے، کیوں کہ ہمارے آج تک کے تمام علوم ایسے کسی اتفاق سے قطعاً ناواقف ہیں جس کے نتیجہ میں اتنا عظیم، اس قدر بامعنی اور مستقل واقعہ وجود میں آجائے جیسی کہ یہ کائنات ہے، بلاشبہ ہم بعض اتفاقات سے واقف ہیں، مثلاً ہوا کا جھونکا کبھی سرخ گلاب کے زیرہ (pollen) کو اڑا کر سفید گلاب پر ڈال دیتا ہے، جس کے نتیجے میں زرد رنگ کا پھول کھلتا ہے، مگر اس قسم کا اتفاق صرف ایک انتہائی جزئی اور استثنائی واقعہ کی توجیہ کرتا ہے۔ گلاب کا پورا وجود کائنات کے اندر ایک حالت میں اس کی مسلسل موجودگی اور سارے نظام عالم سے اس کا حیرت انگیز ربط، ہوا کے اتفاقی جھونکے سے سمجھا نہیں جا سکتا۔ ''اتفاقی واقعہ'' کے لفظ میں ایک جزئی صداقت

ہونے کے باوجود کائنات کی توجیہ کے اعتبار سے وہ ایک لغو بات ہے۔ پروفیسر ایڈون (Edwin Conklin) کے الفاظ میں ’’زندگی کا بذریعہ حادثہ (accident) وقوع میں آجانا ایسا ہی ہے جیسے پریس میں دھماکہ ہوجانے سے ایک ضخیم لغت کا تیار ہوجانا۔‘‘

The Evidence of God, p. 174

کہا جاتا ہے کہ ’’اتفاق‘‘ کے حوالے سے کائنات کی توجیہ کوئی الل ٹپ بات نہیں ہے، بلکہ سر جمیز کے الفاظ میں وہ خالص ریاضیاتی قوانین اتفاق (purely mathematical laws of chance) پر مبنی ہے۔

The Mysterious Universe, p. 3

اتفاق کی توجیہ کرتے ہوئے ایک مصنف لکھتا ہے:

’’اتفاق (Chance) محض ایک فرضی چیز نہیں ہے بلکہ ایک بہت ہی ترقی یافتہ حسابی نظریہ ہے، جس کا اطلاق ان امور پر کیا جاتا ہے جن میں قطعی معلومات ممکن نہیں ہوتیں، اس نظریے کے ذریعہ ایسے بے لاگ اصول ہمارے ہاتھ آجاتے ہیں جن کی مدد سے ہم صحیح اور غلط میں بآسانی امتیاز کرسکتے ہیں، اور کسی خاص نوعیت کے واقعہ کے صادر ہونے کے امکانات کا حساب لگا کر صحیح صحیح اندازہ کرسکتے ہیں کہ اتفاقاً اس کا پیش آجانا کس حد تک ممکن ہے۔‘‘

The Evidence of God, p. 23

اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ مادہ کسی خام حالت میں خود سے کائنات میں موجود ہوگیا، اور پھر یہ بھی فرض کرلیں کہ اس میں عمل اور ردعمل کا ایک سلسلہ بھی اپنے آپ شروع ہوگیا، اگرچہ ان مفروضات کے لیے کوئی بنیاد نہیں ہے — جب بھی کائنات کی توجیہ حاصل نہیں ہوتی — کیوں کہ یہاں ایک اور اتفاق مخالفینِ مذہب کی راہ میں حائل ہوگیا ہے، بدقسمتی سے ہماری ریاضیات جو قانونِ اتفاق کا قیمتی نکتہ ہمیں دیتی ہے، وہی اس بات کی تردید بھی کررہی ہے کہ قانون اتفاق، موجودہ کائنات کا خالق

ہوسکتا ہے، کیوں کہ سائنس نے معلوم کرلیا ہے کہ ہماری دنیا کی عمر اور جسامت کیا ہے، اور جو عمر اور جسامت اس نے معلوم کی ہے، وہ قانون اتفاق کے تحت موجودہ دنیا کے وقوع میں آنے کے لیے بالکل ناکافی ہے۔

''اگر تم دس سکّے لو اور ان پر ایک سے دس تک نشان لگادو، اس کے بعد انھیں اپنی جیب میں ڈال کر اچھی طرح ملا دو، اب ان کو ایک سے دس تک بالترتیب اس طرح نکالنے کی کوشش کرو کہ ایک سکہ نکالنے کے بعد ہر بار اس کو دوبارہ جیب میں ڈال دو تو بی یہ امکان کہ نمبر ایک سکّہ پہلی بار تمھارے ہاتھ میں آجائے دس میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک اور دو بالترتیب تمھارے ہاتھ میں آجائیں سو میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک دو اور تین نمبر سلسلہ وار تمھارے ہاتھ میں آجائیں ایک ہزار میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک، دو، تین اور چار نمبر کے سکے بالترتیب نکل آئیں دس ہزار میں ایک ہے، یہاں تک کہ یہ امکان کہ ایک سے دس تک تمام سکّے بالترتیب تمھارے ہاتھ آجائیں دس بلین (دس ارب) میں صرف ایک بار ہے''۔

یہ مثال نقل کرنے بعد کریسی ماریسن (A. Cressy Morrison) لکھتا ہے:

"The object in dealing with so simple a problem is to show how enormously figures multiply against chance."

Man does not Stand Alone, p. 17

یعنی یہ سادہ مثال اس لیے دی گئی تا کہ یہ امر اچھی طرح واضح ہوجائے کہ واقعات کی تعداد کی نسبت سے امکانات کی تعداد کتنی زیادہ ہوتی ہے۔

اب اندازہ کیجیے کہ اگر سب کچھ محض اتفاق سے ہوگیا ہے، تو اس کے لیے کتنی مدت درکار ہوگی، ذی حیات اشیا کی ترکیب زندہ خلیوں (Living Cells) سے ہوتی ہے، خلیہ ایک نہایت چھوٹا اور پیچیدہ مرکب ہے جس کا مطالعہ علم الخلیہ (Cytology) میں کیا جاتا ہے، ان خلیوں کی تعمیر میں جو اجزاء کام آتے ہیں، ان میں سے ایک پروٹین ہے، پروٹین ایک کیمیائی مرکب ہے جو پانچ

عناصر کے ملنے سے وجود میں آتا ہے— کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن اور گندھک پروٹینی سالمہ ان عناصر کے تقریباً چالیس ہزار جواہر (atoms) پر مشتمل ہوتا ہے۔

کائنات میں سو سے زیادہ کیمیائی عناصر بالکل منتشر اور بے ترتیب بکھرے ہوئے ہیں، اب اس امر کا امکان کس حد تک ہے کہ ان تمام عناصر کے بے ترتیب ڈھیر میں سے نکل کر یہ پانچوں عناصر اس طرح باہم ملیں کہ ایک پروٹینی سالمہ آپ سے آپ وجود میں آجائے، مادے کی وہ مقدار جسے مسلسل ہلانے سے اتفاقاً یہ نتیجہ نکل سکتا ہو اور وہ مدت جس کے اندر اس کام کی تکمیل ممکن ہو، حساب لگا کر معلوم کی جاسکتی ہے۔

سوئزرلینڈ کے ایک ریاضی داں پروفیسر چارلس ایوجین گائی (Charles Eugene Guye) نے اس کا حساب لگایا ہے، اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کے کسی اتفاقی واقعہ کا امکان 10^{160} کے مقابلے میں صرف ایک درجہ ہوسکتا ہے 10^{160} کا مطلب یہ ہے کہ دس کو دس سے ایک سو ساٹھ مرتبہ پے در پے ضرب دیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں دس کے آگے ایک سو ساٹھ صفر۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا عدد ہے جس کو الفاظ کی زبان میں ظاہر کرنا مشکل ہے۔

صرف ایک پروٹینی سالمہ کے اتفاقاً وجود میں آنے کے لیے پوری کائنات کے موجودہ مادہ سے کروڑوں گنا زیادہ مقدار مادہ مطلوب ہوگی جسے یکجا کر کے ہلایا جائے، اور اس عمل سے کوئی نتیجہ برآمد ہونے کا امکان 10^{143} سال بعد ہے۔

پروٹین، امینوایسڈ (Amino Acids) کے لمبے سلسلوں سے وجود میں آتے ہیں، اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس طریقہ کی ہے، جس سے یہ سلسلے باہم ملیں۔ اگر یہ غلط شکل میں یکجا ہو جائیں تو زندگی کی بقا کا ذریعہ بننے کے بجائے مہلک زہر بن جاتے ہیں، پروفیسر جے۔ بی لیتھیز (J. B. Leathes) نے حساب لگایا کہ ایک سادہ سے پروٹین کے سلسلوں کو اربوں اور کھربوں 10^{48} طریقے سے یکجا کیا جاسکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ یہ تمام امکانات ایک پروٹینی سالمہ کو وجود میں لانے کے لیے محض اتفاق سے یکجا ہو جائیں۔

واضح ہو کہ اس انتہائی بعید امکان کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ بے شمار مدت کی تکرار کے بعد لازماً یہ واقعہ ظہور میں آجائے گا، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ممکن ہے، ایسا ہو جائے، دوسری طرف یہ امکان بھی ہے کہ ہمیشہ دہراتے رہنے کے باوجود کبھی بھی ایسا کوئی واقعہ ظہور میں نہ آئے۔

پھر پروٹین خود محض ایک کیمیائی شے ہے، جس میں زندگی موجود نہیں ہوتی، پروٹین کے خلیہ کا جزء بننے کے بعد اس میں زندگی کی حرات کیسے پیدا ہوئی، اس کا جواب اس توجیہ میں نہیں ہے، پھر یہ بھی خلیہ کے صرف ایک ترکیبی جزء پروٹین کے صرف ایک ناقابل مشاہدہ ذرہ کے وجود میں آنے کی توجیہ ہے، جب کہ صرف ایک ذی حیات جسم کے اندر سنکھ (100 quadrillion) 100 مہا سنکھ (10 quintillion) کی تعداد میں ایسے مرکبات ہوتے ہیں۔

لے کامٹے ڈونوائے (Le Comte Du Nouy) نے اس پر بہت عمدہ اور مفصل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح کے امکان کے ظہور میں آنے کے لیے جس وقت، جس مقدار مادہ اور جس پہنائی کی ضرورت ہوگی وہ ہمارے تمام اندازوں سے ناقابل یقین حد تک زیادہ ہے، اس کے لیے ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے جس کا دائرہ اتنا بڑا ہو جس میں روشنی 10^{82} سال نور (دس کے آگے 82 صفر) سفر کر کے اس کو پار کر سکتی ہو، یہ حجم موجودہ کائنات سے بہت زیادہ ہے، کیوں کہ ہماری بعید ترین کہکشاں کی روشنی چند بلین سال نور میں ہم تک پہنچ جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آئن سٹائن نے کائنات کی وسعت کا جو اندازہ کیا ہے، وہ اس عمل کے لیے قطعاً ناکافی ہے، پھر اس مفروضہ کائنات میں پانچ سو ٹریلین حرکت فی سیکنڈ کی رفتار سے مادہ کی مفروضہ مقدار کو ہلایا جائے تب کہیں اس امر کا امکان پیدا ہوگا کہ پروٹین کا ایک ایسا سالمہ اتفاق سے وجود میں آئے جو زندگی کے لیے ضروری اور مفید ہے، اور اس سارے عمل کے لیے جس مدت کی ضرورت ہے وہ 10^{243} (ایک کے آگے 243 صفر) بلین سال ہے۔ مگر ''ہمیں بھولنا نہیں چاہیے'' ڈونوائے لکھتا ہے'' کہ زمین صرف دو بلین سال سے موجود ہے اور یہ کہ زندگی کی ابتدا صرف ایک بلین سال پہلے ہوئی جب کہ زمین ٹھنڈی ہوئی۔''

Human Destiny, p.30-36

سائنس نے اگر چہ ساری کائنات کی عمر دریافت کرنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ موجودہ کائنات پچاس کھرب سال سے موجود ہے، ظاہر ہے کہ یہ طویل عمر بھی ایک مطلوبہ پروٹینی سالمہ کو اتفاقاً وجود میں لانے کے لیے ناکافی ہے، مگر جہاں تک زمین کا تعلق ہے جس پر ہماری معلوم زندگی پیدا ہوئی اس کی عمر تو نہایت قطعیت کے ساتھ معلوم کرلی گئی ہے۔

ماہرین فلکیات کے اندازے کے مطابق زمین سورج کا ایک ٹکڑا ہے، جو کسی بڑے ستارے کے کشش سے ٹوٹ کر فضا میں گردش کرنے لگا تھا، اس وقت زمین سورج کی مانند ایک مجسم شعلہ تھی، جس میں کسی بھی قسم کی زندگی پیدا ہونے کا کوئی سوال نہیں تھا۔اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہو کر منجمد ہوئی، اس انجماد ہی کے بعد یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ اس میں زندگی کا آغاز ہو۔

زمین کی عمر جب سے کہ وہ ٹھوس ہوئی مختلف طریقوں سے نہایت صحیح طور پر معلوم کی جاسکتی ہے، ان میں سب سے عمدہ طریقہ تابکار عناصر (Radio-Active Elements) کے ذریعہ معلوم ہوا ہے، تابکار عناصر کے ایٹم کے برقی ذرات ایک خاص تناسب سے مسلسل خارج ہوتے رہتے ہیں، اور اسی لیے وہ ہم کو روشن نظر آتے ہیں، اس اخراج یا انتشار کی وجہ سے ان کے برقی ذرات کی تعداد گھٹتی رہتی ہے، اور وہ دھیرے دھیرے غیر تابکار دھات میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں، یورنیم اسی قسم کا ایک تابکار عنصر ہے، وہ عمل انتشار کی وجہ سے ایک خاص اور متعین شرح سے سیسہ (Lead) میں تبدیل ہوتا رہتا ہے، یہ پایا گیا ہے کہ اس تبدیلی کی شرح کسی بھی سخت ترین حرارت یا دباؤ سے متاثر نہیں ہوتی، ہم تبدیلی کی اس رفتار کو اٹل سمجھنے میں حق بجانب ہیں، یورنیم کے ٹکڑے مختلف چٹانوں میں پائے جاتے ہیں، اور بلاشبہ وہ اس وقت سے چٹان کا جزء ہیں، جب کہ یہ چٹان منجمد ہوئی یورنیم کے ساتھ ہم سیسہ (Lead) پاتے ہیں، ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ تمام سیسہ جو یورنیم کے ساتھ پایا جاتا ہے، وہ یورنیم کے انتشار (disintegration of Uranium) سے وجود میں آیا ہے۔ کیوں کہ یورنیم سے بنا ہوا سیسہ، عام سیسے سے کچھ ہلکا ہوتا ہے، اس لیے سیسہ کے کسی بھی ٹکڑے کے بارے میں یہ کہنا ممکن ہے کہ وہ یورنیم سے بنا ہے یا نہیں، اس سے ہم حساب لگا سکتے ہیں کہ یورنیم جس چٹان میں

ہے وہاں کتنی مدت سے اس پر انتشار کا عمل ہورہا ہے، اور چوں کہ یورینیم چٹان میں اس وقت سے ہے، جب کہ وہ چٹان منجمد ہوئی، اس لیے ہم اس کے ذریعے سے خود چٹان کے انجماد کی مدت معلوم کرسکتے ہیں۔

اس طرح اندازے بتاتے ہیں کہ چٹان کے انجماد کو کم ازکم چودہ سو ملین سال گزر چکے ہیں۔ یہ اندازے ان چٹانوں کے مطالعہ پر مبنی ہیں، جو موجودہ علم کے مطابق، زمین کی قدیم ترین چٹانیں ہیں۔ چنانچہ جے، ڈبلیو، این، سولیون نے زمین کی عمر کا ایک بہتر اوسط دو ہزار ملین سال قرار دیا ہے۔

Limiations of Science, p. 78

اب ظاہر ہے کہ جب صرف ایک غیرذی روح پروٹینی سالمہ کے مرکب کو اتفاقاً وجود میں لانے کے لیے سنکھ (100 quadrillion) مہاسنکھ (10 quintillion) سے بھی زیادہ مدت درکار ہے تو صرف دو ہزار ملین سال میں زمین کی سطح پر زندہ اور مکمل اجسام رکھنے والے حیوانات کی دس لاکھ سے زیادہ اور نباتات کی دو لاکھ سے زیادہ اقسام کیسے وجود میں آگئیں اور ہر قسم میں لاتعداد حیوانات ونباتات پیدا ہوکر خشکی اور تری میں کیسے پھیل گئے، اور پھر انھیں ادنیٰ درجہ کی ذی روح اشیا سے اتنی قلیل مدت میں انسان جیسی اعلیٰ مخلوق اتفاقاً کیسے وجود میں آگئی جب کہ نظریۂ ارتقا انواع میں جن اتفاقی تبدیلیوں کے اوپر اپنی بنیاد کھڑی کرتا ہے، ان میں سے ہر تبدیلی کا حال یہ ہے کہ ماہر ریاضی پاچو (Patau) نے حساب لگایا ہے کہ کسی ذی حیات میں نئی تبدیلی کو مکمل ہوتے ہوتے دس لاکھ پشتوں کے گزر جانے کا امکان ہے۔

The Evidence of God, p. 117

اس سے اندازہ کیجیے کہ اگر محض ارتقا کے اندھے مادی عمل کے ذریعہ کتے کی طرح پانچ انگلیاں رکھنے والے جدامجد کی نسل میں بے شمار تبدیلیوں کے جمع ہونے سے گھوڑے جیسا مختلف جانور بن گیا ہے، تو اس کے بننے میں کتنا عرصہ درکار ہوگا۔ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ امریکی عالم عضویات ایم۔ بی کریڈر (Martin Broks Kreider) کے الفاظ کس قدر صحیح ہیں:

“The mathematical probability of a chance occurrrnce of all

the necessary factors in the right proportion is almost nil.”

The Evidence of God, p. 67

یعنی تخلیق کے تمام ضروری اسباب کا صحیح تناسب کے ساتھ اتفاقاً اکٹھا ہوجانے کا امکان ریاضیاتی طور پر قریب قریب نفی کے برابر ہے۔

یہ طویل تجزیہ محض اتفاقی پیدائش کے نظریے کے لغویت واضح کرنے کے لیے کیا گیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ’’اتفاق‘‘ سے نہ کوئی ایٹم یا مالے کیول وجود میں آسکتا ہے، اور نہ وہ ذہن پیدا ہوسکتا ہے، جو یہ سوچ رہا ہے کہ کائنات کیسے وجود میں آئی، خواہ اس کے لیے کتنی ہی طویل مدت فرض کی جائے، یہ نظریہ نہ صرف ریاضیاتی طور پر محال ہے، بلکہ منطقی حیثیت سے بھی وہ اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا، یہ ایسی ہی لغوبات ہے، جیسے کوئی کہے کہ ایک گلاس پانی فرش پر گرنے سے دنیا کا نقشہ مرتب ہوسکتا ہے، ایسے شخص سے بجا طور پر پوچھا جاسکتا ہے کہ اس اتفاق کے پیش آنے کے لیے فرق، زمینی کشش، پانی اور گلاس کہاں سے وجود میں آ گئے۔

علم حیاتیات کا مشہور عالم ہیکل (Haeckel) نے کہا تھا۔ ’’مجھے ہوا، پانی، کیمیائی اجزاء اور وقت دو، میں ایک انسان بنا دوں گا۔‘‘ مگر یہ کہتے ہوئے وہ بھول گیا کہ اس اتفاق کو وجود میں لانے کے لیے ایک ہیکل اور مادی حالات کی موجودگی کو ضروری قرار دے کر وہ خود اپنے دعوی کی تردید کررہا ہے، بہت خوب کہا ہے ماریسن نے:

> ’’ہیکل نے یہ کہتے ہوئے جین اور خود زندگی کے مسئلہ کو نظرانداز کردیا، انسان کو وجود میں لانے کے لیے اس کو سب سے پہلے ناقابل مشاہدہ ایٹم فراہم کرنے ہوں گے، پھر ان کو مخصوص ڈھنگ سے ترتیب دے کر جین بنانا ہوگا، اور اس کو زندگی دینی ہوگی، پھر بھی اس کی اس اتفاقی تخلیق کا امکان کروروں میں ایک کا ہے، اور بالفرض اگر وہ کامیاب بھی ہوجائے تو اس کو وہ اتفاق (accident) نہیں کہہ سکتا بلکہ وہ اس کو اپنی ذہانت (intelligence) کا ایک نتیجہ قرار دے گا۔‘‘

Man does not Stand Alone, p. 87

اس بحث کو میں ایک امریکی عالم طبیعیات جارج ارل ڈیوس (Earl Davis) کے الفاظ پر ختم کروں گا:

''اگر کائنات خود اپنے آپ کو پیدا کرسکتی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے اندر خالق کے اوصاف رکھتی ہے، ایسی صورت میں ہم یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ کائنات خود خدا ہے، اس طرح اگرچہ ہم خدا کے وجود کو تو تسلیم کرلیں گے،لیکن وہ نرالا خدا ہوگا جو بیک وقت مافوق الفطرت بھی ہوگا اور مادّی بھی، میں اس طرح کے کسی مہمل تصور کو اپنانے کے بجائے ایک ایسے خدا پر عقیدے کو ترجیح دیتا ہوں جس نے عالم مادی کی تخلیق کی ہے، اور اس عالم کا وہ خود کوئی جزء نہیں، بلکہ اس کا فرمانروا اور ناظم و مدبر ہے۔''

The Evidence of God, p.71

دلیلِ آخرت

مذہب جن حقیقتوں کو ماننے کی ہمیں دعوت دیتا ہے، ان میں سے ایک اہم ترین حقیقت —— آخرت کا تصور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے بعد ایک اور دنیا ہے، جہاں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے، موجودہ دنیا انسان کی امتحان گاہ ہے، یہاں ایک خاص عرصہ کے لیے انسان کو رکھا گیا ہے، اس کے بعد ایک وقت ایسا آنے والا ہے، جب اس کا مالک اسے توڑ کر دوسری دنیا دوسرے ڈھنگ پر بنائے گا، وہاں تمام انسان دوبارہ زندہ کیے جائیں گے، ہر ایک نے موجودہ دنیا میں جو اچھے یا برے عمل کیے ہیں، وہ سب وہاں خدا کی عدالت میں پیش ہوں گے، اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق انعام یا سزا دی جائے گی۔

یہ نظریہ صحیح ہے یا غلط، اس کو جانچنے کے لیے ہم اس پر چند پہلوؤں سے غور کریں گے۔

امکان

پہلی بات یہ ہے کہ کائنات کے موجودہ نظام میں کیا اس طرح کی کسی آخرت کا واقع ہونا ممکن نظر آتا ہے کیا یہاں کچھ ایسے واقعات اور اشارات پائے ہیں، جو اس دعوے کی تصدیق کر رہے ہوں۔

یہ نظریہ سب سے پہلے یہ چاہتا ہے کہ انسان اور کائنات اپنی موجودہ شکل میں ابدی نہ ہوں، اور یہ دونوں چیزیں ہماری اب تک کی معلومات کے مطابق بالکل یقینی ہیں، ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں انسان کے لیے بھی موت ہے اور کائنات کے لیے بھی موت، دونوں میں سے کوئی بھی موت کے خطرے سے خالی نہیں۔

جو لوگ دوسری دنیا کو نہیں مانتے وہ قدرتی طور پر یہ چاہتے ہیں کہ اسی دنیا کو اپنی ابدی خوشیوں کی دنیا بنائیں، انھوں نے اس بات کی بہت تحقیق کی کہ موت کیوں آتی ہے تاکہ اس کے اسباب کو روک کر زندگی کو جاوداں بنایا جاسکے۔ مگر انھیں اس سلسلے میں قطعی ناکامی ہوئی —— ہر مطالعہ نے بالآخر یہی بتایا کہ موت یقینی ہے، اس سے چھٹکارا نہیں۔

''موت کیوں آتی ہے''—اس کے تقریباً دوسو جوابات دیے گئے ہیں، جسم نا کارہ ہوجاتا ہے، اجزائے ترکیبی صرف ہو چکتے ہیں، رگیں پتھرا جاتی ہیں، متحرک البومن کی جگہ کم متحرک البومن آجاتے ہیں، مربوط کرنے والے نسیج بیکار ہوجاتے ہیں، جسم میں آنتوں کے بیکٹیریا کا زہر دوڑ جاتا ہے— وغیرہ وغیرہ۔

جسم کے نا کارہ ہونے کی بات بظاہر درست معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ مشینیں، جوتے کپڑے، سبھی ایک خاص مدت کے بعد نا کارہ ہوجاتے ہیں، اس لیے ہوسکتا ہے کہ پوستین کی طرح ہمارا جسم بھی، جلد یا بدیر پرانا ہوکر ختم ہوجاتا ہو۔ مگر سائنس اس کی تائید نہیں کرتی، سائنسی تشریح کے مطابق انسانی جسم نہ پوستین کی طرح ہوتا ہے، نہ مشین سے ملتا جلتا ہے، اور نہ چٹان سے مشابہ ہے۔ اگر اسے تشبیہ دی جاسکتی ہے، تو دریا سے جو ہزار سال پہلے بھی بہا کرتا تھا، اور آج بھی اسی طرح بہہ رہا ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ دریا پرانا ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر کیمسٹری کے نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر لنس پالنگ نے کہا ہے کہ نظریاتی طور پر انسان بڑی حد تک لافانی ہے، اس کے جسم کے خلیے ایسی مشین ہیں، جو خود بخود اپنی خرابی دور کر لیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود انسان بوڑھا ہوتا ہے اور مرجاتا ہے—اس کے اسباب ابھی تک راز بنے ہوئے ہیں۔

ہماری زندگی کی مسلسل تجدید ہوتی رہتی ہے، ہمارے خلیوں میں البومن کے سالمے بنتے اور تلف ہوتے اور پھر بنتے رہتے ہیں، خلیے (سوائے اعصابی خلیوں کے) برابر تلف ہوتے اور ان کی جگہ نئے بنتے رہتے ہیں، اندازہ لگایا گیا ہے کہ کوئی چار مہینے کے عرصے میں انسان کا خون بالکل ہی نیا ہوجاتا ہے، اور چند سال کے عرصے میں انسانی جسم کے تمام ایٹم پوری طرح بدل جاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی نوعیت ایک ڈھانچے کی نہیں بلکہ دریا کی سی ہے، یعنی وہ ایک عمل ہے، ایسی حالت میں جسم کے پرانے اور نا کارہ ہونے کے تمام نظریے بے بنیاد ہوجاتے ہیں، وہ تمام چیزیں جو زندگی کے ابتدائی برسوں میں خراب ہوگئی تھیں، زہر آلود اور بیکار ہو چکی تھیں، وہ جسم سے کب کی خارج ہو چکیں، پھر ان کو موت کا سبب قرار دینا کیا معنی—اس کا مطلب یہ ہوا کہ موت کا سبب

آنتوں اور رگوں اور دل میں نہیں، بلکہ اس کا سبب کہیں اور ہے۔

ایک توجیہ یہ ہے کہ اعصابی خلیے موت کا سبب ہیں، کیوں کہ اعصابی خلیے زندگی بھر وہی رہتے ہیں، یہ کبھی نہیں بدلتے، چنانچہ انسان کے اندر اعصابی خلیے سال بہ سال کم ہوتے جاتے ہیں، اور مجموعی طور پر اعصابی نظام کمزور ہوتا جاتا ہے، اگر یہ توجیہ صحیح ہے، اور اعصابی نظام ہی نظامِ جسمانی کا کمزور حصہ ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ نظامِ جسمانی سب سے زیادہ دنوں تک زندہ رہنا چاہیے جن میں اعصابی نظام ہوتا ہی نہیں۔

مگر مشاہدہ اس کی تائید نہیں کرتا، درخت میں اعصابی نظام نہیں ہوتا اور وہ سب سے زیادہ دنوں تک زندہ رہتا ہے، مگر گیہوں میں بھی اعصاب نہیں تھے مگر وہ صرف سال بھر زندہ رہتا ہے، اور اسی طرح ایبا کیڑے میں بھی اعصاب نہیں ہوتے لیکن وہ صرف آدھ گھنٹہ زندہ رہتا ہے، اسی طرح اس توجیہ کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ نسل کے حیوانات کی عمر، جن کا اعصابی نظام مکمل ترین ہوتا ہے، سب سے زیادہ ہونی چاہیے، مگر ایسا نہیں ہے، مگر مچھ، کچھوا اور پائک مچھلی سب سے لمبی عمر پاتے ہیں۔

موت کو غیر یقینی بنانے کے لیے اس کے اسباب کی جتنی چھان بین کی گئی ہے، وہ سب ناکامی پر ختم ہوئی ہے، اور یہ امکان اب بھی بدستور باقی کہ سارے انسانوں کو ایک مقرر مدت پر مرنا ہے۔ ایسا کوئی امکان اب تک ثابت نہ ہوسکا کہ موت نہیں آئے گی۔ ڈاکٹر الکسس کیرل نے اسی مسئلہ پر زمان داخلی (inward time) کے عنوان سے لمبی بحث کی ہے، اور اس سلسلے کی کوششوں کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> انسان بقا کی تلاش اور جستجو سے کبھی نہیں اکتائے گا، مگر اس کو کبھی یہ چیز حاصل نہیں ہوسکتی، کیوں کہ وہ جسمانی ساخت کے چند قوانین کا پابند ہے، وہ عضویاتی زمان (physiological time) کو روکنے اور غالباً ایک حد تک اس کو پیچھے ہٹانے میں کامیاب ہوسکتا ہے (جوانی کی مدت کو بڑھانے اور بڑھاپے کو موخر کرنے میں)، لیکن وہ موت پر فتح نہیں پاسکتا۔
>
> *Man the Unknown*, p. 175

نظام کائنات کی موجودہ شکل کا درہم برہم ہونا بھی ایک ایسی چیز ہے، جو بالکل واقعاتی طور پر سمجھ میں آتی ہے، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کائنات میں ہم جن چھوٹی چھوٹی قیامتوں سے واقف ہیں، وہی آئندہ کسی وقت زیادہ بڑے پیمانے پر ظاہر ہونے والی ہیں، یہ صرف موجودہ مقامی قیامتوں کے عالمی پیمانے پر واقع ہونے کی پیشین گوئی ہے۔

سب سے پہلا تجربہ جو ہم کو قیامت کے امکان سے باخبر کرتا ہے، وہ زلزلہ ہے، زمین کا اندرونی حصّہ نہایت گرم سیال کی شکل میں ہے، جس کا مشاہدہ آتش فشاں پہاڑوں سے نکلنے والے لاوا کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہ مادہ مختلف شکلوں میں زمین کی سطح کو متاثر کرتا ہے، جس کی وجہ سے بعض اوقات زمین کے اوپر زبردست گڑگڑاہٹ کی آواز محسوس ہوتی ہے، اور کشمکش کی وجہ سے جھٹکے پیدا ہوتے ہیں—اسی کا نام زلزلہ ہے۔ یہ زلزلہ آج بھی انسان کے لیے سب سے زیادہ خوفناک لفظ ہے۔ یہ انسان کے اوپر قدرت کا ایسا حملہ ہے جس میں فیصلے کا اختیار تمام تر دوسرے فریق کو ہوتا ہے۔ زلزلہ کے مقابلے میں انسان بالکل بے بس ہے۔ یہ زلزلے ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ہم ایک سرخ پگھلے ہوئے نہایت گرم مادے کے اوپر آباد ہیں، جس سے صرف 50 کیلومیٹر کی ایک پتلی سی چٹانی تہہ ہم کو الگ کرتی ہے، جو زمین کے مقابلے میں ویسی ہی ہے جیسے سیب کے اوپر باریک چھلکا۔ ایک جغرافیہ داں کے الفاظ میں ہمارے آباد شہروں اور نیلے سمندروں کے نیچے ایک قدرتی جہنّم (physical hell) دہک رہا ہے، یا یوں کہنا چاہیے کہ ہم ایک عظیم ڈائنامیٹ کے اوپر کھڑے ہیں جو کسی بھی وقت پھٹ کر سارے نظامِ ارضی کو درہم برہم کر سکتا ہے۔

George Gamow, *Biography of the Earth*, p.82

یہ زلزلے دنیا کے تقریباً ہر حصے میں اور ہر روز آتے ہیں، لیکن جغرافیائی اعتبار سے وہ زیادہ تعداد میں وہاں محسوس ہوتے ہیں، جہاں آتش فشاں پہاڑ ہیں۔ سب سے قدیم تباہ کن زلزلہ جس سے تاریخ واقف ہے، وہ چین کے صوبہ شنسی (Shensi) کا زلزلہ ہے، جو 1556ء میں آیا تھا، اس زلزلے میں آٹھ لاکھ سے زیادہ اشخاص ہلاک ہو گئے۔ اسی طرح یکم نومبر 1755ء کو پرتگال میں زلزلہ آیا جس نے

لزبن (Lisbon) کا پورا شہر تباہ کر دیا۔ اس زلزلے میں چھ منٹ کے اندر تیس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے، تمام عمارتیں مسمار ہو گئیں، اندازہ کیا گیا ہے کہ اس زلزلے میں یورپ کے رقبہ کا چوگنا حصّہ ہل گیا تھا، اسی نوعیت کا ایک شدید زلزلہ 1897ء میں آسام میں آیا تھا، جو دنیا کے پانچ انتہائی بڑے زلزلوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس سے شمالی آسام میں ہولناک تباہی آئی تھی، اس زلزلے نے دریائے برہم پتر کا رخ بدل دیا اور ایورسٹ کی چوٹی ابھر کر سو فٹ اوپر چلی گئی۔

زلزلہ دراصل چھوٹے پیمانے کی قیامت ہے، جب دہشت انگیز گڑگڑاہٹ کے ساتھ زمین پھٹ جاتی ہے، جب پختہ مکانات تاش کے پتوں کی طرح بکھرنے لگتے ہیں، جب زمین کا اوپری حصّہ دھنس جاتا ہے، اور اندرونی حصّہ اوپر آجاتا ہے، جب آباد ترین شہر چند لمحوں میں وحشت ناک کھنڈر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جب انسان کی لاشیں اس طرح ڈھیر ہو جاتی ہیں، جیسے مری ہوئی مچھلیاں زمین کے اوپر پڑی ہوں — یہ زلزلے کا وقت ہوتا ہے، اس وقت انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ قدرت کے مقابلے میں کس قدر بے بس ہے، یہ زلزلے بالکل اچانک آتے ہیں، درحقیقت زلزلے کا المیہ اس امر میں پوشیدہ ہے کہ کوئی بھی شخص یہ پیشین گوئی نہیں کر سکتا کہ زلزلہ کب اور کہاں آئے گا۔ یہ زلزلے گویا اچانک آنے والی قیامت کی پیشگی اطلاع دیتے ہیں۔ یہ ہمیں بتاتے ہیں کہ زمین کا نظام اس ڈھنگ پر بنایا گیا ہے کہ کسی بھی وقت اس کو توڑ دیا جائے۔

یہی حال بیرونی کائنات کا ہے، کائنات نام ہے، ایک ایسے لامحدود خلا کا جس میں بے انتہا بڑے بڑے آگ کے الاؤ (ستارے) بے شمار تعداد میں اندھادھند گردش کر رہے ہیں، جیسے بے شمار لٹّو کسی فرش پر ہماری تمام سواریوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ مسلسل ناچ رہے ہوں۔

یہ گردش کسی بھی وقت زبردست ٹکراؤ کی صورت اختیار کر سکتی ہے، اس وقت کائنات کی حالت بہت بڑے پیمانے پر ایسی ہی ہوگی جیسے کروڑوں بمبار ہوائی جہاز بموں سے لدے ہوئے فضا میں اڑ رہے ہوں اور یکایک سب کے سب باہم ٹکرا جائیں، اجرام سماوی کا اس قسم کا ٹکراؤ کسی بھی درجہ میں حیرت انگیز نہیں ہے بلکہ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ وہ آخر ٹکرا کیوں نہیں جاتے، علم افلاک کا مطالعہ

بھی اس امکان کی تصدیق کرتا ہے۔ چنانچہ شمسی نظام کے وجود میں آنے کی ایک توجیہ اسی قسم کے ٹکراؤ پر کی گئی ہے، اس ٹکراؤ کو اگر ہم بڑے پیمانے پر قیاس کرسکیں تو ہم نہایت آسانی سے زیرِ بحث امکان کو سمجھ سکتے ہیں، کیوں کہ دراصل اسی واقعہ کا دوسرا نام ''قیامت'' ہے، نظریۂ آخرت کا یہ دعویٰ کہ کائنات کا موجودہ نظام ایک روز درہم برہم ہوجائے گا، اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جو واقعہ کائنات کے اندر ابتدائی شکل میں موجود ہے، وہی ایک روز انتہائی شکل میں پیش آنے والا ہے — قیامت کا آنا ہمارے لیے ایک معلوم حقیقت ہے — فرق صرف یہ ہے کہ آج ہم اسے امکان کی حدتک جانتے ہیں — اور کل اسے واقعہ کی صورت میں دیکھیں گے۔

آخرت کے امکان کے سلسلے میں دوسرا مسئلہ زندگی بعد موت کا مسئلہ ہے، ''کیا مرنے کے بعد بھی کوئی زندگی ہے'' موجودہ ذہن اپنے آپ سے سوال کرتا ہے، اور پھر خود ہی اس کا جواب دیتا ہے — ''نہیں مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں، کیوں کہ ہم جس زندگی سے واقف ہیں وہ مادی عناصر کی ایک خاص ترتیب کے اندر پائی جاتی ہے، موت کے بعد یہ ترتیب باقی نہیں رہتی، اس لیے موت کے بعد کوئی زندگی بھی نہیں ہوسکتی،،

ٹی، آر، مائلز (T. R. Miles) موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو محض ایک تمثیلی حقیقت قرار دیتا ہے، اور اس کو ایک لفظی حقیقت (literal truth) کے طور پر ماننے سے انکار کرتا ہے۔ ''میرے نزدیک'' وہ کہتا ہے ''یہ ایک مضبوط مقدمہ ہے کہ مرنے کے بعد آدمی زندہ رہتا ہے، یہ بالکل لفظی طور پر ایک حقیقت ہوسکتی ہے، اور اس قابل ہے تجربے سے اس کا غلط یا صحیح ہونا معلوم کیا جاسکے، مشکل صرف یہ ہے جب تک ہم کو موت نہ آئے، اس کا قطعی جواب معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، مگر یہ قیاس کرنا ممکن ہے۔'' اب چوں کہ قیاس اس کے خلاف ہے، اس لیے اس کے نزدیک یہ لفظی حقیقت نہیں، وہ قیاس یہ ہے:

''علم الاعصاب (Neurology) کے مطابق خارجی دنیا اور اس سے تعلقات کا علم صرف اس وقت ممکن ہے، جب کہ انسانی دماغ معمول کے مطابق کام کر رہا ہو اور موت کے

بعد جب کہ دماغ کی تنظیم منتشر ہو جاتی ہے، اس قسم کا ادراک (awareness) ناممکن ہے۔‘‘

Religion and the Scientific Outlook, p. 206

مگر اس سے زیادہ قوی قیاسات دوسرے موجود ہیں، جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جسم کے ذرات مادی کا انتشار زندگی کو ختم نہیں کرتا، زندگی ایک الگ اور مستقل بالذات چیز ہے، جو ذرات کی تبدیلی کے باوجود باقی رہتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ انسان کا جسم بعض خاص قسم کے اجزا سے مل کر بنا ہے، جس کی مجموعی اکائی کو خلیہ (Cell) کہتے ہیں، یہ خلیے نہایت پیچیدہ ساخت کے چھوٹے چھوٹے ریزے ہیں، جن کی تعداد ایک متوسط قد کے انسان میں تقریباً 26 پدم (26 quadrillion) ہوتی ہے، یہ گویا بے شمار چھوٹی چھوٹی اینٹیں (۱) ہیں، جن کے ذریعہ ہمارے جسم کی عمارت تعمیر ہوئی ہے، فرق یہ ہے کہ عمارت کی اینٹیں پوری زندگی بھر وہی کی وہی رہتی ہیں، جو شروع میں اس کے اندر لگائی گئی تھیں، مگر جسم کی اینٹیں ہر وقت بدلتی رہتی ہیں، جس طرح ہر چلنے والی مشین کے اندر گھساؤ (Depreciation) کا عمل ہوتا ہے، اسی طرح ہماری جسمانی مشین بھی گھستی ہے، اور اس کی ''اینٹیں'' مسلسل ٹوٹ ٹوٹ کر کم ہوتی رہتی ہیں، یہ کمی غذا سے پوری ہوتی ہے، غذا ہضم ہو کر ہمارے جسم کے لیے وہ تمام اینٹیں مہیّا کرتی ہے، جو ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے ہر روز ہمارے جسم کو درکار ہوتی ہیں گویا جسم نام ہے خلیوں کے ایک ایسے مرکب کا جو ہر آن اپنے آپ کو بدلتا رہتا ہو، اس کی مثال بہتے ہوئے دریا کے ایک گھاٹ کی ہے جو ہر وقت پانی سے بھرا رہتا ہے مگر ہر وقت وہی پانی نہیں ہوتا جو پہلے تھا بلکہ ہر آن وہ اپنے پانی کو بدل دیتا ہے، گھاٹ وہی ہوتا ہے، مگر پانی وہی نہیں رہتا۔

اس طرح ہر آن ہمارے جسم میں ایک تبدیلی ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کہ ایک وقت آتا ہے،

---

(۱) خلیہ کو ''اینٹ'' یہاں محض ظاہری مشابہت کی بنا پر کہا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خلیہ ایک نہایت پیچیدہ حیاتیاتی مرکب ہے جو خود ایک مکمل جسم رکھتا ہے، اور اس کے مطالعہ کے لیے ایک علیٰحدہ سائنس وجود میں آچکی ہے، جس کا نام Cytology ہے۔

جب جسم کی پچھلی تمام اینٹیں ٹوٹ کر نکل جاتی ہیں، اوران کی جگہ مکمل طور پر نئی اینٹیں لے لیتی ہیں، بچے کے جسم میں یہ عمل جلد جلد شروع ہوتا ہے، اور عمر کے بڑھنے سے اس کی رفتار سست ہوتی رہتی ہے، اگر پوری عمر کا اوسط لگایا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر دس سال میں جسم کے اندر یہ تبدیلی واقع ہوتی ہے، ظاہری جسم کے خاتمے کا یہ عمل برابر ہوتا رہتا ہے، مگر اندر کا انسان اسی طرح اپنی اصل حالت میں موجود رہتا ہے، اس کا علم، اس کا حافظہ، اس کی تمنائیں، اس کی عادتیں اس کے تمام خیالات بدستور باقی رہتے ہیں، وہ اپنی عمر کے ہر مرحلے میں اپنے آپ کو وہی سابق ''انسان'' محسوس کرتا ہے، جو پہلے تھا، حالانکہ اس کی آنکھ، کان، ناک، ہاتھ، پاؤں غرض ناخن سے بال تک ہر ہر چیز بدل چکی ہوتی ہے۔

اب اگر جسم کے خاتمہ کے ساتھ اس جسم کا انسان بھی مرجاتا ہو تو خلیوں کی تبدیلی سے اسے بھی متاثر ہونا چاہیے، مگر ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوتا، یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ انسان یا انسانی زندگی جسم سے الگ کوئی چیز ہے جو جسم کی تبدیلی اور موت کے باوجود اپنا وجود باقی رکھتی ہے، وہ ایک گھاٹ ہے جس کی گہرائی میں اجسام یا دوسرے الفاظ میں خلیوں کی ایک مسلسل آمد و رفت جاری ہے، چنانچہ ایک سائنس داں نے حیات یا انسانی ہستی کو ایک ایسی مستقل بالذات چیز قرار دیا ہے، جو مسلسل تغیرات کے اندر متغیر حالت میں اپنا وجود باقی رکھتی ہے —— اس کے الفاظ میں:

personality is changelessness in change.

اگر موت محض جسم کے خاتمے کا نام ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسے ہر عمل کی تکمیل کے بعد گویا انسان ایک بار مر گیا، اب اگر ہم اس کو دیکھتے ہیں تو یہ دراصل اس کی دوسری زندگی ہے، جو اس نے مر کر حاصل کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پچاس سال کی عمر کا ایک زندہ شخص جو ہمیں چلتا پھرتا نظر آتا ہے، وہ اپنی اس مختصر سی زندگی میں کم از کم پانچ بار مکمل طور پر مر چکا ہے۔ پانچ بار کی جسمانی موت سے اگر ایک انسان نہیں مرا تو چھٹی بار کی موت کے بارے میں آخر کیوں یقین کر لیا گیا ہے کہ اس کے بعد وہ لازماً مر جائے گا۔

بعض لوگ اس دلیل کو تسلیم نہیں کریں گے، وہ کہیں گے کہ وہ ذہن یا اندرونی وجود جس کو تم

انسان کہتے ہو، وہ دراصل کوئی علیٰحدہ چیز نہیں ہے بلکہ خارجی دنیا کے ساتھ جسم کے تعلق سے پیدا ہوا ہے، تمام جذبات وخیالات مادی عمل کے دوران میں اسی طرح پیدا ہوتے ہیں، جس طرح دھات کے دوٹکڑوں کی رگڑ سے حرارت پیدا ہوتی ہے، جدید فلسفہ روح کے مستقل وجود کا انتہائی مخالف ہے۔ جیمز کہتا ہے کہ شعور ایک ہستی (entity) کے طور پر موجود نہیں ہے بلکہ ایک عمل (function) کے طور پر موجود ہے، وہ ایک کارروائی (process) ہے، ہمارے زمانے کے فلسفیوں کی بہت بڑی تعداد نے اصرار کیا ہے کہ شعور اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ خارج سے پیدا ہونے والے ایک ہیجان کا عصبی جواب (nervous response) ہے، اس تصور کے مطابق موت یعنی جسمانی نظام کے منتشر ہونے کے بعد انسان کی موجودگی کا کوئی سوال نہیں، کیوں کہ وہ مرکز اعصاب ہی اس کے بعد باقی نہیں رہا، جو خارجی دنیا کے تعامل سے زندگی کا جواب ظاہر کرے نتیجہ یہ نکلا کہ زندگی بعد موت کا تصور بالکل غیر عقلی تصور ہے — اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

میں کہوں گا کہ انسان کی حقیقت اگر یہی ہے تو یقیناً ہمارے لیے ممکن ہونا چاہیے کہ ہم ایک زندہ اور باشعور انساان کو پیدا کرسکیں، آج ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسان کا جسم کن عناصر سے مل کر بنتا ہے، تمام عناصر بہت کثیر مقدار میں زمین کے اندر اور اس کی فضا میں قابل حصول حالت میں موجود ہیں، ہم نے جسم کے اندرونی نظام کو انتہائی باریک بینی کے ساتھ معلوم کرلیا ہے، آج ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسانی جسم کا ڈھانچہ اور اس کے رگ وریشے کس طرح بنائے گئے ہیں، پھر ہمارے پاس ایسے بے شمار ماہر آرٹسٹ موجود ہیں، جو کمال درجہ مطابقت کے ساتھ انسان کی مانند ایک جسم بنا کر کھڑا کردیں، مخالفین روح کو اگر اپنے نظریے پر یقین ہے تو وہ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ بہت سے انسانی جسم تیار کرکے زمین کے مختلف حصوں میں کھڑا کردیں، اور اس وقت کا انتظار کریں جب خارجی دنیا کے اثرات پڑنے سے یہ ڈھانچے چلنے اور بولنے لگیں گے۔

یہ زندگی کے باقی رہنے کے امکان کی بحث تھی، اب اس مقصد کے اعتبار سے غور کیجیے جس کے لیے مذہب دوسری زندگی کے اوپر عقیدہ رکھتا ہے۔ مذہبی تصور کے مطابق، زندگی کا وجود جرمن فلسفی

نشٹے (Friedrich Nietzsche) کے فلسفیانہ ’’آمدورفت‘‘ کا نام نہیں ہے، جو ریت گھڑی (sand glass clock) کی طرح بس خالی اور پُر ہوتی رہے۔ اس سے آگے اس کا اور کوئی مقصد نہ ہو — بلکہ دوسری زندگی کا ایک عظیم مقصد ہے، اور وہ یہ کہ موجودہ دنیا کی اچھائیوں اور برائیوں کا بدلہ دیا جائے۔

عقیدۂ آخرت کا یہ جزء بھی اس وقت بالکل ممکن نظر آنے لگتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں حیرت انگیز طور پر ہر شخص کا نامہ اعمال رات دن ایک لمحہ کے وقفہ کے بغیر ضبط (record) کیا جا رہا ہے آدمی تین شکلوں میں اپنی ہستی کو ظاہر کرتا ہے — نیت، قول اور عمل، یہ تینوں چیزیں مکمل طور پر محفوظ کی جا رہی ہیں، ہمارا ہر خیال، ہماری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اور ہماری تمام کارروائیاں کائنات کے پردہ پر اس طرح نقش ہو رہی ہیں کہ کسی بھی وقت ان کو نہایت صحت کے ساتھ دہرایا جا سکے، اور یہ معلوم ہو سکے کہ دنیا کی زندگی میں کس نے کیا کیا، کس کی زندگی شر کی زندگی تھی، اور کس کی زندگی خیر کی زندگی۔

جو خیالات ہمارے دل میں گزرتے ہیں، ہم بہت جلد انھیں بھول جاتے ہیں، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے، مگر جب ہم مدتوں کی ایک بھولی ہوئی بات کو خواب میں دیکھتے ہیں یا ذہنی اختلال کے بعد آدمی ایسی باتیں بولنے لگتا ہے جو ہوش وحواس کی حالت میں اس کی زبان سے نہیں سنی گئی تھیں، تو یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ آدمی کا حافظہ اتنا ہی نہیں ہے، جتنا شعوری طور پر وہ محسوس کرتا ہے۔ حافظہ کے کچھ خانے ایسے بھی ہیں، جو بظاہر شعور کی گرفت میں نہیں ہوتے، مگر وہ موجود رہتے ہیں۔

مختلف تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ ہمارے خیالات مستقل طور پر اپنی پوری شکل میں محفوظ رہتے ہیں، حتیٰ کہ ہم چاہیں بھی تو انھیں ختم نہیں کر سکتے۔ یہ تحقیقات بتاتی ہیں کہ انسانی شخصیت صرف وہی نہیں ہے، جسے ہم شعور کہتے ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس، انسانی شخصیت کا ایک حصّہ ایسا بھی ہے، جو ہمارے شعور کی سطح کے نیچے موجود رہتا ہے۔ یہ حصّہ جسے سگمنڈ فرائڈ تحت الشعور (Sub-Conscious) یا لاشعور (Unconscious) کا نام دیتا ہے۔ یہ ہماری شخصیت کا بہت بڑا حصّہ ہے، نفس انسانی کی

مثال سمندر میں تیرتے ہوئے تودۂ برف (iceberg) کی سی ہے، جس کا صرف نواں حصّہ پانی کے اوپر دکھائی دیتا ہے، اور بقیہ آٹھ حصّے سطح سمندر کے نیچے رہتے ہیں، یہی تحت شعور ہے جو ہمارے تمام خیالات اور ہماری نیتوں کو محفوظ رکھتا ہے، فرائڈ اپنے اکتیسویں لیکچر میں لکھتا ہے:

''منطق کے قوانین (the laws of logic) بلکہ اضداد کے اصول (the law of contradiction) بھی لاشعور (ID) کے عمل پر حاوی نہیں ہوتے، مخالف خواہشات ایک دوسرے کو زائل کیے بغیر اس میں پہلو بہ پہلو ہمیشہ موجود رہتی ہیں — لاشعور میں کوئی ایسی چیز نہیں جو نفی سے مشابہت رکھتی ہو، اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ لاشعور کی دنیا میں فلسفیوں کا یہ دعویٰ ہوجاتا ہے کہ ہمارے دماغی افعال وقت اور فاصلہ کے درمیان واقع ہوتے ہیں، لاشعور کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو وقت کے تصور سے مطابقت رکھتی ہو، لاشعور میں وقت کے گزرنے کا کوئی نشان نہیں اور یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے، جس کے معنی سمجھنے کی طرف ابھی تک فلسفیوں نے پوری توجہ نہیں کی کہ وقت گزرنے سے ذہنی عمل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، پوشیدہ خیالات (conative impulses) جو کبھی لاشعور سے باہر نہیں آئے بلکہ وہ ذہنی تاثرات بھی جنھیں روک کر لاشعور میں دبا دیا گیا ہو، فی الواقع غیر فانی ہوتے ہیں اور دسیوں سال تک اس طرح محفوظ رہتے ہیں، گویا ابھی کل وجود میں آئے۔

New Introductory Lectures on Psycho-Analysis, London, 1969, p. 99

تحت الشعور کا یہ نظریہ اب نفسیات میں عام طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر بات جو آدمی سوچتا ہے، اور ہر اچھا یا برا خیال جو اس کے دل میں گزرتا ہے، وہ سب کا سب نفس انسانی میں اس طرح نقش ہوجاتا ہے کہ پھر کبھی نہیں مٹتا، وقت کا گزرنا یا حالات کا بدلنا اس کے اندر ذرہ برابر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا — یہ واقعہ انسانی ارادہ کے بغیر ہوتا ہے، خواہ انسان اسے چاہے یا نہ چاہے۔

فرائڈ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ نیات اور اعمال کا اس احتیاط اور حفاظت کے ساتھ تحت شعور میں

ضبط رہنا کارخانۂ قدرت کے اندر کون سے مقصد کو پورا کرتا ہے۔ اس لیے وہ فلسفیوں کو اس مسئلے پر سوچنے کی دعوت دیتا ہے، مگر اس واقعہ کو آخرت کے نظریے کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو فوراً اس کی معنویت سمجھ میں آجاتی ہے، یہ واقعہ صریح طور پر اس امکان کو ظاہر کرتا ہے کہ جب دوسری زندگی شروع ہوگی تو ہر شخص اپنے پورے نامۂ اعمال کے ساتھ وہاں موجود ہوگا، آدمی کا خود اپنا وجود گواہی دے رہا ہوگا کہ کن نیتوں اور کن خیالات کے ساتھ اس نے دنیا میں زندگی بسر کی تھی۔ قرآن میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (50:16)۔ یعنی اور ہم نے بنایا انسان کو اور ہم جانتے ہیں جو باتیں آتی رہتی ہیں اس کے جی میں، اور ہم اس کے رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

اب قول کے مسئلے کو لیجیے۔ نظریۂ آخرت یہ کہتا ہے کہ آدمی اپنے اقوال کے لیے جواب دہ ہے، آپ خواہ بھلی بات کہیں یا کسی کو گالی دیں، آدمی اپنی زبان کو سچائی کا پیغام پہنچانے کے لیے استعمال کرے یا وہ شیطان کا مبلغ بن جائے، ہر حال میں ایک کائناتی انتظام کے تحت اس کے منھ سے نکلے ہوئے الفاظ کا مکمل ریکارڈ تیار کیا جا رہا ہے۔ قرآن کے الفاظ ہیں: مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (50:18)۔ یعنی کوئی لفظ انسان نہیں بولتا مگر اس کے پاس ایک نگراں ہر وقت (لکھنے کے لیے) موجود ہے۔ اور یہ ریکارڈ آخرت کی عدالت میں حساب کے لیے پیش ہوگا۔

یہ بھی ایسی چیز ہے جس کا ممکن الوقوع ہونا ہمارے معلوم دنیا کے عین مطابق ہے، ہم جانتے ہیں کہ جب کوئی شخص بولنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت دیتا ہے تو اس حرکت سے ہوا میں لہریں پیدا ہوتی ہیں، جس طرح ساکن پانی میں پتھر پھینکنے سے لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر آپ ایک برقی گھنٹی کو شیشہ کے اندر مکمل طور پر بند کر دیں اور بجلی کے ذریعہ سے اسے بجائیں تو آنکھوں کو وہ گھنٹی بجتی ہوئی نظر آئے گی، مگر آواز سنائی نہیں دے گی۔ کیوں کہ شیشہ بند ہونے کی وجہ سے اس کی لہریں ہمارے کانوں تک نہیں پہنچ رہی ہیں، یہی لہریں ہیں، جو ''آواز'' کی صورت میں ہمارے کان کے پردے سے

ٹکراتی ہیں اور کان کے آلات انھیں اخذ کر کے دماغ تک پہنچا دیتے ہیں اور اس طرح ہم بولے ہوئے الفاظ کو سمجھنے لگتے ہیں، جس کو ''سننا'' کہا جاتا ہے۔

ان لہروں کے بارے میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ایک مرتبہ پیدا ہونے کے بعد مستقل طور پر فضا میں باقی رہتی ہیں، اور یہ ممکن ہے کہ کسی بھی وقت انھیں دہرایا جا سکے، اگرچہ سائنس ابھی اس قابل نہیں ہوئی کہ ان آوازوں یا صحیح تر الفاظ میں ان لہروں کی گرفت کر سکے جو قدیم ترین زمانے سے فضا میں حرکت کر رہی ہیں، اور نہ ابھی تک اس سلسلے میں کوئی خاص کوشش ہوئی ہے، تاہم نظری طور پر یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ ایسا آلہ بنایا جا سکتا ہے، جس سے زمانۂ قدیم کی آوازیں فضا سے لے کر اسی طرح سنی جا سکیں جس طرح ہم ریڈیو سیٹ کے ذریعہ ان لہروں کو فضا سے وصول کر کے سنتے ہیں، جو کسی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے بھیجی گئی ہوں۔

فی الحال اس سلسلے میں جو مشکل ہے، وہ ان کو گرفت کرنے کی نہیں ہے، بلکہ الگ کرنے کی ہے، ایسا آلہ بنانا آج بھی ممکن ہے، جو قدیم آوازوں کو گرفت کر سکے، مگر ابھی ہم کو ایسی کوئی تدبیر نہیں معلوم جس کے ذریعہ سے بے شمار ملی ہوئی آوازوں کو الگ کر کے سنا جا سکے، یہی دقت ریڈیو نشریات میں بھی ہے، مگر اس کو ایک مصنوعی طریقہ اختیار کر کے حل کر لیا گیا ہے، دنیا بھر میں سیکڑوں ریڈیو اسٹیشن ہیں، جو ہر وقت مختلف قسم کے پروگرام نشر کرتے رہتے ہیں، یہ تمام پروگرام ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکینڈ کی رفتار سے ہر وقت ہمارے گرد و پیش گزرتے رہتے ہیں، بظاہر یہ ہونا چاہیے کہ جب ہم ریڈیو کھولیں تو بیک وقت بہت سی ناقابل فہم آوازیں ہمارے کمرے میں گونجنے لگیں، مگر ایسا نہیں ہوتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام نشر گاہیں، اپنی اپنی ''آواز'' کو مختلف طولِ موج پر نشر کرتی ہیں، کوئی چھوٹی کوئی بڑی، اس طرح مختلف نشر گاہوں سے نکلی ہوئی آوازیں مختلف طول کی موجوں میں فضا کے اندر پھیلتی ہیں، اب جہاں کی آواز جس میٹر بینڈ پر نشر کی جاتی ہے، اس پر اپنے ریڈیو سٹ کی سوئی گھما کر ہم وہاں کی آواز سن لیتے ہیں۔

اسی طرح غیر مصنوعی آوازوں کو الگ کرنے کا کوئی طریقہ ابھی دریافت نہیں ہوا ہے، ورنہ آج

بھی ہم ہر زمانے کی تاریخ کو اس کی اپنی آواز میں سن سکتے تھے، تاہم اس سے یہ امکان قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ آئندہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے، اس تجربہ کی روشنی میں نظریۂ آخرت کا یہ جزء ہمارے لیے بعید از قیاس نہیں رہتا کہ انسان جو کچھ بولتا ہے، وہ سب ریکارڈ ہو رہا ہے، اور اس کے مطابق ایک روز ہر شخص کو جواب دہی کرنی ہوگی۔ ایران کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر مصدق 1953ء میں جب مقدمے کے دوران نظر بند تھے تو ان کے کمرے میں خفیہ طور پر ایسی ریکارڈنگ مشینیں لگادی گئی تھیں، جو ہر وقت متحرک رہتی تھیں، اور ان کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کا ریکارڈ کر لیتی تھیں تا کہ عدالت میں ان کو ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ ہمارا مطالعہ بتاتا ہے کہ اسی طرح ہر شخص کے ساتھ خدا کے فرشتے یا دوسرے لفظوں میں بہت غیر مرئی محافظین (recorders) لگے ہوئے ہیں، جو ہمارے منھ سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو نہایت درجہ صحت کے ساتھ کائنات کی پلیٹ پر نقش کر رہے ہیں۔ تا کہ بوقت ضرورت انھیں آفاقی عدالت میں پیش کیا جائے۔

اب عمل کے مسئلہ کو لیجیے۔ اس سلسلے میں بھی ہماری معلومات حیرت انگیز طور پر اس کا ممکن الوقوع ہونا ثابت کرتی ہیں، سائنس بتاتی ہے کہ ہمارے اعمال، خواہ وہ اندھیرے میں کیے گئے ہوں یا اجالے میں، تنہائی میں ان کا ارتکاب ہوا ہو یا مجمع کے اندر، سب کے سب فضا میں تصویری حالت میں موجود ہیں، اور کسی بھی وقت ان کو یکجا کر کے ہر شخص کا پورا کارنامۂ حیات معلوم کیا جا سکتا ہے۔

جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ ہر چیز خواہ وہ اندھیرے میں ہو یا اجالے میں، ٹھہری ہوئی ہو یا حرکت کر رہی ہو، جہاں یا جس حالت میں ہو، اپنے اندر سے مسلسل حرارت خارج کرتی رہتی ہے، یہ حرارت چیزوں کے ابعاد و اشکال کے اعتبار سے اس طرح نکلتی ہے کہ وہ بعینہ اس چیز کا عکس ہوتی ہے، جس سے وہ نکلی ہے، جس طرح آواز کی لہریں اس مخصوص تھرتھراہٹ کا عکس ہوتی ہیں، جو کسی زبان پر جاری ہوئی تھی، چنانچہ ایسے کیمرے ایجاد کیے گئے ہیں، جو کسی چیز سے نکلی ہوئی حرارتی لہروں (heat waves) کو اخذ کر کے اس کی اس مخصوص حالت کا فوٹو تیار کر دیتے ہیں جب کہ وہ لہریں اس سے خارج ہوئی تھیں، مثلاً میں اس وقت ایک مسجد میں بیٹھا ہوا لکھ رہا ہوں، اس کے بعد میں یہاں

سے چلا جاؤں گا، مگر یہاں اپنی موجودگی کے دوران میں نے جو حرارتی لہریں خارج کی ہیں، وہ بدستور موجود رہیں گی اور حرارت دیکھنے والی مشین کی مدد سے خالی شدہ مقام سے میرا مکمل فوٹو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اس وقت جو کیمرے بنے ہیں وہ چند گھنٹے بعد ہی تک کسی لہر کا فوٹو لے سکتے ہیں، اس کے بعد کی لہروں کا عکس اتارنے کی طاقت ان میں نہیں ہے۔

ان کیمروں میں انفرارڈ (infrared) شعاعوں سے کام لیا جاتا ہے، اس لیے وہ اندھیرے اور اجالے میں یکساں فوٹو لے سکتی ہیں، امریکا اور انگلینڈ میں اس دریافت سے کام لینا شروع ہو گیا ہے، چند سال پہلے کی بات ہے، ایک رات نیویارک کے اوپر ایک پُراسرار ہوائی جہاز چکر لگا رہا تھا، پھر وہ چلا گیا۔ اس کے فوراً بعد مذکورہ بالا کیمرے کے ذریعہ فضا سے اس کی حرارتی تصویر لی گئی، اس کے مطالعہ کے بعد معلوم ہو گیا کہ اڑنے والا جہاز کس ساخت کا تھا (ریڈرڈائجسٹ، نومبر 1960ء)۔ اس کیمرے کو مصورِ حرارت (evaporagraph) کہتے ہیں۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے ہندستان ٹائمز، نئی دہلی نے لکھا تھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ ہم ماضی کی تاریخ کو پردۂ فلم کے اوپر دیکھ سکیں گے اور ہوسکتا ہے کہ پچھلے ادوار کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات ہوں جو ہماری موجودہ تاریخی نظریات کو بالکل بدل ڈالیں۔

یہ ایک حیرت انگیز دریافت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح فلم اسٹوڈیو میں نہایت تیز رفتار کیمرے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تمام حرکات وسکنات کی تصویر لیتے رہتے ہیں، اسی طرح عالمی پیمانے پر ہر شخص کی زندگی فلمائی جارہی ہے، آپ خواہ کسی کو تھپڑ ماریں یا کسی غریب کا بوجھ اٹھا دیں، اچھے کام میں مصروف ہوں یا برے کام کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے ہوں، اندھیرے میں ہوں یا اجالے میں، جہاں اور جس حال میں ہوں، ہر وقت آپ کا تمام عمل کائنات کے پردہ پر نقش ہو رہا ہے، آپ اسے روک نہیں سکتے، اور جس طرح فلم اسٹوڈیو میں دہرائی ہوئی کہانی کو اس کے بہت بعد اور اس سے بہت دور رہ کر ایک شخص اسکرین پر اس طرح دیکھتا ہے گویا وہ عین موقع واردات پر موجود ہو، ٹھیک اسی طرح ہر شخص نے جو کچھ کیا ہے اور جن واقعات کے درمیان اس نے زندگی

گزاری ہے، اس کی پوری تصویر ایک روز اس کے سامنے اس طرح آسکتی ہے کہ اس کو دیکھ کر وہ پکار اٹھے:

مَالِهٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصَاهَا (18:49)۔ یعنی یہ کیسا دفتر ہے جس نے میرا چھوٹا بڑا کوئی کام بھی درج کیے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔

اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہوا کہ دنیا میں ہر انسان کا مکمل اعمال نامہ تیار کیا جارہا ہے، جو خیال بھی آدمی کے دل میں گزرتا ہے، وہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوجاتا ہے، اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ نہایت صحت کے ساتھ ریکارڈ ہورہا ہے، ہر آدمی کے اردگرد ایسے کیمرے لگے ہوئے ہیں جو اندھیرے اور اجالے کی تمیز کیے بغیر شب وروز اس کی فلم تیار کررہے ہیں، گویا انسان کا قلبی عمل ہو یا لسانی عمل یا عضوی عمل، ہر ایک نہایت باقاعدگی کے ساتھ درج کیا جارہا ہے، اس حیرت انگیز صورت حال کی توجیہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ خدا کی عدالت میں ہر انسان کا جو مقدمہ پیش ہونے والا ہے، یہ سب اس کی شہادت فراہم کرنے کے انتظامات ہیں، جو خود عدالت کی طرف سے کیے گئے ہیں، کوئی بھی شخص ان واقعات کی اس سے زیادہ معقول توجیہ پیش نہیں کرسکتا، اب یہ صریح واقعہ بھی آدمی کو آخرت میں ہونے والی باز پرس کا یقین نہیں دلاتا، تو مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون سا واقعہ ہوگا جو اس کی آنکھ کھولے گا۔

تقاضا

اوپر ہم نے آخرت کے تصور پر اس حیثیت سے بحث کی ہے کہ موجودہ کائنات میں کیا اس قسم کی کسی آخرت کا واقع ہونا ممکن ہے جس کا مذہب میں دعویٰ کیا گیا ہے، اس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ یہ آخرت قطعی طور پر ممکن الوقوع ہے، اب یہ دیکھیے کہ کیا ہماری دنیا کو اس قسم کی آخرت کی کوئی ضرورت بھی ہے، کیا کائنات اپنے موجودہ ڈھانچہ کے اعتبار سے تقاضا کرتی ہے کہ آخرت لازماً وقوع میں آئے؟

1۔ سب سے پہلے نفسیاتی پہلو کو لیجیے — کننگھم نے اپنی کتاب (Plato's Apology)

میں زندگی بعد موت کے عقیدے کو خوش کن لاادریت (cheerful agnosticism) کہا ہے۔ یہی موجودہ زمانے میں تمام بے خدا مفکرین کا نظریہ ہے، ان کا خیال ہے کہ دوسری زندگی کا عقیدہ انسان کی اس ذہنیت نے پیدا کیا ہے کہ وہ اپنے لیے ایک ایسی دنیا تلاش کرنا چاہتا ہے جہاں وہ موجودہ دنیا کی محدودیتوں اور مشکلات سے آزاد ہو کر خوشی اور فراغت کی ایک دل پسند زندگی حاصل کر سکے، یہ عقیدہ انسان کی محض ایک مفروضہ خوش فہمی ہے، جس کے ذریعہ وہ اس خیالی تسکین میں مبتلا رہنا چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ اپنی محبوب زندگی کو پالے گا، ورنہ جہاں تک حقیقت واقعہ کا تعلق ہے، ایسی کوئی دنیا واقعہ میں موجود نہیں ہے مگر انسان کی یہ طلب بذات خود آخرت کا ایک نفسیاتی ثبوت ہے، جس طرح پیاس کا لگنا پانی کی موجودگی اور پانی اور انسان کے درمیان ربط کا ایک داخلی ثبوت ہے، اسی طرح ایک بہتر دنیا کی طلب اس بات کا ثبوت ہے کہ ایسی ایک دنیا فی الواقع موجود ہے، اور ہم سے اس کا براہِ راست تعلق ہے تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم ترین زمانے سے عالمگیر پیمانے پر یہ طلب انسان کے اندر موجود رہی ہے، اب یہ ناقابلِ قیاس ہے کہ ایک بے حقیقت چیز اتنے بڑے پیمانے پر اور اس قدر ابدی شکل میں انسان کو متاثر کر دے، ایک ایسا واقعہ جو ہمارے لیے اس امکان کا قرینہ پیدا کرتا ہے کہ دوسری بہتر دنیا موجود ہونی چاہیے، خود اسی واقعہ کو فرضی قرار دینا صریح ہٹ دھرمی کے سوا اور کچھ نہیں۔

جو لوگ اتنے بڑے نفسیاتی تقاضے کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ غیر حقیقی ہے، مجھے نہیں معلوم کہ پھر اس زمین پر وہ کون سا واقعہ ہے جس کو وہ حقیقی سمجھتے ہیں، اور اگر سمجھتے ہیں تو اس کے لیے ان کے پاس کیا دلیل ہے۔ یہ خیالات اگر صرف ماحول کا نتیجہ ہیں تو وہ انسانی جذبات کے ساتھ اتنی مطابقت کیوں رکھتے ہیں کیا دوسری کسی ایسی چیز کی مثال دی جا سکتی ہے، جو ہزاروں سال کے دوران میں اس قدر تسلسل کے ساتھ انسانی جذبات کے ساتھ اپنی مطابقت باقی رکھ سکی ہو، کیا کوئی بڑے سے بڑا قابل شخص یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ ایک فرضی چیز گڑھے اور اس کو انسانی نفسیات میں اس طرح شامل کر دے، جس طرح یہ احساسات انسانی نفسیات میں سموئے ہوئے ہیں۔

انسان کی بہت سے تمنائیں ہیں، جو اس دنیا میں پوری نہیں ہوتیں۔ انسان ایک ایسی دنیا چاہتا ہے جہاں صرف زندگی ہو، مگر اسے ایک ایسی دنیا ملی ہے، جہاں زندگی کے ساتھ موت کا قانون بھی نافذ ہے، یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آدمی اپنے علم، تجربہ اور جدو جہد کے نتیجہ میں جب اپنی کامیاب ترین زندگی کے آغاز کے قابل ہوتا ہے، اسی وقت اس کے لیے موت کا پیغام آجاتا ہے، لندن کے کامیاب تاجروں کے متعلق اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ 65-45 سال کے عمر کے درمیان جب وہ اپنا کاروبار خوب جما لیتے ہیں، اور پانچ ہزار تا دس ہزار پونڈ (ایک لاکھ روپے سے زیادہ) سالانہ کما رہے ہوتے ہیں، اس وقت اچانک ایک روز ان کے دل کی حرکت بند ہو جاتی ہے، اور وہ اپنے پھیلے ہوئے کاروبار کو چھوڑ کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں، وِنوڈ ریڈی (Winwood Reade) لکھتا ہے:

''یہ ہمارے لیے ایک غور طلب مسئلہ ہے کہ کیا خدا سے ہمارا کوئی ذاتی رشتہ ہے، کیا اس دنیا کے علاوہ کوئی اور دنیا ہے، جہاں ہمارے عمل کے مطابق ہم کو بدلہ دیا جائے گا، یہ نہ صرف فلسفہ کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، بلکہ یہ خود ہمارے لیے سب سے بڑا عملی سوال ہے، ایک ایسا سوال جس سے ہمارا مفاد بہت زیادہ وابستہ ہے، موجودہ زندگی بہت مختصر ہے، اور اس کی خوشیاں بہت معمولی ہیں، جب ہم وہ کچھ حاصل کر لیتے، جو ہم چاہتے ہیں تو موت کا وقت قریب آچکا ہوتا ہے، اگر یہ واضح ہو سکے کہ ایک خاص طریقہ پر زندگی گزارنے سے دائمی خوشی حاصل ہو سکتی ہے تو بیوقوف یا پاگل کے علاوہ کوئی بھی شخص اس طرح زندگی گزارنے سے انکار نہیں کرے گا۔''

Martyrdom of Man, p. 414

مگر یہی مصنف فطرت کی اتنی بڑی پکار کو محض ایک معمولی سے اشکال کی بنا پر رد کر دیتا ہے:

''یہ نظریہ اس وقت تک بظاہر بڑا معقول نظر آتا تھا، جب تک گہرائی کے ساتھ ہم نے اس کی تحقیق نہیں کی تھی، مگر جب ایسا کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ محض ایک لغو (absurd) بات ہے، اور اس کی لغویت کو بآسانی ثابت کیا جا سکتا ہے — محروم العقل آدمی جو کہ اپنے

گناہوں کا ذمہ دار نہیں ہے، وہ تو جنت میں جائے گا، مگر گوئٹے اور روسو جیسے لوگ جہنم میں جلیں گے! اس لیے محروم العقل پیدا ہونا اس سے اچھا ہے کہ آدمی گوئٹے اور روسو کی شکل میں پیدا ہو، اور یہ بات بالکل لغو ہے۔'' (ایضاً صفحہ 415)

یہ ویسی ہی بات ہے جیسے لارڈ کلون (Lord Kelvin, 1824-1907) نے میکس ویل (James Clerk Maxwell, 1831-1879) کی تحقیق کو ماننے سے انکار کر دیا تھا، لارڈ کلون کا کہنا تھا کہ ''جب تک میں کسی چیز کا مشینی ماڈل (mechanical model) نہیں بنا لیتا، میں اسے سمجھ نہیں سکتا۔'' اس بنا پر اس نے روشنی کے متعلق میکسویل کے برقی مقناطیسی نظریے کو قبول نہیں کیا۔ کیوں کہ وہ اس کے مادی فریم میں نہیں آتی تھی۔ طبیعیات کی دنیا میں آج یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ جے، ڈبلیو، این سولیون (J.W.N. Sullivan) کے الفاظ میں — ''ایک شخص کیوں ایسا خیال کرے کہ فطرت کو ایک ایسی نوعیت کی چیز ہونا چاہیے جس کو انیسویں صدی کا ایک انجینئر اپنے کارخانہ میں ڈھال سکتا ہو''۔

The Limitation of Science, p. 9

یہی بات مَیں ونِ وڈ (Winwood Reade) کے مندرجہ بالا اعتراض کے بارے میں کہوں گا— ''بیسویں صدی کا ایک فلسفی آخر یہ سمجھنے کا کیا حق رکھتا ہے کہ خارجی دنیا کو اس کے اپنے مزعومات کے مطابق ہونا چاہیے۔''

مصنف کی سمجھ میں اتنی موٹی سی بات نہیں آئی کہ حقیقت واقعہ خارج کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ خود خارج حقیقت واقعہ کا محتاج ہوتا ہے:

Winwood Reade failed to understand the plain fact that reality is not dependent upon what is externally manifest. On the contrary, the external itself is dependent upon reality.

جب حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے، اور اس کے سامنے حساب کتاب کے لیے ہمیں حاضر ہونا ہے تو پھر ہر شخص کو خواہ وہ روسو (Jean-Jacques Rousseau, 1712-1778) ہو یا ایک معمولی شہری، خدا کا وفادار بن کر زندگی گزارنی چاہیے۔ ہماری کامیابی حقیقت سے موافقت

کرنے میں ہے، نہ کہ اس کے خلاف چلنے میں۔ وِن وُڈ (Winwood) روسو اور گوئٹے (Goethe, 1749-1832) سے یہ نہیں کہتا کہ وہ اپنے آپ کو حقیقت واقعہ کے مطابق بنائیں، بلکہ وہ حقیقت واقعہ سے چاہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بدل ڈالے، اور جب وہ اپنے اندر تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہوتی تو حقیقت واقعہ کو لغو (absurd) قرار دیتا ہے۔ حالانکہ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص جنگی راز کے تحفظ کے قانون کو اس بنا پر لغو قرار دے کہ اس کی رو سے بعض اوقات ایک معمولی سپاہی کا کام قابل تعریف قرار پاتا ہے، اور روزن برگ جیسے ممتاز سائنس داں اور اس کی نوجوان اور تعلیم یافتہ بیوی (Rosenberg Pair) کو بجلی کی کرسی پر بٹھا کر پھانسی دے دی جاتی ہے۔

ساری معلوم دنیا کے اندر صرف انسان ایک ایسا وجود ہے، جو اپنے اختیار وارادے کے تحت کل (Tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے اور اپنے آئندہ حالات کو شعوری طور پر بہتر بنانا چاہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے جانور بھی ''کل'' کے لیے عمل کرتے ہیں۔ مثلاً چیونٹیاں گرمی کے موسم میں جاڑے کے لیے خوراک جمع کرتی ہیں یا بیا (Baya Weaver) اپنے آئندہ پیدا ہونے والے بچوں کے لیے گھونسلا بناتا ہے۔ مگر جانوروں کا اس قسم کا عمل محض جبلّت (instinct) کے تحت غیر شعوری طور پر ہوتا ہے، وہ ''کل'' کی ضرورتوں کو سوچ کر بالقصد ایسا نہیں کرتے، بلکہ وہ بلا ارادہ طبعی طور پر انجام دیتے ہیں، اور بطور نتیجہ وہ اِن کے مستقبل میں انھیں کام آتا ہے۔ ''کل'' کو ذہن میں رکھ کر اس کی خاطر سوچنے کے لیے تصوری فکر (conceptual thought) کی صلاحیت درکار ہے، اور یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے کسی دوسرے جاندار کو تصوری فکر کی خصوصیت حاصل نہیں۔

انسان اور دوسری مخلوقات کا یہ فرق ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو دوسری تمام چیزوں سے زیادہ مواقع ملنے چاہئیں، جانوروں کی زندگی صرف آج کی زندگی ہے، وہ زندگی کا کوئی ''کل'' نہیں رکھتے مگر انسان کا مطالعہ صاف طور پر بتاتا ہے کہ اس کے لیے ایک ''کل'' ہونا چاہیے، ایسا نہ ہونا نظام

فطرت کے خلاف ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ موجودہ زندگی میں ہماری ناکامیاں، عام طور پر، ہم کو اس سے بہتر ایک زندگی کی توقع کی طرف لے جاتی ہیں، ایک خوش حال فضا میں ایسا عقیدہ باقی نہیں رہ سکتا، روم کے غلام، مثال کے طور پر بہت بڑی تعداد میں عیسائی ہو گئے۔ کیوں کہ عیسائیت ان کو مرنے کے بعد خوشی حاصل ہونے کی امید دلاتی تھی۔ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ سائنس کی ترقی سے انسان کی خوشی اور خوشحالی بڑھے گی، اور بالآخر دوسری زندگی کا تصور ختم ہو جائے گا۔

مگر سائنس اور ٹیکنالوجی کی چار سو سالہ تاریخ اس کی تصدیق نہیں کرتی، ٹیکنالوجی کی ترقی نے سب سے پہلے دنیا کو جو چیز دی وہ یہ تھا کہ سرمایہ رکھنے والے محدود گروہ کو ایسے وسائل و ذرائع ہاتھ آ گئے جس کے بل پر وہ چھوٹے کاریگروں اور پیشہ وروں کو ختم کر کے دولت کا تمام بہاؤ اپنی طرف کر لیں اور عام باشندوں کو محض اپنا محتاج مزدور بنا کر رکھ دیں، اس انجام کے ہولناک مناظر مارکس کی کتاب ''کیپٹل'' میں تفصیل کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں، جو گویا اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اس مزدور طبقہ کی چیخ ہے، جس کو مشینی نظام نے اپنے ابتدائی دور میں جنم دیا تھا، اس کے بعد ردعمل شروع ہوا اور مزدور تحریکوں کی ایک صدی کی کوشش سے اب حالات بہت بدل چکے ہیں مگر یہ تبدیلی صرف ظاہر کی تبدیلی ہے، بیشک آج کا مزدور پہلے کے مزدور کے مقابلے میں زیادہ اجرت پاتا ہے، لیکن جہاں تک حقیقی خوشی کی دولت کا تعلق ہے، اس معاملے میں وہ اپنے پیش رووں سے بھی زیادہ محروم ہے — سائنس اور ٹیکنالوجی نے جو نظام بنایا ہے، وہ کچھ مادی ظواہر انسان کو شاید دے، مگر خوشی اور اطمینان قلب کی دولت پھر بھی اسے نہیں دیتا، تہذیب جدید کے انسان کے بارے میں ولیم بلیک (William Blake, 1757-1827) کے الفاظ نہایت صحیح ہیں:

And mark in every face I meet
Marks of weakness, marks of woe.(۱)

(۱) www.poetryfoundation.org/poems/43673/london-56d222777e969 (accessed on 10.04.21)

برٹرینڈ رسل نے اعتراف کیا ہے کہ ''ہماری دنیا کے جانور خوش ہیں، انسانوں کو بھی خوش ہونا چاہیے، مگر جدید دنیا میں انھیں یہ نعمت حاصل نہیں۔''

Conquest of Happiness, p. 11

بلکہ رسل کے الفاظ میں اب تو صورت حال یہ ہے کہ لوگ کہنے لگے ہیں کہ اس کا حصول ممکن ہی نہیں:

Happiness in the modern world has become an impossibility p. 93

نیویارک جانے والا سیاح ایک طرف تو اسٹیٹ بلڈنگ جیسی عمارتوں کو دیکھتا ہے جس کی 102 منزلیں ہیں، اور جو اتنی اونچی ہے کہ اس کا اوپر کا ٹمپریچر نیچے کے مقابلے میں کافی سرد ہو جاتا ہے، اس کو دیکھ کر اتریں تو یہ مشکل ہی سے یقین آئے گا کہ آپ اس پر گئے تھے، 1250 فٹ بلند عمارت پر چڑھنے میں لفٹ کے ذریعہ صرف تین منٹ لگتے ہیں، ان عالی شان عمارتوں اور بازاروں کو دیکھ کر وہ کلب میں جاتا ہے، وہاں وہ دیکھتا ہے کہ عورت مرد مل کر ناچ رہے ہیں۔ ''کتنے خوش نصیب ہیں یہ لوگ'' وہ سوچتا ہے، مگر زیادہ دیر گزرنے نہیں پاتی کہ اس جھنڈ میں سے ایک نوجوان عورت آ کر اس کے پاس کی نشست پر بیٹھ جاتی ہے، وہ بہت افسردہ ہے۔

''سیاح! کیا میں بہت بدصورت ہوں'' عورت کہتی ہے۔

''میرا خیال تو ایسا نہیں ہے۔''

''مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھ میں رعنائی (Glamour) نہیں ہے۔''

''میرے خیال میں تو تم میں گلےمر ہے۔''

''شکریہ۔ لیکن اب نہ مجھے نوجوان ٹیپ (Tap) کرتے ہیں، اور نہ ڈیٹ (Date) مانگتے ہیں، مجھے زندگی ویران نظر آنے لگی ہے۔''

یہ جدید دور کے انسان کی ایک ہلکی سی جھلک ہے، حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے صرف مکانوں کو ترقی دی ہے، اس نے مکینوں کے دل کا سکون چھین لیا ہے، اس نے شاندار مشینیں کھڑی کی ہیں، مگر ان مشینوں میں کام کرنے والے انسانوں کو چین سے محروم کر دیا ہے، یہ

سائنس اور ٹیکنالوجی کی 4 سو سالہ تاریخ کا آخری انجام ہے، پھر کس بنیاد پر یقین کرلیا جائے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی وہ سکون اور مسرت کی دنیا بنانے میں کامیاب ہوگی جس کی انسان کو تلاش ہے۔

2۔اب اخلاقی تقاضے کو لیجیے،اس حیثیت سے جب ہم دیکھتے ہیں تو دنیا کے حالات شدید طور پر اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ اس کی ایک آخرت ہو،اس کے بغیر ساری تاریخ بالکل بے معنی ہوتی ہے۔

یہ ہمارا ایک فطری احساس ہے کہ ہم خیر اور شر ظلم اور انصاف میں تمیز کرتے ہیں،انسان کے سوا کسی بھی مخلوق کے اندر یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی،مگر انسان ہی کی دنیا وہ دنیا ہے، جہاں اس احساس کو سب سے زیادہ پامال کیا جارہا ہے، انسان اپنے ابنائے نوع پر ظلم کرتا ہے،وہ اپنی نوع کو استحصال کرتا ہے،اس کو قتل کرتا ہے،اور طرح طرح سے اس کو تکلیف پہنچاتا ہے۔حالانکہ جانوروں تک کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی نوع کے ساتھ سفاکی نہیں کرتے ،بھیڑیے اور شیر اپنی نوع کے لیے بھیڑیے اور شیر نہیں ہیں،مگر انسان خود انسان کے لیے بھیڑیا بنا ہوا ہے، بیشک انسانی تاریخ میں حق شناسی کی چنگاریاں بھی ملتی ہیں،اور وہ بہت قابل قدر ہیں،مگر اس کا بڑا حصّہ حق تلفی کی روداد سے بھرا ہوا ہے۔مورخ کو بڑی مایوسی ہوتی ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ انسان کا ضمیر جو کچھ چاہتا ہے،انسانی دنیا کے واقعی حالات اس کے خلاف ہیں۔یہاں میں چند اقوال نقل کروں گا:

والٹیر:''انسانی تاریخ محض جرائم اور مصائب کی ایک تصویر ہے۔''

History is nothing more than a picture of crimes and misfortunes. (*The Story of Philosophy* by Will Durant, NY, 1926, p. 241)

ہر برٹ اسپنسر:''تاریخ محض بے فائدہ گپ ہے۔''

History is simply useless gossip.

نپولین:''تاریخ تمام کی تمام لایعنی قصّے کا نام ہے۔''

History on the whole is another name for a meaningless story.

اڈورڈ گبن: ''انسانیت کی تاریخ جرائم، حماقت اور بدقسمتی کے رجسٹر سے کچھ ہی زیادہ ہے۔''

History, which is, indeed, little more than the register of the crimes, follies and misfortunes of mankind.

ہیگل: ''پبلک اور حکومت نے تاریخ کے مطالعہ سے جو واحد چیز سیکھی ہے، وہ صرف یہ کہ انھوں نے تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا۔''

The only thing public and government have learnt from a study of history is only that they have learnt nothing from history.

Western Civilisation by Edward McNall Burns, p. 871

کیا انسانیت کا یہ عظیم الشان ڈراما اسی لیے کھیلا گیا تھا کہ وہ اس طرح کی ایک ہولناک کہانی وجود میں لا کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے، ہماری فطرت جواب دیتی ہے کہ نہیں، انسان کے اندر عدل وانصاف کا احساس تقاضا کرتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا، اور نہ ایسا ہونا چاہیے، ایک دن ایسا آنا ضروری ہے، جب حق اور ناحق الگ ہو، ظالم کو اس کے ظلم کا اور مظلوم کو اس کی مظلومیت کا بدلہ ملے۔ یہ ایک ایسی طلب ہے، جس کو اسی طرح تاریخ سے الگ نہیں کیا جا سکتا جس طرح اسے انسان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

فطرت اور واقعہ کا یہ تضاد بتاتا ہے کہ اس خلا کو لازماً پر ہونا چاہیے — جو کچھ ہو رہا ہے، اور جو کچھ ہونا چاہیے، دونوں کا فرق ثابت کرتا ہے کہ ابھی زندگی کے ظہور کا کوئی اور اسٹیج باقی ہے، یہ خلا پکار رہا ہے کہ ایک وقت ایسا نہیں ہونا چاہیے جب دنیا کی تکمیل ہو، مجھے حیرت ہے کہ لوگ ہارڈی کی فلسفہ پر ایمان لا کر دنیا کو ظلم اور بے رحمی کی جگہ سمجھنے لگتے ہیں، مگر یہی ظالمانہ صورتِ حال انھیں اس یقین کی طرف نہیں لے جاتی کہ جو کچھ آج موجود نہیں ہے، مگر عقل جس کا تقاضا کرتی ہے، اسے کل وقوع میں آنا چاہیے۔

''قیامت نہ ہو تو ان ظالموں کا سر کون توڑے'' — یہ فقرہ اکثر ایک دردناک آہ کے ساتھ اس وقت میری زبان سے نکل جاتا ہے، جب میں اخبار پڑھتا ہوں، اخبار گویا دنیا کے روزانہ حالات کی ایک تصویر ہے، مگر اخبار ہمیں دنیا کے حالات کے بارے میں کیا بتاتے ہیں، وہ اغوا اور قتل کی خبریں

دیتے ہیں، چوری اورالزام تراشی کی داستانیں سناتے ہیں، سیاسی تجارت اورتاجرانہ سیاست کے جھوٹے پروپیگنڈے ہمارے دماغوں میں بھرتے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ فلاں حکمراں نے اپنے ماتحت کمزوروں کو دبالیا، فلاں قوم نے قومی مفاد کے لیے فلاں علاقے پر قبضہ کرلیا، غرض اخبار، درویش اور سلطان کی عیاریوں کی داستان کے سوااور کچھ نہیں، اور ماضی قریب میں ہندستان میں ہونے والے حادثات خاص طور پر جبل پور، کلکتہ، جمشید پوراور راوڑکیلا کی قتل وغارت گری کے بعد تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کسی بھی قابل قیاس یا ناقابل قیاس بدترین برائی کو ناممکن نہیں سمجھنا چاہیے، ایک قوم سیکولرازم، جمہوریت اوراہنسا کی علمبردار بن کر وحشیانہ فرقہ واریت سفاکانہ آمریت اور بدترین تشدد کاارتکاب کرسکتی، ایک لیڈر جس کو محسن انسانیت اور پیغمبر امن واماں کا خطاب دیا گیا ہوعین اس کے اقتدار میں انسانیت کے اوپر ایسے شرمناک مظالم کیے جاسکتے ہیں، جن سے چیتے اور بھیڑیے اور جنگلی سور بھی پناہ مانگیں، حتیٰ کہ نشرواشاعت کے اس دور میں یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا کے ایک بہت بڑے ملک میں بہت بڑے پیمانے پر کھلم کھلا ایک گروہ کو لوٹنے، جلانے اور قتل کرنے کے انتہائی بھیانک واقعات نہایت منظم طریقے پر ہوں اور مہینوں اور سالوں ہوتے رہیں، مگر اس کے باوجود دنیا کا پریس ان سے بے خبر ہوااور تاریخ کے صفحات سے وہ اس طرح محو ہوجائیں گویا کچھ ہوا ہی نہیں — کیا یہ دنیااسی لیے بنائی گئی تھی کہ مکاری، شیطانیت، درندگی اور ڈاکہ زنی کے ان ہولناک ڈراموں کا بس ایک اسٹیج بن کررہ جائے اوراس کے بعد نہ ظالم کے لیے کچھ ہو اور نہ مظلوم کے لیے کچھ — حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسی دنیا خود اپنے سارے وجود کے ساتھ اس بات کا اعلان ہے کہ وہ نامکمل ہے، اوراس کا نامکمل ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک وقت آنا چاہیے جب وہ مکمل کی جائے۔

اس بات کوایک اور پہلو سے دیکھیے۔ قدیم ترین زمانے سے انسان کے سامنے یہ مسئلہ رہا ہے کہ لوگوں کو حق وصداقت کی راہ پر کیسے قائم رکھا جائے۔ اگر اس مقصد کے لیے تمام افراد کے مقابلے میں کچھ لوگوں کو سیاسی اختیار دیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ ان کے ماتحت ان کی گرفت کے خوف سے زیادتیاں نہ کریں — مگر اس تدبیر سے خودان صاحب اختیار افراد کو عدل پر قائم رکھنے کا کوئی محرک موجود نہیں ہے۔ اگر اس مقصد کے لیے قانون بنایا جائے اور پولیس کا محکمہ قائم ہوتو ان مقامات

اور مواقع پر آدمی کو کون کنٹرول کرے جہاں پولیس اور قانون نہیں پہونچتے اور نہیں پہونچ سکتے، اگر اپیل اور پروپیگنڈے کی مہم چلائی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ محض کسی کی اپیل کی بنا پر کوئی شخص اپنے ملتے فائدے کو کیوں چھوڑ دے گا، دنیا کی سزا کا خوف بدعنوانیوں کو ہرگز روک نہیں سکتا، کیوں کہ ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ جھوٹ، رشوت، سفارش، اثرات کا ناجائز استعمال اور اسی قسم کے دوسرے بہت سے ذرائع موجود ہیں جو سزا کے ہر امکان کو یقینی طور پر ختم کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایسا محرک ہی بدعنوانیوں کو روکنے میں کارگر ہوسکتا ہے جو انسان کے اپنے اندر موجود ہو، جو انسان کے اپنے ارادے میں شامل ہو جائے خارجی محرک کبھی اس معاملے میں کامیاب نہیں ہوسکتا، اور یہ بات صرف آخرت کے تصور میں ممکن ہے، آخرت کے نظریے میں ایسا محرک موجود ہے جو بدعنوانیوں سے بچنے کے مسئلے کو ہر شخص کے لیے ذاتی مسئلہ بنا دیتا ہے۔ وہ ہر شخص کے لیے یکساں اہمیت رکھتا ہے، خواہ وہ ماتحت ہو یا افسر، اندھیرے میں ہو یا اجالے میں، ہر شخص یہ سوچنے لگتا ہے کہ اسے خدا کے یہاں جانا ہے، اور ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے، اور اس سے لازمًا باز پرس کرے گا، مذہبی عقیدے کی اسی اہمیت کی بنا پر سترھویں صدی کے آخر کے ایک نامور جج میتھو ہیلز (Mathew Hale, 1609-1676) نے کہا ہے — ''یہ کہنا کہ مذہب ایک فریب ہے۔ ان تمام ذمہ داریوں اور پابندیوں کو منسوخ کرنا ہے جن سے سماجی نظم کو برقرار رکھا جاتا ہے۔''

> To say that religion is a cheat is to dissolve all those obligations whereby civil societies are preserved.
>
> *Religion Without Revelation*, p. 115

نظریۂ آخرت کا یہ پہلو کتنا اہم ہے، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ بہت سے لوگ جو خدا پر یقین نہیں رکھتے، اور جو اس بات کو بطور ایک واقعہ نہیں مانتے کہ کوئی فیصلہ کا دن آنے والا ہے، وہ بھی تاریخ کے تجربے کی بنا پر ماننے پر مجبور ہوئے ہیں کہ اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے، جو انسان کو قابو میں رکھ سکتی ہو اور ہر حال میں اس کو عدل وانصاف کی روش پر قائم رہنے کے لیے مجبور کر سکے، مشہور

جرمن فلسفی کانٹ(Immanuel Kant, 1724-1804) نے خدا کے تصور کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ اس کی موجودگی کا کوئی تسلی بخش ثبوت ہم کو نہیں ملتا۔ اس کے نزدیک نظری معقولیت (theoretical reason) تو یقیناً مذہب کے حق میں نہیں ہے، مگر اخلاقی پہلو سے مذہب کی عملی معقولیت (practical reason) کو وہ تسلیم کرتا ہے۔

Story of Philosophy, NY, 1954, p. 279

فرنچ فلاسفر والٹیر (Voltaire, 1694-1778) کسی مابعد الطبیعی حقیقت کو نہیں مانتا، مگر اس کے نزدیک—

''خدا اور دوسری زندگی کے تصور کی اہمیت اس لحاظ سے بہت زیادہ ہے کہ وہ اخلاقیات کے لیے مفروضے (postulates of the moral feeling) کا کام دیتے ہیں، اس کے نزدیک صرف اسی کے ذریعہ سے بہتر اخلاق کی فضا پیدا کی جاسکتی ہے، اگر یہ عقیدہ ختم ہو جائے تو حسن عمل کے لیے کوئی محرک باقی نہیں رہتا، اور اس طرح سماجی نظم کا برقرار رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔''

History of Philosophy by Windelband, p.496

جو لوگ آخرت کو ایک فرضی تصور کہتے ہیں، ان کو سوچنا چاہیے کہ آخرت اگر فرضی ہے تو ہمارے لیے اس قدر ضروری کیوں ہے، کیوں ایسا ہے کہ اس کے بغیر ہم صحیح معنوں میں کوئی سماجی نظام بنا ہی نہیں سکتے، انسانی ذہن سے اس تصور کو نکالنے کے بعد کیوں ہماری ساری زندگی ابتر ہو جاتی ہے، کیا کوئی فرضی چیز زندگی کے لیے اس قدر ناگزیر ہو سکتی ہے، کیا اس کائنات میں ایسی کوئی مثال پائی جاتی ہے کہ ایک چیز حقیقت میں موجود نہ ہو مگر اس کے باوجود وہ اس قدر حقیقی بن جائے، زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو، مگر اس کے باوجود وہ زندگی سے اتنی متعلق نظر آئے، زندگی کی صحیح اور منصفانہ تنظیم کے لیے آخرت کے تصور کا اس قدر ضروری ہونا خود یہ ظاہر کرتا ہے کہ آخرت اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے، بلکہ اگر میں یہ کہوں تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ تصور آخرت کے حق میں استدلال کا یہ

ایک ایسا پہلو ہے، جو اس نظریے کو لیبارٹری ٹسٹ کے معیار پر صحیح ثابت کر رہا ہے۔

3۔اب ایک اور پہلو سے دیکھیے، جس کو ہم ''کائناتی تقاضا'' کہہ سکتے ہیں۔ پچھلے باب میں میں نے کائنات میں خدا کے وجود پر بحث کی ہے، اس سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ عین علمی اور عقلی مطالعہ ہی کا یہ تقاضا ہے کہ ہم اس کائنات کا ایک خدا مانیں، اب اگر اس دنیا کا کوئی خدا ہے تو یقیناً بندوں کے ساتھ اس کے تعلق کو ظاہر ہونا چاہیے، یہ کب ظاہر ہوگا، جہاں تک موجودہ دنیا کا معاملہ ہے، یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آج یہ تعلق ظاہر نہیں ہو رہا ہے، آج جو شخص خدا کا منکر ہے، اور کھلے عام یہ اعلان کرتا ہے کہ ''میں خدا سے نہیں ڈرتا'' اس کو لیڈری اور حکومت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس، جو خدا کے بندے خدا کا کام کرنے کے لیے اٹھتے ہیں، ان کی سرگرمیوں کو وقت کا اقتدار غیر قانونی قرار دے دیتا ہے، جو لوگ خدا کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''ہمارا راکٹ چاند تک گیا اور راستہ میں اس کو کہیں خدا نہیں ملا''۔ ان کے نظریات کو پھیلانے کے لیے بے شمار ادارے کام کر رہے ہیں، اور پورے پورے ملکوں کے ذرائع و وسائل ان کی خدمت کے لیے وقف ہیں، اور جو لوگ خدا اور مذہب کی بات پیش کر رہے ہیں، ان کو تمام ماہرین اور علمائے وقت رجعت پسند اور ماضی کے اندھیرے میں بھٹکنے والا کہہ کر رد کر دیتے ہیں، لوگ پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں، قومیں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں، انقلاب آتے ہیں، اور چلے جاتے ہیں، سورج نکلتا ہے، اور ڈوب جاتا ہے، مگر خدا کی خدائی کا کہیں ظہور نہیں ہوتا، ایسی حالت میں سوال یہ ہے کہ ہم خدا کو مانتے ہیں یا نہیں، اگر ہم خدا کو مانتے ہیں تو ہمیں آخرت کو بھی ماننا پڑے گا، کیوں کہ خدا اور بندوں کا تعلق ظاہر ہونے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں۔

ڈارون اس دنیا کا ایک خالق (Creator) تسلیم کرتا ہے، مگر اس نے زندگی کی جو تشریح کی ہے، اس کے اندر خالق اور مخلوق کے درمیان کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا اور نہ کائنات کے کسی ایسے انجام کی ضرورت معلوم ہوتی ہے، جہاں یہ تعلق ظاہر ہو، مجھے نہیں معلوم کہ ڈارون اپنے حیاتیاتی نقطۂ نظر کے اس خلا کو کیسے پُر کرے گا مگر میری عقل کو یہ بات نہایت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا تو ہو مگر دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو اور بندوں کے مقابلے میں اس کی جو مالکانہ حیثیت

ہے وہ کبھی سامنے نہ آئے ،اتنی بڑی کائنات پیدا ہو کرختم ہوجائے ،اور یہ ظاہر نہ ہو کہ اس کے وجود میں آنے کا مقصد کیا تھا،اور جس نے اسے بنایا تھا،وہ کس قسم کی صفات رکھنے والی ہستی تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر معقولیت کے ساتھ غور کیا جائے گا تو دل پکار اٹھے گا کہ بے شک قیامت آنے والی ہے، بلکہ وہ آپ کو بالکل آتی ہوئی نظر آئے گی۔آپ دیکھیں گے کہ حاملہ کے پیٹ میں جس طرح اس کا حمل باہر آنے کے لیے بیتاب ہو،اسی طرح وہ کائنات کے اندر بوجھل ہو رہی ہے، اور قریب ہے کہ کسی بھی صبح وشام وہ انسانوں کے اوپر پھٹ پڑے۔قرآن میں یہ حقیقت ان الفاظ میں بیان کیا گئی ہے:

يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ ثَقُلَتْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً (7:187) ۔یعنی یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ کہاں ہے قیامت ، کہو اس کا علم تو صرف خدا کو ہے، وہی اپنے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا،وہ زمین وآسمان میں بوجھل ہو رہی ہے وہ بالکل اچانک تم پر آپڑے گی۔

تجرباتی شہادت

اب ہم اس بحث کے آخری جزء پر آتے ہیں ''کیا کوئی تجرباتی شہادت اس بات کی موجود ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ہے''۔اس کا جواب یہ ہے کہ ہماری پہلی زندگی خود اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے، جو لوگ دوسری زندگی کے منکر ہیں۔وہ یقینی طور پر پہلی زندگی کا اقرار کر رہے ہیں، پھر جو زندگی ایک بار ممکن ہے، وہ دوسری بار کیوں ظہور میں نہیں آسکتی ۔ایک تجربہ جس سے آج ہم دوچار ہیں، وہی تجربہ اگر دوبارہ ہمارے ساتھ پیش آئے تو اس میں خلافِ عقل کون سی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات میں اس سے زیادہ خلاف عقل بات اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ ایک واقعہ کو آپ حال میں تسلیم کریں مگر مستقبل کے لیے اسی واقعہ کا انکار کر دیں۔

یہ موجودہ انسان کا عجیب تضاد ہے کہ کائنات کی توجیہ کے لیے خود اس نے جو''خدا گھڑے ہیں، ان کے بارے میں تو وہ پورے یقین کے ساتھ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ واقعات کو دوبارہ پیدا کر

سکتے ہیں، مگر مذہب جس خدا کا تصور پیش کرتا ہے، اس کے متعلق اسے یہ تسلیم نہیں ہے کہ وہ واقعات کو دوبارہ وجود میں لے آئے گا۔ جیمز جینز یہ بتاتے ہوئے کہ موجودہ زمین اوراس کے تمام مظاہر ایک ''حادثہ'' کے پیدا کردہ ہیں، اس نظریے کے حامیوں کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے — ''اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، اگر ہماری زمین محض کچھ حادثات کے نتیجے میں وجود میں آئی ہو، اگر کائنات اسی طرح لمبی مدت تک قائم رہے تو کسی بھی قابل قیاس حادثے کا وقوع میں آنا ممکن ہے۔''

There is no wonder if our earth originated out of certain accidents. If the universe survives for a long period, any thinkable accident is likely to occur. (*Modren Scientific Thought*, p.3)

نظریۂ ارتقا کا دعویٰ ہے کہ حیوانات کی مختلف نوعیں ایک ہی ابتدائی نوع سے ترقی کر کے وجود میں آئی ہیں، چنانچہ ڈارون کی تشریح کے مطابق موجودہ زرافہ ابتدائی دوسرے سم دار چوپایوں کی مانند تھا، مگر توالد وتناسل کے طویل عمل کے درمیان چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں (variations) کے جمع ہونے سے بالآخر وہ غیر معمولی طور پر ایک لمبا ڈھانچہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ اپنی کتاب کے ساتویں باب میں لکھتا ہے — ''میرے نزدیک یہ تقریباً یقینی ہے کہ (اگر لمبی مدت تک مطلوبہ عمل جاری رہے تو) ایک معمولی سم دار چوپائے کو زرافہ کی صورت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔''

It seems to me almost certain that (if the desired process goes on for a longer period) an ordinary hoofed quadruped might be converted into a giraffe. (*Origin of Species*, p.169)

اسی طرح جس نے بھی زندگی اور کائنات کی کوئی توجیہ کی ہے، بالکل فطری طور پر اس کو یہ بھی ماننا پڑا ہے کہ جن حالات کی موجودگی کو وہ زندگی اور کائنات کا سبب قرار دیتا ہے، وہی حالات اگر دوبارہ فراہم ہوسکیں تو یقیناً یہی واقعات دوبارہ وجود میں آسکتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ عقلی طور پر دوسری زندگی کا امکان اتنا ہی ہے جتنا پہلی زندگی کا، کائنات کا جو خالق بھی ہم تسلیم کریں، ہم کو ماننا پڑے گا کہ وہ خالق انھیں واقعات کو دوبارہ وجود میں لاسکتا ہے، جس کو اس نے ایک بار پیدا کیا ہے، اس

اعتراف سے ہم صرف اسی صورت میں بچ سکتے ہیں، جب کہ ہم پہلی زندگی کا انکار کردیں، پہلی زندگی کو مان لینے کے بعد ہمارے پاس دوسری زندگی کو نہ ماننے کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔

2۔ نفسیاتی تحقیق، جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، اس کے مطابق لاشعور یا دوسرے لفظوں میں انسان کے حافظہ کے خانے میں اس کے تمام خیالات ہمیشہ کے لیے محفوظ رہتے ہیں، یہ واقعہ صریح طور پر ثابت کرتا ہے کہ انسان کا ذہن اس کے جسم کا حصہ نہیں ہے، جسم کا یہ حال ہے کہ اس کے ذرات ہر چند سال بعد بالکل بدل جاتے ہیں، لیکن لاشعور کے دفتر میں سو برس بعد بھی کوئی تغیر، کوئی دھندلا پن، کوئی مغالطہ یا شبہ پیدا نہیں ہوتا، اگر یہ دفتر حافظہ جسم سے متعلق ہے تو وہ کہاں رہتا ہے، جسم کے کس حصّے میں ہے، اور جسم کے ذرات جب چند سال بعد غائب ہوجاتے ہیں تو وہ غائب کیوں نہیں ہوتا، یہ کون سا ریکارڈ ہے کہ ریکارڈ کی تختی ٹوٹ کر ختم ہوجاتی ہے، مگر وہ ختم نہیں ہوتا۔ جدید نفسیات کا یہ مطالعہ صریح طور پر ثابت کرتا ہے کہ انسانی وجود حقیقۃً اس جسم کا نام نہیں ہے، جس پر گھساؤ اور موت کا عمل طاری ہوتا ہے، بلکہ اس کے علاوہ اس کے اندر ایک اور چیز ہے، جس کے لیے فنا نہیں ہے، اور جو زوال میں مبتلا ہوئے بغیر اپنے وجود کو مستقل طور پر یکساں حال میں باقی رکھتا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فاصلہ اور وقت کے قوانین صرف ہماری موجودہ دنیا کے اندر رائج ہیں، اور اگر موت کے بعد کوئی اور دنیا ہے تو وہ ان قوانین کے دائرۂ عمل سے باہر ہے۔ موجودہ زندگی میں ہمارا ہر شعوری فعل وقت اور فاصلہ کے قوانین کے مطابق سرزد ہوتا ہے۔ لیکن فرائڈ کے نظریے کے مطابق، اگر ہماری کوئی ذہنی زندگی ایسی ہے جو ان قوانین کی پابندی سے آزاد ہے تو اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ ہماری یہ زندگی موت کے بعد بھی جاری رہے گی۔ ہم موت کے بعد بھی زندہ رہیں گے، ہماری موت خود فاصلہ اور وقت کے قوانین کے عمل کا نتیجہ ہے۔ چوں کہ ہماری اصل ہستی یا فرائڈ کے الفاظ میں ہمارا لاشعور ان قوانین کے عمل سے آزاد ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ موت اس پر وارد نہیں ہوتی، بلکہ صرف جسدِ عنصری پر وارد ہوتی ہے۔ لاشعور جو اصل انسان ہے، وہ اس کے بعد بھی باقی رہتا ہے — مثلاً ایک واقعہ جو 25 سال پہلے گزرا تھا — یا ایک خیال جو میرے ذہن میں 20 سال

پہلے آیا تھا، اوراب میں اسے بالکل بھول چکا تھا۔اس کوآج میں خواب میں دیکھتا ہوں،نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ میرے حافظہ (لاشعور) کے خانے میں بجنسہ موجود تھا۔اب سوال یہ ہے کہ یہ حافظہ کہاں ہے، اگر وہ خلیوں کے اوپر ثبت تھا، جیسے گراموفون کے ریکارڈ کے اوپر آواز ثبت رہتی ہے،تو وہ خلیے جو25 سال پہلے ان خیالات کا ریکارڈ بنے تھے، وہ بہت پہلے ٹوٹ کر اورمردہ ہو کرمیرے جسم سے نکل گئے،اب نہ ان خلیوں کا بحیثیت خلیہ کہیں وجود ہے،اور نہ میراان سے کوئی تعلق ہے، پھر یہ خیال میرے جسم کے کس مقام پر تھا۔ یہ ایک تجرباتی شہادت اس بات کی ہے کہ جسم کے ماوراایک اوردنیا ہے، جو بذات خوداپنا وجود رکھتی ہے، جوجسم کے ختم ہونے سے ختم نہیں ہوتی۔

3۔اسی طرح سائی کیکل تحقیق (Psychical Research) کے جونتائج سامنے آئے ہیں،وہ بھی خالص تجرباتی اورمشاہداتی سطح پرموت کے بعدزندگی کے وجود کوثابت کرتے ہیں۔ اس میں مزیددلچسپی کی بات یہ ہے کہ یہ نتائج صرف موت کے بعد کی زندگی کوثابت نہیں کرتے، بلکہ وہ یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ جس انسان کے اندر مرنے سے پہلے جوشخصیت تھی، وہی شخصیت مرنے کے بعد بھی باقی رہے گی:

What is most interesting is that such research does not merely establish survival; rather it establishes the survival of exactly the same personality—the entity that was known to us before death.

انسان کی بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جو بذاتِ خودتو پہلے سے موجود تھیں مگران پرسائنسی انداز سے غوروفکرنہیں ہوا تھا،مثلاً خواب دیکھنا انسان کی قدیم ترین خصوصیت ہے،مگرجدیددورمیں خواب کے مطالعہ سے جونفسیاتی حقائق معلوم کیے گئے ہیں، ان سے قدیم دور کے لوگ نا آشنا تھے،اسی طرح کچھ اورمظاہر ہیں،جن کے متعلق موجودہ زمانے میں باقاعدہ اعدادشمارجمع کیے گئےاورسائنسی انداز سے ان کا تجزیہ کیا گیا،اس طرح جدیدمطالعہ کے ذریعہ ان واقعات سے نہایت اہم نتائج برآمد ہوئے ہیں،اسی میں سے ایک سائی کیکل ریسرچ ہے،جوجدیدنفسیات کی ایک شاخ ہے،اورجس کا مقصدانسان کی مافوق العادت صلاحیتوں کا تجرباتی مطالعہ ہے۔اس قسم کی تحقیقات کے لیے سب

سے پہلا ادارہ 1882ء میں انگلینڈ میں قائم ہوا اور 1889ء میں اس نے سترہ ہزار اشخاص سے رابطہ قائم کر کے وسیع پیمانے پر اپنی تحقیقات شروع کر دیں، یہ اب بھی مطالعۂ نفسیات کا ادارہ (Society for Psychical Research) کے نام سے موجود ہے، اور اسی نوعیت کے دوسرے ادارے دوسرے ملکوں میں کام کر رہے ہیں، ان اداروں نے مختلف مظاہروں اور تجربات کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی شخصیت کسی پر اسرار شکل میں باقی رہتی ہے۔

ایک سفری ایجنٹ مسوری (امریکا) میں سینٹ جوزف ہوٹل کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا اپنے آڈر نوٹ کر رہا تھا کہ ''یکا یک'' وہ لکھتا ہے ''مجھے احساس ہوا کہ میرے دائیں جانب کوئی بیٹھا ہوا ہے، میں نے تیزی سے مڑ کر دیکھا تو صاف طور پر مجھے نظر آیا کہ وہ میری بہن ہے'' اس کی یہ بہن 9 سال پہلے مر چکی تھی، کچھ دیر بعد بہن کا یہ پیکر اس کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ مگر اس واقعہ سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ اپنا سفر جاری رکھنے کے بجائے وہ دوسری ٹرین سے اپنے وطن سینٹ لوئی (St. Louis) واپس ہو گیا، گھر آ کر اس نے واقعہ کی پوری تفصیل اپنے اعزہ کو بتائی، جب وہ کہتے کہتے اس جملہ پر پہنچا کہ ''میں نے بہن کے چہرے کے دائیں طرف سرخ رنگ کی ایک روشن خراش دیکھی'' تو اس کی ماں یکا یک کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ کھڑی ہو گئی اور اس نے بتایا کہ لڑکی کی موت کے بعد ایک اتفاقی سبب سے مجھ سے یہ خراش اس کے چہرے پر پڑ گئی تھی، اس بدنمائی کا مجھے سخت احساس ہوا، اور فوراً پاؤڈر لگا کر میں نے خراش کے تمام آثار اس کے چہرے سے مٹا دیے اور پھر کبھی کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا۔''(۱)

---

(۱) اس طرح کے واقعات محض یورپ اور امریکا کی خصوصیات نہیں ہیں، بلکہ دنیا کی ہر آبادی میں اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ چوں کہ موجودہ زمانے کی بیشتر تحقیقات یورپ اور امریکا ہی کے جغرافیہ میں ہوئی ہیں، اس لیے علمی شہادتوں کے سلسلے میں عموماً انھیں کا ذکر آتا ہے، اگر کچھ باحوصلہ لوگ ہمارے علاقے میں اس کام کو شروع کریں تو کثرت سے نہایت معتبر اور قوی شہادتیں فراہم ہو سکتی ہیں، مجھے ذاتی طور پر خود بھی بعض ایسے واقعات کا علم ہے جو اس سلسلے میں نہایت حیرت انگیز شہادت فراہم کرتے ہیں۔ ہمارے مذہبی لٹریچر میں بھی اس نوعیت کا کافی مواد موجود ہے۔ مثال کے طور پر کتاب الروح اور انفاس العارفین، وغیرہ۔

Human Personality and its Survival of Bodily Death, by F. W. H. Myers (N. Y. 1930, vol llP. 27-30

اس طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں ، جو مرنے کے بعد شخصیتوں کی موجودگی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، اس طرح کے واقعات کو وہم وخیال نہیں کہا جا سکتا، کیوں کہ چہرے کی خراش کا علم یا تو ماں کو تھا یا مردہ لڑکی کو، تیسرا کوئی بھی شخص اس کو قطعاً نہیں جانتا تھا۔

دوسرے قسم کے واقعات جو زندگی بعد موت کا تجرباتی ثبوت فراہم کرتے ہیں، وہ ایسے لوگ ہیں، جن کو خودکار (automatists) کہا جاتا ہے، یہ وہ مرد یا عورتیں ہیں، جن سے ایسے افعال ظاہر ہوتے ہیں، جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ کسی مرنے والے کی روح اس کے اندر رہتی ہے، ایسا شخص اپنے تجربہ کرنے والے کے سامنے چند ایسے واقعات پیش کرتا ہے، جن کو صرف ایک مرا ہوا آدمی جانتا ہے، اور جو چند دن بعد صحیح ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح مثلاً دیکھا جاتا ہے کہ وہ کسی شخص سے بات کر رہا ہے، اور اسی کے ہاتھ میں پنسل لیے ہوئے بالکل دوسرے موضوع پر لکھ رہا ہے، جس کے مضمون کی اسے خود بھی اس وقت تک اطلاع نہیں ہوتی جب تک کہ وہ لکھنے کے بعد اسے پڑھ نہ لے، گویا اس کے اندر اس کے سوا کوئی اور شخصیت ہے، جو اس کے ہاتھ سے لکھوا رہی ہے۔

A Philosophical Scrutiny of Religion, p.407-10

اس استدلال کو قبول کرنے میں بہت سے جدید ذہنوں کو تامل ہے، سی ڈی، براڈ (C. D. Broad) لکھتا ہے:

''سائی کیکل ریسرچ کے مشتبہ استثنا کے علاوہ سائنس کی مختلف شاخوں میں سے کوئی شاخ زندگی بعد موت کا ادنیٰ امکان بھی ثابت نہیں کرتی۔''

Religion Philosophy and Psychical Research, London 1953, p.235

اگر یہ استدلال ایسا ہی ہے، جیسے کہا جائے کہ ''سوچنا'' ایک مشتبہ فعل ہے۔ کیوں کہ انسان کے سوا کوئی ایسا وجود اس کائنات میں ہمارے تجربے میں نہیں آیا ہے، جو ''سوچنے'' کے مظہر کی تصدیق کرتا ہو۔ ظاہر ہے کہ زندگی کا باقی رہنا یا باقی نہ رہنا ایک نفسیاتی مسئلہ ہے، اس لیے نفسیات

ہی سے اس کا ثبوت یا عدم ثبوت ملے گا، کسی اور سائنس میں اس کی تصدیق ڈھونڈ نا ایسا ہی ہے، جیسے سوچنے کے فطری مظہر کو سمجھنے کے لیے نباتات اور فلزیات (metallography) سے تصدیق طلب کی جائے، یہی نہیں بلکہ خود انسان کے جسمانی حصّے کے مطالعہ کو بھی اس کی تصدیق یا تردید کے لیے بنیاد بنایا نہیں جاسکتا۔ کیوں کہ جس چیز کی بقا کا یہ دعویٰ کیا گیا ہے، وہ موجودہ مادی جسم نہیں، بلکہ وہ روح ہے، جو جسم سے ماسوا جسم کے اندر موجود رہتی ہے۔

چنانچہ دوسرے بہت سے سائنس داں جنھوں نے ان شواہد کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا ہے، وہ زندگی بعد موت کو بطور واقعہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں، راؤن یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر سی، جے، ڈوکاس (C. J. Ducasse) نے اپنی کتاب کے سترھویں باب میں زندگی بعد موت کے تصور کا فلسفیانہ اور نفسیاتی جائزہ لیا ہے، پروفیسر موصوف اگرچہ مذہب کے معنوں میں اخروی زندگی کے تصور پر عقیدہ نہیں رکھتے، مگر ان کا خیال ہے کہ ایسے شواہد موجود ہیں کہ مذہب کے عقیدے سے الگ کرکے زندگی کے بقا کو ہمیں ماننا پڑتا ہے، اس باب کے آخری حصے میں وہ سائی کیکل ریسرچ کی تحقیقات کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں:

"کچھ بہت ہی ذہین اور نہایت ذی علم افراد جنھوں نے سالہا سال تک نہایت تنقیدی نظر سے متعلقہ شہادتوں کا مطالعہ کیا ہے، وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کم از کم کچھ شواہد ایسے ضرور ہیں، جن میں صرف بقائے روح کا مفروضہ (survival of hypothesis) ہی معقول اور ممکن نظر آتا ہے۔ ان کی دوسری کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ اس فہرست کے انتہائی نمایاں افراد میں سے چند کے نام یہ ہیں:

الفرڈ رسل ویلس (Alfred Russel Wallace)

سر ولیم کروکس (Sir William Crookes)

ایف، ڈبلیو، ایچ، میرس (F.M.H. Myers)

کیسر لومبراسو (Cesare Lombroso)

کیمل فلیمیرین (Camille Flammarion)

سر اولیورلاج (Sir Oliver Lodge)

ڈاکٹر رچرڈ ہاگسن (Dr.Richard Hodgson)

مسز ہنری سڈوک (Mrs Henry Sidgwick)

پروفیسر ہسلوپ (Professor Hyslop)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد زندگی کا عقیدہ جس کو بہت سے لوگ مذہبی طور پر مانتے ہیں، نہ صرف یہ کہ صحیح ہوسکتا ہے بلکہ شاید وہ ایک ایسا عقیدہ ہے،جس کو تجرباتی دلیل (empirical proof) سے ثابت کیا جاسکتا ہے،اور اگر ایسا ہے تو قطع نظر اس من گڑھت کے جو زندگی بعد موت کی نوعیت کے متعلق اہل مذاہب نے فرض کرلی ہے، قطعی معلومات بالآخر اس کے بارے میں حاصل ہوسکیں گی،مگر ایسی صورت میں اس کی مذہبی نوعیت کو ماننا ضروری نہیں ہوگا۔''

A Philosophical Scrutiny of Religion, p. 412

یہاں تک پہنچنے کے بعد زندگی بعد موت کے متعلقین مذہبی عقیدے کو نہ ماننا ایسا ہی ہے، جیسے کسی دیہاتی آدمی کا اصرار ہو کہ ایسی کوئی صورت نہیں ہوسکتی کہ دو آدمی ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کریں،اس کے بعد اس کے ایک عزیز کو دور کے شہر سے ٹیلی فون کرکے رسیور اس کے کان پر لگادیا جائے،مگر جب وہ بات کر چکے تو کہے — ''کیا ضروری ہے کہ وہ میرے عزیز کی آواز ہو ممکن ہے، کوئی مشین بول رہی ہو۔''

اثباتِ رسالت

مذہب کا ایک اہم عقیدہ رسالت یا وحی والہام ہے، یعنی یہ کہ خدا انسانوں میں سے کسی انسان پر اپنا کلام اتارتا ہے، اور اس کے ذریعہ سے تمام انسانوں کو اپنی مرضی سے باخبر کرتا ہے، اب چوں کہ بظاہر ہمیں خدا اور صاحب وحی کے درمیان ایسا کوئی ''تار'' نظر نہیں آتا جس پر خدا کا پیغام سفر کر کے انسانوں تک پہونچتا ہو، اس لیے بہت سے لوگ اس دعوے کے صحیح ہونے سے انکار کر دیتے ہیں، حالانکہ وحی کا تصور اس وقت ہمارے لیے بالکل قابلِ فہم ہو جاتا ہے، جب ہم اس کو دوسرے معلوم واقعات کے ساتھ ملا کر دیکھیں۔

ہمارے گردوپیش ایسے واقعات موجود ہیں، جو ہمارے محدود دائرہ سماعت سے کہیں بالاتر ہیں، مگر اس کے باوجود انھیں اخذ کیا جا سکتا ہے، انسان نے آج ایسے آلات ایجاد کر لیے ہیں، جن سے وہ ایک مکھی کے چلنے کی آواز میلوں دور سے اس طرح سن سکتا ہے، جیسے وہ اس کے کان کے پردہ پر رینگ رہی ہو، حتیٰ کہ وہ کائناتی شعاعوں (cosmic rays) کے تصادم تک کو ریکارڈ کر لیتا ہے، اس طرح کے آلات اب کثرت سے انسان کو حاصل ہو چکے ہیں، جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ اخذ وسماعت کی ایسی صورتیں بھی ممکن ہیں جو معمولی حواس کے ذریعے ایک شخص کے لیے ناممکن اور ناقابل قیاس ہوں۔

پھر یہ مخصوص ذرائع ادراک صرف مشینی آلات تک محدود نہیں، بلکہ حیوانوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فطرت نے خود ذی حیات اشیا کے اندر ایسی طاقتیں رکھی ہیں۔ مثلاً کتا اپنی متجسس ناک سے اس جانور کی بو سونگھ لیتا ہے، جو راستہ سے نکل گیا۔ چنانچہ کتّے کی اس صلاحیت کو جرائم کی تفتیش میں استعمال کیا جاتا ہے، چور جس تالے کو توڑ کر کمرے میں گھسا ہے، اس تالے کو جاسوسی کتے (Scott Dog) کو سونگھایا جاتا ہے، اور اس کے بعد اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وہ سیکڑوں انسانوں کے درمیان ٹھیک اس شخص کو تلاش کر کے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے، جس نے اپنے ہاتھ سے تالے کو چھوا تھا۔ کتنے جانور ہیں، آوازیں سنتے ہیں، جو ہماری قوت سماعت سے باہر ہیں۔ بے شک

انسان کے حواس بہت محدود ہیں، مگر اس جانور کے حواس کا معاملہ مختلف ہے۔

تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ جانوروں میں اشراق (Telepathy) کی زبردست صلاحیت پائی جاتی ہے، ایک مادہ پتنگے (moth) کو کوٹھے میں کھلی کھڑکی کے پاس رکھ دیجیے۔وہ کچھ مخصوص اشارے کرے گی۔ یہ اشارے اسی نوع کے نر پتنگے حیرت انگیز فاصلے سے سن لیں گے اور اس کا جواب دیں گے۔جھینگر اپنے پاؤں یا پر ایک دوسرے پر رگڑتا ہے، رات کے سناٹے میں آدھے میل دور تک یہ آواز سنائی دیتی ہے، یہ چھ سوٹن ہوا کو ہلاتا ہے، اور اس طرح اپنے جوڑے کو بلاتا ہے، اس کی مادہ جو بظاہر بالکل خاموش ہوتی ہے۔مگر پراسرار طریقہ پر کوئی ایسا بے آواز جواب دیتی ہے جو نر تک پہنچ جاتا ہے۔ نر اس پراسرار جواب کو جسے کوئی بھی نہیں سنتا، حیرت انگیز طور پر سن لیتا ہے، اور ٹھیک اسی سمت میں اس کے مقام پر جا کر اس سے مل جاتا ہے اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک معمولی ٹڈے (grasshopper) کی قوت سماعت اس قدر تیز ہوتی ہے کہ ہائیڈروجن کے ایٹم کے نصف قطر کے برابر کی حرکت تک کو وہ محسوس کر لیتا ہے۔

اس طرح کی کثیر مثالیں موجود ہیں، جو یہ بتاتی ہیں کہ ایسے ذرائع مواصلات ممکن ہیں، جو بظاہر نظر نہ آتے ہوں مگر اس کے باوجود وہ بطور واقعہ موجود ہوں اور مخصوص حواس رکھنے والے ذی حیات اس کا ادراک کر لیتے ہوں، ان حالات میں اگر ایک شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ''مجھے خدا کی طرف سے ایسی آوازیں سنائی دیتی ہیں، جن کو عام لوگ نہیں سنتے'' تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے، اگر اس دنیا میں ایسی آوازیں ممکن ہیں، جو آلات سنتے ہوں مگر انسان نہ سنتے ہوں، اگر یہاں ایسی پیغام رسانی ہو رہی ہے، جس کو ایک مخصوص جانور تو سن لیتا ہے، مگر دوسرا اسے نہیں سنتا، تو آخر اس واقعہ میں استبعاد کا کیا پہلو ہے کہ خدا اپنی مصالح کے تحت بعض مخفی ذرائع سے ایک انسان تک اپنا پیغام بھیجتا ہے، اور اس کے اندر ایسی صلاحتیں پیدا کر دیتا ہے کہ وہ اس کو اخذ کر سکے اور اس کو پوری طرح سمجھ کر قبول کر لے، حقیقت یہ ہے کہ وحی والہام کے تصور اور ہمارے مشاہدات وتجربات میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے، بلکہ یہ اسی قسم کے مشاہدات کی ایک برتر صورت ہے، جس کا مختلف شکلوں میں ہم تجربہ

کر چکے ہیں۔ یہ ایک امکان کو واقعہ کی صورت میں تسلیم کرنا ہے۔

پھر اشراق اور غیب دانی کے تجربات بتاتے ہیں کہ یہ چیز صرف حیوان تک محدود نہیں بلکہ انسان کے اندر بھی بالقوہ اس قسم کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر الکسس کیرل کے الفاظ میں— فرد کی نفسیاتی سرحدیں مکاں اور زماں کے اندر محض فرضی (suppositions) ہوتی ہیں:

The psychological frontiers of the individual in space and time are obviously suppositions. (*Man, the Unknown*, p. 244)

چنانچہ ایک عامل کسی آواز اور خارجی ذریعہ کے بغیر اپنے معمول پر توجہ ڈالتا ہے، جس کے نتیجہ میں وہ اس پر مصنوعی نیند (Hypnotic Sleep) طاری کر سکتا ہے، اس کو ہنسا یا رلا سکتا ہے، اس کے ذہن میں مخصوص خیالات القاء کر سکتا ہے یہ ایک ایسا عمل ہے، جس میں نہ کوئی ظاہری آلہ استعمال ہوتا اور نہ عامل اور معمول کے سوا کوئی شخص اسے محسوس کرتا، پھر اسی نوعیت کا واقعہ بندے اور خدا کے درمیان کیوں ہمارے لیے ناقابل تصور ہو، خدا کو ماننے اور انسانی زندگی میں اشراقی قوت کا تجربہ کر لینے کے بعد ہمارے لیے وحی و الہام سے انکار کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔

دسمبر 1950ء کا واقعہ ہے۔ بویریا کے حکام (Bavarian authorities) نے ایک عامل توجہ (Hypnotist) فرنٹر سٹروبل (Fronter Strobel) پر ایک ریڈیو پروگرام میں ''خلل اندازی بذریعہ ٹیلی پیتھی'' کے الزام میں مقدمہ دائر کر دیا۔ ریجنا ہوٹل واقع میونخ میں اپنے کرتب کا مظاہرہ کرتے ہوئے سٹروبل نے ایک تماشہ بیں کو تاش کا ایک پتہ اٹھا کر دیا اور اس سے کہا کہ وہ اس کا نام حسب منشا ترتیب کے ساتھ اپنے دل میں سوچ لے۔ ہپناٹسٹ نے دعویٰ کیا کہ وہ اس پتے کا نام مع ترتیب (جیسا کچھ پتہ اٹھانے والے نے اپنے دل میں سوچ رکھا تھا) خود جانے بغیر ریڈیو کے اناؤنسر کی جانب منتقل کر دے گا، جو اس وقت ریڈیو پر خبریں سنا رہا تھا۔

چند ہی سکنڈ بعد حیرت زدہ سامعین نے میونخ ریڈیو کے اناؤنسر کی لڑکھڑاتی زبان میں سنا ''ریجنا ہوٹل، حکم کی ملکہ'' پتے کا نام بھی درست تھا، اور ترتیب بھی پتہ اٹھانے والے کی سوچ کے عین مطابق تھی۔

اناؤنسر کی وحشت اس کی آواز سے واضح طور پر ظاہر ہو رہی تھی۔تاہم وہ خبریں سنائے چلا گیا ادھر سیکڑوں ریڈیو سننے والے اس عجیب واقعہ کا سبب معلوم کرنے کے لیے براڈ کاسٹنگ اسٹیشن کو ٹیلی فون کر رہے تھے، کیوں کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خبروں کے پروگرام کے درمیان ''ریجنا ہوٹل، حکم کی ملکہ'' کے الفاظ کا کیا مطلب ہے۔ اکثر لوگوں نے سمجھا کہ اناؤنسر شاید اس وقت شراب کے نشے میں تھا۔ ڈاکٹر معائنہ کے لیے آیا تو اس نے پایا کہ اناونسر شدید اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہے۔ اناؤنسر نے بتایا کہ خبریں پڑھتے پڑھتے اس کے سر میں اچانک ایک درد سا اٹھا، اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا۔(۱)

میں کہوں گا کہ اگر انسان کو یہ قدرت حاصل ہے کہ ایک انسان کے خیالات دوسرے انسان کو منتقل کر دے، جب کہ دونوں کے درمیان غیر معمولی فاصلہ ہو اور اس کے لیے کوئی ظاہری واسطہ استعمال نہ کیا گیا ہو تو القائے کلام کا یہی واقعہ خالقِ کائنات کی طرف سے کیوں وجود میں نہیں آسکتا۔ انسانی صلاحیت کا یہ اظہار، جس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ یہ ایک تجرباتی قرینہ ہے، جس سے ہم اس امکان کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ خدا اور بندے کے درمیان کسی واسطہ کے بغیر کس طرح الفاظ اور معانی کا تعلق قائم ہوتا ہے، اور ایک کے خیالات دوسرے کو بعینہ منتقل ہو جاتے ہیں۔ اشراقی پیغام رسانی جو بندوں کے درمیان ایک معلوم اور ثابت شدہ واقعہ ہے، ایک ایسی مثال ہے، جس سے ہم اس اشراق کو سمجھ سکتے ہیں، جو بندے اور خدا کے درمیان ہوتا ہے، اور جس کی کامل اور متعین صورت کو مذہب کی اصطلاح میں ''وحی'' کہا جاتا ہے۔ حقیقت

---

(۱) غیب دانی اور اشراق (ٹیلی پیتھی) کے ان ثابت شدہ مظاہر کی توجیہہ کے لیے مختلف نظریے پیش کیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ دماغ سے کسی قسم کی لہریں نکلتی ہیں، جو نہایت تیزی سے عالم میں پھیل جاتی ہیں، چنانچہ اس کو نظریہ امواج دماغی Brain-Wave Theory کہا جاتا ہے۔

Religion,Philosophy and Psychical Research by C.D. broad,P.47.48

نیز ملاحظہ ہو، الکسس کیرل کی کتاب، Man, the Unknown، صفحات 244-49۔

یہ ہے کہ وحی اپنی نوعیت کے اعتبار سے، بلاتشبیہ، اسی قسم کا ایک مخصوص کائناتی اشراق ہے، جس کا تجربہ محدود پیمانے پر ہم انسانی زندگی میں بار بار کر چکے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔

وحی والہام کو ممکن ماننے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس کی ضرورت بھی ہے یا نہیں کہ خدا کسی انسان سے مخاطب ہو اور اس کے ذریعہ سے اپنا کلام بھیجے، اس کی ضرورت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ رسول آدمی کو جس چیز سے باخبر کرتا ہے، وہ آدمی کی شدید ترین ضرورت ہے، مگر وہ خود اپنی کوشش سے اسے حاصل نہیں کرسکتا ہزاروں برس سے انسان حقیقت کی تلاش میں ہے، وہ سمجھنا چاہتا ہے کہ یہ کائنات کیا ہے، انسان کا آغاز وانجام کیا ہے، خیر کیا ہے اور شر کیا ہے، انسان کو کیسے قابو میں لایا جائے، زندگی کو کیسے منظم کیا جائے کہ انسانیت کے سارے تقاضے اپنے صحیح مقام کو پاتے ہوئے متواتر ترقی کرسکیں، مگر ابھی تک اس تلاش میں کامیابی نہیں ہوئی، تھوڑی مدت کی تلاش وجستجو کے بعد ہم نے لوہے، اور پٹرول کی سائنس بالکل ٹھیک ٹھیک جان لی اور طبیعی دنیا کی سیکڑوں سائنسوں کے بارے میں صحیح ترین واقفیت حاصل کرلی، مگر انسان کی سائنس ابھی تک دریافت نہیں ہوئی۔ طویل ترین مدت کے درمیان بہترین دماغوں کی لاتعداد کوششوں کے باوجود یہ سائنس ابھی تک اپنے موضوع کی ابتدائیات کو بھی متعین نہ کرسکی۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس معاملے میں ہمیں خدا کی مدد کی ضرورت ہے، اس کے بغیر ہم اپنا ''دین'' معلوم نہیں کرسکتے۔

یہ بات انسان جدید کو تسلیم ہے کہ زندگی کا راز ابھی تک اس کو معلوم نہ ہوسکا، مگر اسی کے ساتھ وہ یقین رکھتا ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی اس راز کو معلوم کرلے گا، سائنس اور صنعت کے پیدا کیے ہوئے ماحول کا انسان کے لیے سازگار نہ ہونا، اسی وجہ سے ہے کہ ''اگر ایک طرف جامد مادے کے علوم کی وسیع پیمانے پر ترقی ہوئی ہے تو دوسری طرف جاندار ہستیوں کے علوم بالکل ابتدائی حالت پر باقی ہیں''۔ اس دوسرے شعبہ پر جن لوگوں نے کام کیا، وہ حقیقت کو نہ پاسکے، اور اپنے تخیلات کی دنیا میں بھٹک رہے ہیں، نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر الکسس کیرل (Alexis Carrel) کے الفاظ میں — ''فرانسیسی انقلاب کے اصول اور مارکس اور لینن کے نظریے محض ذہنی اور قیاسی انسانوں پر منطبق ہوسکتے ہیں،

اس بات کوصاف طور پر محسوس کرنا چاہیے کہ انسانی تعلقات کے قوانین (Laws of Human Relations) اب تک معلوم نہیں ہو سکے ہیں، سماجیات اور اقتصادیات کے علوم محض قیاسی ہیں، اورنا قابل ثبوت ہیں۔‘‘

The Principles of the French Revolution, the Visions of Marx and Lenin, apply only to abstract men. It must be clearly realised that the laws of human relations are still unknown. Sociology and economics are conjectural sciences – that is pseudo-sciences. (*Man, the Unknown*, p. 37)

بلاشبہ موجودہ زمانے میں علوم نے بہت ترقی کی ہے، مگر ان ترقیات نے مسئلہ کو اور الجھا دیا ہے، اس نے کسی بھی درجہ میں اسکوحل کرنے میں کوئی مدد نہیں کی ہے۔ جے، ڈبلیو، این سولیون (J. W. N. Sullivan) لکھتا ہے:

’’سائنس نے موجودہ زمانے میں جس کائنات کو دریافت کیا ہے، وہ تمام فکری تاریخ کے مقابلے میں بہت زیادہ پراسرار ہے، اگرچہ فطرت کے بارے میں ہماری معلومات تمام پچھلے ادوار کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں، مگر اس کے باوجود یہ کثیر معلومات ایک اعتبار سے بہت کم تشفی بخش ہیں۔ کیوں کہ ہر سمت میں ہم ابہام (ambiguities) اور تضاد (contradictions) سے دو چار ہو رہے ہیں۔‘‘

At the present day the scientific universe is more mysterious than it has ever been before in the history of thought. Although our knowledge of natural processes is greater than it has ever been, this knowledge is, in a way, less satisfactory, for in every direction we are faced by ambiguities and contradictions. (*Limitations of Science*, 1938, p. 89-90)

زندگی کے راز کو مادی علوم میں تلاش کرنے کا یہ عبرت ناک انجام بتاتا ہے کہ زندگی کا راز انسان کے لیے ناقابل دریافت ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر الکسس کیرل کی کتاب صفحات 19-16)۔ ایک طرف صورت حال یہ ہے کہ زندگی کی حقیقت کو جاننا ضروری ہے، اس کے

بغیر ہم کوئی عمل نہیں کر سکتے، ہمارے بہترین جذبات اسے جاننا چاہتے ہیں، ہماری ہستی کا اعلیٰ ترین جزء جس کو ہم فکر یا ذہن کہتے ہیں، وہ اس کے بغیر مطمئن ہونے کے لیے کسی طرح راضی نہیں، ہماری زندگی کا سارا نظام اس کے بغیر ابتر ہے اور لاینحل معمہ بنا ہوا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے، مگر یہی سب سے بڑی ضرورت ہم خود سے پوری نہیں کر سکتے۔

کیا یہ صورت حال اس بات کی کافی دلیل نہیں ہے کہ انسان ''وحی'' کا محتاج ہے۔ زندگی کی حقیقت کا انتہائی ضروری ہونے کے باوجود انسان کے لیے ناقابل دریافت ہونا ظاہر کرتا ہے کہ اس کا تعلق اس فہرستِ کائنات سے ہے، جس میں قدرت نے روشنی اور حرارت جیسی چیزوں کو درج کر رکھا ہے۔ روشنی اور حرارت انسان کے لیے ضروری ہے۔ اس کے باوجود یہ انسان کے بس سے باہر ہے۔ مگر قدرت نے حیرت انگیز طور پر سورج کے ذریعہ اس کا انتظام کر دیا ہے۔ اسی طرح زندگی کے سوال کا جواب دینے کے لیے خارج سے انتظام کیا گیا ہے۔

وحی والہام کو ممکن اور ضروری تسلیم کر لینے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جو شخص اس کا دعویٰ کر رہا ہے، وہ فی الواقع صاحب وحی ہے یا نہیں، ہمارے عقیدے اور ایمان کے مطابق اس قسم کے صاحبان وحی بہت کثیر تعداد میں اس زمین پر پیدا ہو چکے ہیں، مگر اس باب میں ہم خاص طور پر آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت پر گفتگو کریں گے، اس لیے کہ آپ کے دعوائے نبوت کا ثابت ہونا دراصل سارے انبیاء کے دعوائے نبوت کا ثابت ہونا ہے، کیوں کہ آپ دیگر انبیاء کے منکر نہیں ہیں، بلکہ ان کی تصدیق کرنے والے ہیں، اور اس لیے بھی کہ اب موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے آپ ہی خدا کے رسول ہیں، آپ کے بعد اب کوئی دوسرا رسول آنے والا نہیں ہے، اس لیے عملاً اب نسل انسانی کی نجات وخسران کا معاملہ آپ ہی کے دعوائے نبوت کو ماننے یا نہ ماننے سے متعلق ہے۔

سن عیسوی کے لحاظ سے 29 اگست 570ء کی صبح کو مکہ میں ایک بچہ پیدا ہوا، چالیس سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد اس نے یہ اعلان کیا کہ خدا نے مجھ کو اپنا آخری رسول بنایا ہے، اور میرے پاس اپنا پیغام بھیج کر مجھے اس خدمت کے لیے مامور کیا ہے کہ میں اس کے پیغام کو تمام انسانوں تک

پہنچادوں، جومیری اطاعت کرے گا وہ خدا کے یہاں سرفراز ہوگا اور جو میری نافرمانی کرے گا وہ ہلاک کردیا جائے گا۔

یہ آواز آج بھی پوری شدت کے ساتھ ہمارے سروں پر گونج رہی ہے، یہ ایسی آواز نہیں ہے کہ کوئی شخص اس کو سنے اور نظر انداز کردے، بلکہ یہ ایک زبردست مطالبہ ہے، اس آواز کا تقاضا ہے کہ ہم اس کے اوپر غور کریں، اس کے بعد اگر اس کو غلط پائیں تو کھلے دل سے اسے رد کردیں اور صحیح پائیں تو کھلے دل سے اس کو قبول کرلیں۔

جدید معیار کے مطابق کسی تصور کے علمی حقیقت بننے کے لیے اسے تین مرحلوں سے گزرنا ہوتا ہے:

1۔ مفروضہ (hypothesis)

2۔ مشاہدہ (observation)

3۔ تصدیق (verification)

پہلے ایک مفروضہ یا تصور ذہن میں آتا ہے، پھر مشاہدہ کیا جاتا ہے، اس کے بعد اگر مشاہدہ سے اس کی تصدیق ہوجائے تو اس مفروضہ کو واقعہ تسلیم کرلیا جاتا ہے، اس ترتیب میں کبھی فرق بھی ہوجاتا ہے، یعنی پہلے کچھ مشاہدات سامنے آتے ہیں، اور ان مشاہدات سے ایک تصور یا مفروضہ ذہن میں قائم ہوتا ہے، پھر جب یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ مشاہدات فی الواقع اس مفروضہ کی تصدیق کررہے ہیں تو وہ حقیقت قرار پاجاتا ہے۔

اس اصول کے مطابق نبی کا دعوائے نبوت گویا ایک ''مفروضہ'' کے طور پر ہمارے سامنے ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مشاہدات اس کی تصدیق کررہے ہیں یا نہیں، اگر مشاہدات اس کے حق میں گواہی دے دیں تو اس کی حیثیت ایک مصدقہ حقیقت (verified fact) کی ہوجائے گی، اور ہمارے لیے ضروری ہوجائے گا کہ ہم اس کو تسلیم کریں۔

اب دیکھیے کہ وہ کیا مشاہدات ہیں جو اس ''مفروضہ'' کی تصدیق کے لیے درکار ہیں جن کی بنیاد پر ہم نبی کے دعوے کو جانچیں اور اس کے مطابق دعوے کا صحیح یا غلط ہونا معلوم کریں۔ دوسرے لفظوں

یں وہ کون سے خارجی مظاہر ہیں، جن کی روشنی میں یہ متعین ہوتا ہے کہ آپ فی الواقع خدا کے رسول تھے، ذات رسول میں جمع ہونے والی وہ کون سی خصوصیات ہیں، جن کی توجیہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ ہم ان کو خدا کا رسول مانیں، میرے نزدیک یہ حسب ذیل ہیں، جو شخص اپنے بارے میں رسول ہونے کا دعویٰ کرے، اس کے اندر دو خصوصیات لازمی طور پر ہونی چاہئیں۔

1۔ ایک یہ کہ وہ غیر معمولی طور پر ایک معیاری انسان ہو، کیوں کہ وہ شخص جس کو ساری نسل انسانی میں اس لیے چنا جائے کہ وہ خدا سے ہم کلام ہو اور زندگی کی درستگی کا پروگرام اس کے ذریعہ سے منکشف کیا جائے، یقینی طور پر اس کو نسل انسانی کا بہترین فرد ہونا چاہئیے اور اس کی زندگی میں اس کے آدرشوں (ideals) کو بہ تمام و کمال ظہور کرنا چاہیے، اگر اس کی زندگی ان اوصاف سے مزین ہے تو یہ اس کے دعوے کی صداقت کا کھلا ہوا ثبوت ہے، کیوں کہ اس کا دعویٰ اگر غیر حقیقی ہو تو وہ زندگی میں اتنی بڑی حقیقت بن کر نمایاں نہیں ہوسکتا کہ اس کو اخلاق و کردار میں ساری انسانیت میں بلند کردے۔

2۔ دوسرے یہ کہ اس شخص کا کلام اور اس کا پیغام ایسے پہلوؤں سے بھرا ہوا ہونا چاہیے جو عام انسان کے بس سے باہر ہوں، جس کی امید کسی ایسے ہی انسان سے کی جاسکتی ہو، جس پر مالک کائنات کا سایہ پڑا ہو۔ عام انسان ایسا کلام پیش کرنے پر قادر نہ ہوسکیں۔

یہ دو معیار ہیں جن پر ہمیں رسول کے دعوائے نبوت کو جانچنا ہے۔

پہلی بات کے سلسلے میں تاریخ کی قطعی شہادت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام محمد بن عبد اللہ ایک غیر معمولی سیرت کے آدمی تھے۔ ہٹ دھرمی کے ذریعہ تو کسی بھی حقیقت کا انکار ممکن ہے، اور دھاندلی کی زبان میں ہر الٹی بات کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔ مگر جو شخص تعصب کا مریض نہ ہو اور کھلے دل سے حقیقت کا مطالعہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ لازماً تسلیم کرے گا کہ آپ کی زندگی اخلاقی حیثیت سے نہایت اعلیٰ وارفع تھی۔

پیغمبر اسلام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت ملی۔ اس سے پہلے آپ کی پوری زندگی اخلاقی لحاظ سے اس قدر اعلیٰ تھی کہ آپ کو لوگ سچا اور دیانت دار کہہ کر پکارنے لگے تھے۔ ''اَلصَّادِقُ الامینْ''

آپ کا مشہور لقب بن گیا تھا۔ قدیم مکہ میں آپ کے متعلق بلا استثنا یہ بات مانی جاتی تھی کہ آپ ایک نہایت ایمان دار شخص ہیں، اور کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔

دعوائے نبوت سے پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قریش نے کعبہ کی تعمیر نو کا ارادہ کیا۔ جب تعمیر ہونے لگی تو اس بات پر شدید اختلاف پیدا ہو گیا کہ حجر اسود کو نئی تعمیر میں کون شخص اس کی جگہ پر نصب کرے، چار پانچ دن تک یہ اختلاف جاری رہا اور قریب تھا کہ تلواریں چل جائیں، بالآخر طے پایا کہ اس جھگڑے کا فیصلہ وہ شخص کرے گا جو کل صبح کو سب سے پہلے بیت اللہ میں داخل ہو، دوسرے دن لوگوں نے جب سب سے پہلے داخل ہونے والے انسان کو دیکھا تو پکار اٹھے ''هَذَا الأَمِينُ قَدْ رَضِينَا بِمَا قَضَى بَيْنَنَا'' (الطبقات الکبریٰ لابن سعد، جلد 1، صفحہ 116)۔ امین آ گیا، ہم سب راضی ہیں، جو فیصلہ وہ ہمارے درمیان کریں۔

ہمیں تاریخ میں کسی ایسے شخص کا علم نہیں جس کی زندگی بحث ونزاع کا موضوع بننے سے پہلے چالیس سال تک لوگوں کے سامنے رہی ہو اور اس کے جاننے والے اس کی سیرت و کردار کے بارے میں اتنی غیر معمولی رائے رکھتے ہوں۔

پہلی بار آپ پر غار حرا میں وحی اتری تو یہ آپ کے لیے ایک ایسا غیر معمولی واقعہ تھا، جس کا آپ کو پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا، آپ شدت احساس کے ساتھ گھر لوٹے اور اپنی اہلیہ سے، جو آپ سے عمر میں بڑی تھیں، اس واقعہ کا ذکر کیا۔ اہلیہ کا جواب تھا— ''خدا کی قسم، اللہ یقیناً آپ کی حفاظت کرے گا، کیوں کہ آپ سچ بولتے ہیں، آپ دیانت دار ہیں، آپ برائی کا بدلہ بھلائی سے دیتے ہیں، اور لوگوں کے حقوق ادا کرتے ہیں۔'' (دیکھیے، صحیح البخاری، حدیث نمبر 3)۔

ابوطالب آپ کے چچا تھے، ان کے سامنے آپ نے اسلام کی دعوت پیش کی تو انھوں نے یہ کہہ کر اسے ماننے سے انکار کر دیا کہ میں اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ نہیں سکتا، مگر اس کے بعد جب انھیں اپنے لڑکے علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے معلوم ہوا کہ وہ آپ پر ایمان لا چکے ہیں تو ابوطالب نے کہا ''بیٹے! تم اس کے لیے آزاد ہو کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ محمد تم کو خیر کے سوا کسی

چیز کی طرف نہیں بلائیں گے۔'' (آئیڈیل پرافٹ صفحہ 68)

نبوت ملنے کے بعد جب آپ نے پہلی بار صفا پہاڑی کے دامن میں لوگوں کو جمع کر کے اپنی دعوت پیش کی اس وقت آپ نے اپنی دعوتی تقریر شروع کرنے سے پہلے حاضرین سے یہ سوال کیا ''تمہارا میرے متعلق کیا خیال ہے'' جواب میں بالاتفاق یہ آواز آئی:

مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ إِلَّا صِدْقًا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4770)۔ یعنی تمھارے اندر ہم نے سچائی کے سوا کوئی اور بات کبھی نہیں دیکھی ہے۔

پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ابتدائی زندگی کے بارے میں یہ ایک ایسا ممتاز تاریخی ریکارڈ ہے جس کی مثال کسی بھی شاعر، فلسفی، مفکر یا مصنف کے یہاں نہیں مل سکتی۔

جب آپ نے پیغمبری کا اعلان کیا تو مکہ کے لوگ جو آپ کو اچھی طرح جانتے تھے، ان کے لیے یہ سوال خارج از بحث تھا کہ آپ کو نعوذ باللہ جھوٹا یا جعل ساز سمجھیں۔ کیوں کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اب تک کی پوری زندگی کے خلاف تھا۔ اس لیے انھوں نے کبھی آپ پر اس قسم کا الزام نہیں لگایا۔ بلکہ کہا تو یہ کہا کہ اس شخص کی عقل کھوگئی ہے، وہ شاعرانہ مبالغہ کر رہے ہیں، اور ان پر کسی کا جادو چل گیا ہے، ان پر جنات سوار ہے، وغیرہ۔ مخالفین نے یہ سب کچھ کہا مگر کسی کی جرأت یہ نہ ہوئی کہ وہ آپ کی صداقت اور دیانت داری پر شبہ ظاہر کرے۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ ایک شخص جس کی قوم اس کی دشمن ہو چکی ہے، اور وطن میں اس کا رہنا بھی اسے گوارا نہیں ہے، اس شخص کے بارے میں اس کی دشمن قوم کا حال تاریخ یہ بیان کرتی ہے:

لَيْسَ بِمَكَّةَ أَحَدٌ عِنْدَهُ شَيْءٌ يُخْشَى عَلَيْهِ إِلَّا وَضَعَهُ عِنْدَهُ، لِمَا يُعْلَمُ مِنْ صِدْقِهِ وَأَمَانَتِهِ (سیرت ابن ہشام جلد 1، صفحہ 485)۔ یعنی مکہ میں جس کسی کے پاس بھی کوئی ایسی چیز ہوتی جس کے بارے میں اسے کسی قسم کا اندیشہ ہوتا تو اسے آپ کے پاس رکھ دیتا، کیوں کہ ہر ایک کو آپ کی سچائی اور دیانتداری کا یقین تھا۔

نبوت کے تیرہویں سال عین اس وقت جب کہ آپ کے مخالفین آپ کا مکان گھیرے ہوئے

کھڑے تھے، اور اس بات کا قطعی فیصلہ کر چکے تھے کہ باہر نکلتے ہی آپ کو قتل کر دیں گے، آپ گھر کے اندر اپنے نوجوان عزیز علی بن ابی طالب کو یہ وصیت کر رہے تھے کہ میرے پاس مکہ کے فلاں فلاں لوگوں کا مال امانت رکھا ہوا ہے، میرے جانے کے بعد تم ان سب کا مال انھیں واپس کر دینا۔

نضر بن حارث جو آپ کا مخالف ہونے کے ساتھ دنیوی معاملات میں قریش کے اندر سب سے زیادہ تجربہ کار تھا، اس نے ایک روز اپنی قوم سے کہا— ''قریش کے لوگو! محمد کی دعوت نے تم کو ایسی مشکل میں ڈال دیا ہے، جس کا کوئی حل تمہارے پاس نہیں ہے، وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے بچپن سے جوان ہوئے ہیں، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ تمہارے درمیان سب سے زیادہ سچے، سب سے زیادہ امانت دار اور سب سے زیادہ پسندیدہ شخص تھے، لیکن جب ان کے بال سفید ہونے کو آئے اور انھوں نے وہ کلام پیش کیا، جس کو تم سن رہے ہو تو اب تمہارا حال یہ ہے کہ تم کہتے ہو ''یہ شخص جادوگر ہے، یہ شاعر ہے، یہ مجنون ہے'' خدا کی قسم میں نے محمد کی باتیں سنی ہیں، محمد نہ جادوگر ہے، نہ وہ شاعر ہے، نہ وہ مجنون ہے، مجھے یقین ہے کہ کوئی اور مصیبت تمہارے اوپر آنے والی ہے۔'' (سیرت ابن ہشام، جلد 1 صفحہ 319)۔

ابوجہل جو آپ کا سخت ترین دشمن تھا، وہ کہتا تھا— ''محمد! میں یہ نہیں کہتا کہ تم جھوٹے ہو، مگر جس چیز کی تم تبلیغ کر رہے ہو اس کو میں صحیح نہیں سمجھتا۔'' (إِنَّا لَا نُكَذِّبُكَ، وَلَكِنْ نُكَذِّبُ بِمَا جِئْتَ بِهِ) جامع الترمذی، حدیث نمبر 3064۔

آپ کی نبوت چوں کہ صرف عرب کے لیے نہیں تھی، بلکہ ساری دنیا کے لیے تھی، اس لیے اپنی زندگی ہی میں آپ نے ہمسایہ ممالک کے بادشاہوں کو دعوتی خطوط روانہ کیے، روم کے بادشاہ ہرقل (قیصر روم) کو بھی آپ نے دعوت نامہ بھیجا۔ (اس کو آپ کا دعوت نامہ بیت المقدس میں ملا، جہاں وہ اُن دنوں ایرانیوں پر فتح یابی کا شکرانہ ادا کرنے کے لیے آیا ہوا تھا۔) چنانچہ اس نے حکم دیا کہ عرب کے کچھ لوگ یہاں ہوں تو حاضر کیے جائیں۔ اس زمانے میں قریش کے چند لوگ تجارت کی غرض سے شام گئے ہوئے تھے— وہ دربار میں پہنچے تو ہرقل نے پوچھا تمہارے شہر میں جس شخص نے خدا کا رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے، تم میں سے کوئی اس کا قریبی رشتہ دار بھی ہے— ابوسفیان نے جواب دیا وہ میرے

خاندان کا ہے، اس کے بعد ہرقل اور ابوسفیان کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس کے چند فقرے یہ ہیں:

ہرقل: اس دعوے سے پہلے کبھی تم نے اس کو جھوٹ بولتے ہوئے بھی سنا ہے۔

ابوسفیان: کبھی نہیں۔

ہرقل: کیا وہ عہد و پیمان کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

ابوسفیان: ابھی تک اس نے کسی عہد کی خلاف ورزی نہیں کی۔

ہرقل نے یہ سن کر کہا — ''جب یہ تجربہ ہو چکا ہے کہ وہ آدمیوں کے معاملے میں کبھی جھوٹ نہیں بولا، تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس نے خدا کے معاملے میں اتنا بڑا جھوٹ گڑھ لیا ہو۔''

یہ اس وقت کی گفتگو ہے جب کہ ابوسفیان ابھی ایمان نہیں لائے تھے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کٹر دشمن تھے، بلکہ آپ کے خلاف جنگ کی قیادت کر رہے تھے، وہ خود کہتے ہیں کہ ''اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ ہرقل کے دربار میں جو دوسرے قریشی بیٹھے ہوئے ہیں، وہ مجھے جھوٹا مشہور کر دیں گے تو میں اس موقع پر غلط بیانی سے کام لیتا۔'' (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7)

ساری تاریخ میں کسی بھی ایسے شخص کا نام نہیں لیا جا سکتا جس کے مخاطبین شدید مخالف ہونے کے باوجود اس کی زندگی اور سیرت کے بارے میں اتنی غیر معمولی رائے رکھتے ہوں، اور یہ واقعہ بجائے خود آپ کے رسول اللہ ہونے کا کافی ثبوت ہے، یہاں میں ڈاکٹر لیٹز کا ایک اقتباس نقل کروں گا۔

> ''میں بہت ادب کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اگر فی الواقع خدائے پاک کے یہاں سے، جو تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے، الہام ہوتا ہے تو محمد کا مذہب الہامی مذہب ہے، اور اگر ایثار نفس دیانتداری، راسخ الاعتقادی، نیکی اور بدی کی کامل جانچ اور برائی دور کرنے کے عمدہ ذرائع ہی الہام کی ظاہری بیّن علامتیں ہیں تو محمد کا مشن الہامی تھا۔''

Life of Mohammad by M. Abdul Fazal

جب آپ نے دعوت دینی شروع کی تو آپ کی قوم نے سخت ترین مصیبتیں ڈالیں، آپ کی راہ میں کانٹے بچھا دیتے، نماز پڑھنے میں آپ کے جسم پر نجاست لا کر انڈیل دیتے، ایک دفعہ آپ

حرم میں نماز پڑھ رہے تھے،عقبہ ابن ابی معیط نے آپ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچا کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے، اس قسم کی حرکتوں سے جب آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا تو انھوں نے آپ کا اور آپ کے سارے خاندان کا بائیکاٹ کر دیا اور آپ کو مجبور کیا کہ بستی سے باہر ایک پہاڑی درہ میں جا کر بے یارومددگار پڑے رہیں، اس دوران میں کوئی ضرورت کی چیز حتیٰ کہ کھانا پینا بھی نہ کوئی شخص آپ تک پہونچا سکتا تھا، اور نہ آپ کے ہاتھ فروخت کر سکتا تھا— آپ اپنے خاندان کے ساتھ تین سال تک اس حصار میں اس طرح رہے کہ پہاڑی درخت (طلح) کے پتے کھاتے تھے، آپ کے ایک ساتھی کا بیان ہے کہ اس زمانے میں ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ آ گیا میں نے پانی سے اسے دھویا، پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا تین سال کے بعد یہ بائیکاٹ ختم ہوا (دیکھیے، سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 77-374)۔

مکہ کے لوگوں کی یہ سنگ دلی دیکھ کر آپ طائف گئے جو مکہ سے تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر امراء وروساء کا شہر تھا، وہاں کے لوگوں نے آپ سے نہایت بُری طرح کلام کیا، ایک نے کہا: ''کیا خدا کو تیرے سوا کوئی اور پیغمبری کے لیے نہیں ملتا تھا''۔ پھر ان لوگوں نے بدکلامی ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ طائف کے شریروں کو ابھار کر آپ کے پیچھے لگا دیا۔ یہ لوگ ہر طرف سے آپ کے اوپر ٹوٹ پڑے اور آپ پر پتھر پھینکنا شروع کیا، انھوں نے اس بری طرح آپ کو زخمی کیا کہ آپ کے جوتے خون سے بھر گئے، آپ زخموں سے چور ہو کر بیٹھ جاتے تو بازو تھام کر کھڑا کر دیتے جب چلنے لگتے تو پھر پتھر برساتے، ساتھ ساتھ گالیاں دیتے اور تالی بجاتے، اسی طرح شام ہونے تک آپ کے پیچھے لگے رہے، شام کو جب وہ زخم اور خون کی حالت میں آپ کو چھوڑ کر چلے گئے تو آپ نے ایک باغ میں انگور کی ٹٹیوں کی آڑ میں پناہ لی، یہی وہ واقعہ ہے، جس کے متعلق آپ نے ایک مرتبہ حضرت عائشہ سے فرمایا: لَقَدْ لَقِيتُ مِنْ قَوْمِكِ مَا لَقِيتُ، وَكَانَ أَشَدَّ مَا لَقِيتُ مِنْهُمْ يَوْمَ العَقَبَةِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3231)۔ یعنی تمھاری قوم سے مجھ کو بہت سی تکلیفیں پہنچی ہیں، مگر میرے اوپر سب سے زیادہ تکلیف والا دن وہ تھا، جب میں طائف گیا۔

ان تمام ایذا رسانیوں کے باوجود آپ اپنا کام کرتے رہے، بالآخر قریش نے طے کیا اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ آپ کو قتل کر دیا جائے، چنانچہ ایک رات کو قریش کے تمام سرداروں نے ننگی تلواروں کے ساتھ آپ کا مکان پر گھیرا ڈال دیا، تاکہ صبح کو جب آپ باہر نکلیں تو آپ کو قتل کر دیا جائے، مگر اللہ کی مدد سے آپ بحفاظت گھر سے نکل گئے اور مدینہ جا کر قیام فرمایا۔

اس کے بعد قریش نے آپ کے ساتھ باضابطہ جنگ چھیڑ دی، اور دس سال تک مسلسل آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو جدال و قتال میں الجھائے رکھا، جس میں آپ کے دانت شہید ہوئے، بہترین ساتھی مارے گئے، وہ تمام مصائب جھیلنے پڑے جو جنگی حالت پیدا ہو جانے کے بعد جھیلنے ہوتے ہیں۔

اس طرح 23 سالہ تاریخ کے بعد آپ کی عمر کے آخری دنوں میں مکہ فتح ہوا، اس وقت آپ کے دشمن بے یار و مددگار آپ کے سامنے کھڑے تھے، ایسے وقت میں فاتح جو کچھ کرتا ہے، وہ سب کو معلوم ہے، مگر آپ نے ان سے کوئی انتقام نہیں لیا، آپ نے پوچھا: ''يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ، مَا تُرَوْنَ أَنِّي فَاعِلٌ فِيكُمْ؟'' (قریش کے لوگو! بتاؤ اب میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا، انھوں نے کہا آپ شریف بھائی ہیں، اور شریف بھائی کی اولاد ہیں، آپ نے فرمایا:

اذْهَبُوا فَأَنْتُمْ الطُّلَقَاء (سیرت ابن ہشام، جلد 2 صفحہ 412)۔ جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو۔

اعلیٰ ترین سلوک کی یہ حیرت انگیز مثال تاریخ کا ایک ایسا معجزہ ہے کہ اگر وہ تاریخ سے قبل کا ہوتا اور تاریخی طور پر ثابت نہ ہوتا تو یقیناً کہنے والے کہتے کہ یہ واقعہ نہیں بلکہ افسانہ ہے۔ کیوں کہ کوئی انسان اب تک ایسا پیدا نہیں ہوا، جو اپنے سخت ترین دشمنوں پر فتح پانے کے بعد ان سے اتنا اعلیٰ ترین سلوک کرے۔ چنانچہ پروفیسر باسورتھ اسمتھ (Bosworth Smith) کے الفاظ کس قدر صحیح ہیں:

> ''جب میں آپ کے جملہ صفات اور تمام کارناموں پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالتا ہوں کہ آپ کیا تھے، اور کیا ہو گئے اور آپ کے تابع دار پیرووں نے جن میں آپ نے زندگی کی روح پھونک دی تھی، کیا کیا کارنامے دکھائے تو آپ مجھے سب سے بزرگ سب سے برتر اور اپنی نظیر آپ ہی دکھائی دیتے ہیں۔''

Mohammad and Mohammadenism, p. 344

پھر آپ نے اپنی ساری زندگی میں جس بے غرضی کا مظاہرہ کیا ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے، منصبِ رسالت سے پہلے آپ مکہ کے ایک کامیاب تاجر تھے، اور آپ کے نکاح میں حضرت خدیجہ جیسی عرب کی دولت مند خاتون تھیں لیکن رسالت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد آپ کی تجارت اور حضرت خدیجہ کی دولت دونوں ختم ہوگئیں، اور آپ کو اس سلسلے میں اتنی مصیبتیں اٹھانی پڑیں کہ آپ خود فرماتے ہیں— ''مجھے خدا کی راہ میں اس قدر ڈرایا اور ستایا گیا کہ کسی کو اتنا ڈرایا اور ستایا نہیں گیا، مجھ پر تیس شب وروز ایسے گزرے ہیں کہ میرے اور بلال کے لیے کھانا، جسے کوئی جاندار کھا سکے، بس اتنی مقدار میں ہوتا تھا کہ بلال اسے بغل میں چھپا لیتے۔'' (جامع الترمذی، حدیث نمبر 2472)۔

آپ نے صرف اپنے مشن کی خاطر یہ تکلیفیں اٹھائیں، ورنہ آپ کے لیے دوسری زندگی بھی ممکن تھی، جب آپ مکہ میں تھے، قریش کی کچھ سردار یہ پیش کش لے کر آپ کے پاس آئے— اگر اس دعوت سے تم مال و دولت چاہتے ہو تو آؤ ہم اتنا مال جمع کر دیں کہ تم سب سے بڑے مال دار بن جاؤ، اگر اس سے سرداری مطلوب ہے تو بتاؤ ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں کہ تمھیں اپنا سردار مان لیں، اور اگر سلطنت کی خواہش ہے تو ہم تمھیں اپنا بادشاہ بھی تسلیم کرلیں گے، اگر یہ واقعہ نہیں ہے اور تم اپنے اندر جنون کی کیفیت پاتے ہو اور تمھیں ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جنھیں تم دور نہیں کر سکتے تو ہم تمہارا علاج کرنے کے لیے بھی تیار ہیں۔''

فَإِنْ كُنْتَ إِنَّمَا جِئْتَ بِهَذَا الْحَدِيثِ تَطْلُبُ بِهِ مَالًا جَمَعْنَا لَكَ مِنْ أَمْوَالِنَا حَتَّى تَكُونَ أَكْثَرَنَا مَالًا، وَإِنْ كُنْتَ إِنَّمَا تَطْلُبُ بِهِ الشَّرَفَ فِينَا، فَنَحْنُ نُسَوِّدُكَ عَلَيْنَا، وإن كنت تريد مُلْكًا مَلَّكْنَاكَ عَلَيْنَا، وَإِنْ كَان هَذَا الَّذِي يَأْتِيكَ رَئِيًا تَرَاهُ قَدْ غَلَبَ عَلَيْكَ -وَكَانُوا يُسَمُّونَ التَّابِعَ مِنْ الْجِنِّ رَئِيا- فَرُبَّمَا كَانَ ذَلِكَ، بَذَلْنَا لَكَ أموالَنا فِي طَلَبِ الطِّبِّ لَكَ حَتَّى نُبْرِئَكَ مِنْهُ۔

ان کی باتوں کو آپ خاموشی سے سنتے رہے۔ اس کے بعد جواب دیا: نہ میں دیوانہ ہوں، نہ مجھے کوئی بیماری ہے، نہ مجھے مال اور حکومت کی لالچ ہے، بلکہ میں تم لوگوں کو خیر خواہ ہوں، میرے پاس تم لوگوں کے لیے سچائی کا پیغام ہے، وہ قبول کرو۔ (سیرت ابن ہشام جلد 1، صفحہ 63-262)

مدینہ میں آپ ایک ریاست کے مالک تھے، آپ کو ایسے جاں نثار خادم حاصل تھے کہ ان جیسے وفادار اور جاں نثار ساتھی، آج تک کسی کو نہیں ملے، مگر واقعات بتاتے ہیں کہ آخر عمر تک آپ نے بالکل معمولی حالت میں گزار دی۔

حضرت عمر اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ "میں آپ کے حجرہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ آپ بغیر قمیص کے کھجور کی معمولی چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں، اور آپ کے جسم پر چٹائی کے نشانات صاف نظر آرہے ہیں، حجرہ میں چاروں طرف نظر دوڑائی تو اس کا کل اثاثہ یہ تھا: ایک طرف تین چمڑے، ایک کونے میں کچھ چھال اور دوسرے کونے میں تقریباً ایک صاع جو، یہ منظر دیکھ کر میں بے اختیار رو پڑا، آپ نے پوچھا روتے کیوں ہو، میں نے عرض کیا، قیصر و کسریٰ کو تو دنیا کی دولت حاصل ہے، اور آپ خدا کے رسول اس حال میں ہیں، یہ سن کر آپ بیٹھ گئے اور فرمایا: عمر! آخر تم کس خیال میں ہو، کیا تم نہیں چاہتے کہ ان کو دنیا ملے اور آخرت ہمارے حصے میں آئے (أَمَا تَرْضَى أَنْ تَكُونَ لَهُمَا الدُّنْيَا، وَلَكَ الْآخِرَةُ)۔" صحیح مسلم، حدیث نمبر 1479

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ مہینہ گزر جاتا تھا، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے مکانات میں چولھا نہیں جلتا تھا، عروہ نے پوچھا تو آپ لوگ زندہ کیسے رہتی تھیں، انھوں نے جواب دیا کہ کھجور اور پانی ہماری غذا تھی، ساتھ ہی بعض انصار دودھ بھیج دیا کرتے تھے، ان ہی کی دوسری روایت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ آنے کے بعد ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ کے گھر والوں نے مسلسل تین دن گیہوں کا استعمال کیا ہو، اور اسی حالت میں آپ دنیا سے چلے گئے (مسند احمد، حدیث نمبر 24768)۔

آپ نے قدرت رکھنے کے باوجود اس طرح زندگی گزاری اور جب دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنی بیویوں اور اولاد کے لیے کچھ نہیں چھوڑا، نہ دینار نہ درہم، نہ بکری نہ اونٹ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی، اس کے بجائے دنیا کی عظیم ترین سلطنت کے بانی جس کو اپنی زندگی میں یہ معلوم تھا کہ اس کی حکومت ایشیا اور افریقہ سے گزرتی ہوئی یورپ کی سرحدوں تک پہنچ جائے گی، اس نے فرمایا:

لَا نُورَثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1757)۔ ہم (پیغمبروں)

کا کوئی وارث نہیں ہوتا، جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔

آپ کے اخلاق وکردار اور آپ کے اخلاص وایثار کے واقعات جو اوپر پی کیے گئے ہیں، یہ کچھ مستثنیٰ واقعات نہیں ہیں، بلکہ یہی آپ کی پوری زندگی ہے، آپ کی ساری زندگی اسی قسم کے واقعات کا دوسرا نام ہے، حقیقت یہ ہے کہ آپ کا معیارِ انسانیت اتنا بلند تھا کہ اگر آپ پیدا نہ ہوتے تو تاریخ کو لکھنا پڑتا کہ اس سطح کا انسان نہ کوئی پیدا ہوا اور نہ کبھی پیدا ہوسکتا۔

ایسے غیر معمولی انسان کے بارے میں یہ عجیب نہیں ہوگا کہ ہم اس کو خدا کا رسول مان لیں، بلکہ یہ عجیب ہوگا کہ ہم اس کے رسول ہونے کا انکار کردیں، کیوں کہ آپ کو رسول مان کر ہم صرف آپ کی معجزاتی شخصیت کی توجیہ کرتے ہیں، اگر ہم آپ کو رسول نہ مانیں تو ہمارے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں رہتا کہ ان حیرت انگیز اوصاف کا سرچشمہ کیا تھا، جب کہ ساری معلوم تاریخ میں کوئی ایک بھی انسان پیدا نہیں ہوا۔ پروفیسر باسورتھ اسمتھ کے یہ الفاظ ایک لحاظ سے حقیقت واقعہ کا اعتراف ہیں، اور دوسرے لحاظ سے وہ سارے انسانوں کو آپ کی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں:

> ''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی زندگی کے آخر میں بھی اپنے لیے اسی منصب کا دعویٰ کیا، جس سے انھوں نے اپنے کام کا آغاز کیا تھا، اور میں یہ یقین کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اعلیٰ ترین فلسفہ اور سچی مسیحیت ایک روز یہ تسلیم کرنے پر متفق ہوں گے کہ آپ ایک پیغمبر تھے، خدا کے سچے پیغمبر۔''

Mohammad and Mohammadenism, p. 344

دوسرے پہلو سے رسول کی رسالت کا سب سے بڑا ثبوت وہ کتاب ہے، جس کو اس نے یہ کہہ کر پیش کیا کہ وہ اس کے اوپر خدا کی طرف سے اتری ہے، یہ کتاب بے شمار ایسی خصوصیات سے بھری ہوئی ہے، جو اس کے بارے میں اس امر کا قطعی قرینہ پیدا کرتی ہیں کہ یہ ایک غیر انسانی کلام ہے، جو خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔

یہ بحث چوں کہ مستقل اہمیت کی حامل ہے، اس لیے اس کو میں الگ باب میں بیان کروں گا۔

قرآن — خدا کی آواز

پیغمبر اسلام کی ایک حدیث ہے:

''پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے ایسے معجزات دیے جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے اور مجھ کو جو معجزہ عطا ہوا ہے، وہ قرآن ہے۔'' (مَا مِنَ الأَنْبِيَاءِ نَبِيٌّ إِلَّا أُعْطِيَ مَا مِثْلهُ آمَنَ عَلَيْهِ البَشَرُ، وَإِنَّمَا كَانَ الَّذِي أُوتِيتُ وَحْيًا أَوْحَاهُ اللَّهُ إِلَيّ) صحیح البخاری، حدیث نمبر 4981۔

یہ ارشاد ہماری تلاش کے صحیح رخ کو متعین کرتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ رسول کی رسالت کو پہچاننے کے لیے آج ہمارے پاس جو سب سے بڑا ذریعہ وہ کتاب ہے جس کو رسول نے یہ کہہ کر پیش کیا تھا کہ وہ اس کے پاس خدا کی طرف سے اتری ہے۔ قرآن، رسول کا نمائندہ بھی ہے، اور رسول کے رسول برحق ہونے کی دلیل بھی۔

قرآن کی وہ کیا خصوصیات ہیں، جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے اترا ہے، اس کے بہت سے پہلو ہیں، یہاں میں چند پہلوؤں کا مختصراً ذکر کروں گا:

1۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز جو قرآن کے طالب علم کو متاثر کرتی ہے، وہ قرآن کا چیلنج ہے، جو چودہ سو برس سے دنیا کے سامنے ہے، مگر آج تک اس کا جواب نہ دیا جاسکا، قرآن میں بار بار یہ اعلان کیا گیا ہے کہ جو لوگ قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کے بارے میں مشتبہ ہیں، اور اس کو محض اپنے جیسے ایک انسان کی تصنیف سمجھتے ہیں، وہ ایسی ایک کتاب بنا کر پیش کریں، بلکہ اس کی جیسی ایک سورہ ہی بنا کر دکھا دیں۔ قرآن کے الفاظ ہیں:

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (2:23)۔ یعنی اپنے بندے پر اپنا جو کلام ہم نے اتارا ہے، اگر اس کے (کلام الٰہی ہونے کے) بارے میں تمھیں شبہ ہے تو اس کے جیسی ایک سورہ لکھ کر لے آؤ

اور خدا کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بھی بلا لو، اگر تم اپنے خیال میں سچے ہو۔

یہ ایک حیرت انگیز دعویٰ ہے، جو ساری انسانی تاریخ میں کسی بھی مصنف نہیں کیا اور نہ بقید ہوش وحواس کوئی مصنف ایسا دعویٰ کرنے کی جرأت کرسکتا، کیوں کہ کسی بھی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ایک ایسی کتاب لکھ دے جس کے ہم پایہ کتاب دوسرے انسان نہ لکھ سکتے ہوں، ہر انسانی تصنیف کے جواب میں اسی درجہ کی دوسری انسانی تصنیف تیار کی جاسکتی ہے، قرآن کا یہ کہنا کہ وہ ایک ایسا کلام ہے، جیسا کلام انسانی ذہن تخلیق نہیں کرسکتا، اور ڈیڑھ ہزار برس تک کسی انسان کا اس پر قادر نہ ہونا، قطعی طور پر ثابت کردیتا ہے کہ یہ ایک غیر انسانی کلام ہے، یہ خدائی منبع (divine origin) سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں، اور جو چیز خدائی منبع سے نکلی ہو اس کا جواب کون دے سکتا ہے۔

تاریخ میں چند مثالیں ملتی ہیں جب کہ اس چیلنج کو قبول کیا گیا۔ ایک واقعہ لبید بن ربیعہ عامری (وفات 41ھ) کا ہے۔ لبید ابن ابی ربیعہ دورِ جاہلیت میں عربوں کا مشہور شاعر تھا۔ وہ عربوں میں اپنے قوت کلام اور تیزیٔ طبع کے لیے مشہور تھا۔ اس نے بطور چیلنج ایک نظم لکھی جو کعبہ کے پھاٹک پر آویزاں کی گئی، اور یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو صرف کسی اعلیٰ ترین شخص ہی کو ملتا تھا۔ اس واقعہ کے جلد ہی بعد کسی مسلمان نے قرآن کی ایک سورہ لکھ کر اس کے قریب آویزاں کردی، لبید (جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے) جب اگلے روز کعبہ کے دروازہ پر آئے اور سورہ کو پڑھا تو ابتدائی فقروں کے بعد ہی وہ غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے اور اعلان کیا بلاشبہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے، اور میں اس پر ایمان لاتا ہوں۔

Mohammad, the Holy Prophet by H.G.Sarwar, p.448

عرب کا یہ مشہور شاعر قرآن کے ادب سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس کی شاعری چھوٹ گئی۔ بعد کو ایک مرتبہ حضرت عمر نے ان سے اشعار کی فرمائش کی تو انھوں نے جواب دیا کہ جب خدا نے مجھے بقرہ اور آل عمران جیسا کلام دیا ہے تو اب شعر کہنا میرے لیے مناسب نہیں (مَا كنت لأقول شعرا بعد أن علمني الله البقرة وآل عِمْرَان) الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب لابن عبد البر، جلد 3، صفحہ 1337۔

دوسرا اس سے زیادہ عجیب واقعہ ابن المقفع کا ہے جس کو نقل کرتے ہوئے ایک مستشرق (Wollaston, Arthur N, 1842-1922) لکھتا ہے:

That Muhammad`s boast as to the literary excellence of the Quran was not unfounded, is further evidenced by a circumstance, which occurred about a century ofter the establishment of Islam. (*Mohammad, His Life and Doctrines*, p.143)

یعنی یہ بات کہ قرآن کے اعجاز کلام کے بارے میں محمد کا دعویٰ غلط نہیں تھا، یہ اس واقعہ سے ثابت ہوجاتا ہے، جو اسلام کے قیام کے سو سال بعد پیش آیا۔

واقعہ یہ ہے کہ منکرینِ مذہب کی ایک جماعت نے یہ دیکھ کر کہ قرآن لوگوں کو بڑی شدت سے متاثر کررہا ہے، یہ طے کیا کہ اس کے جواب میں ایک کتاب تیار کی جائے ،انھوں نے اس مقصد کے لیے ابن المقفع (م727ء) سے رجوع کیا جو اس زمانے کا ایک زبردست عالم، بے مثال ادیب اور غیر معمولی ذہین وطباع آدمی تھا، ابن المقفع کو اپنے اوپر اتنا اعتماد تھا کہ وہ راضی ہوگیا۔اس نے کہا کہ میں ایک سال میں یہ کام کروں گا البتہ اس نے یہ شرط لگائی کہ اس مدّت میں اس کی تمام ضروریات کا مکمل انتظام ہونا چاہیے تا کہ وہ کامل یکسوئی کے ساتھ اپنے ذہن کو اپنے کام میں مرکوز رکھے۔

نصف مدت گزر گئی تو اس کے ساتھیوں نے یہ جاننا چاہا کہ اب تک کیا کام ہوا ہے ۔وہ جب اس کے پاس گئے تو انھوں نے اس کو اس حال میں پایا کہ وہ بیٹھا ہوا ہے۔قلم اس کے ہاتھ میں ہے، گہرے مطالعہ میں مستغرق ہے، اس مشہور نو مسلم ایرانی ادیب کے سامنے ایک سادہ کاغذ پڑا ہوا ہے، اس کی نشست کے پاس لکھ لکھ کر پھاڑے ہوئے کاغذات کا ایک انبار ہے اور اسی طرح سارے کمرہ میں کاغذات کا ڈھیر لگا ہوا ہے، اس انتہائی قابل اور فصیح اللسان شخص نے اپنی بہترین قوت صرف کر کے قرآن کا جواب لکھنے کی کوشش کی۔مگر وہ بری طرح ناکام رہا،اس نے پریشانی کے عالم میں اعتراف کیا کہ صرف ایک فقرہ لکھنے کی جدوجہد میں اس کے چھ مہینے گزر گئے مگر وہ لکھ نہ سکا، چنانچہ ناامید اور شرمندہ ہو کر وہ اس خدمت سے دست بردار ہوگیا۔

اس طرح قرآن کا چیلنج بدستور آج تک قائم ہے اورصدیوں پر صدیاں گزر گئیں مگر کوئی اس کا جواب نہ دے سکا، قرآن کی یہ ایک حیرت انگیز خصوصیت ہے جو بلا اشتباہ یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ مافوق ہستی کا کلام ہے، اگر آدمی کے اندر فی الواقع سوچنے کی صلاحیت ہو تو یہی واقعہ ایمان لانے کے لیے کافی ہے۔

عرب کے لوگ فصاحت و بلاغت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، اور ان کو اپنے کلام کی برتری کا اتنا احساس تھا کہ عرب کے سوا بقیہ دنیا کو عجم (گونگا) کہتے تھے، اس کے باوجود وہ قرآن کے کلام کے آگے جھکنے پر مجبور ہو گئے، یہ قرآن کے معجزانہ کلام کا نتیجہ تھا۔ تمام لوگوں کو اس کے برتر ادب کا اعتراف کرنا پڑا۔ مکہ کا واقعہ ہے۔ طفیل بن عمر الدوسی یمن کے شاعر تھے۔ جب وہ مکہ آئے تو لوگوں نے کہا کہ محمد کی بات نہیں سننا۔ یہ سن کر انھوں نے سوچا کہ میں ایک عقل مند انسان ہوں، شاعر بھی ہوں، اچھی اور خراب باتوں کو میں خود سمجھ سکتا ہوں۔ چنانچہ اس نے پیغمبر اسلام سے ملاقات کی، اور قرآن سنانے کے لیے کہا۔ پیغمبر اسلام نے قرآن کا کچھ حصہ سنایا۔ یہ سن کر اس نے کہا:

وَاَللَّهِ مَا سَمِعْتُ قَوْلًا قَطُّ أَحْسَنَ مِنْهُ، وَلَا أَمْرًا أَعْدَلَ مِنْهُ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 383)۔ اللہ کی قسم میں نے اس سے اچھی بات نہیں سنی، اور نہ اس سے زیادہ انصاف والی بات سنی ہے۔

اسی طرح ایک قریشی سردار ولید بن مغیرہ نے قرآن سنا تو اس کی زبان سے بے اختیار یہ فقرہ نکلا:

وَاللهِ إِنَّ لِقَوْلِهِ الَّذِي يَقُولُ حَلَاوَةً وَإِنَّ عَلَيْهِ لَطَلَاوَةً، وَإِنَّهُ لَمُثْمِرٌ أَعْلَاهُ مُغْدِقٌ أَسْفَلَهُ، وَإِنَّهُ لَيَعْلُو وَمَايُعْلَى، وَإِنَّهُ لَيُحَطِّمُ مَا تَحْتَهُ (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر 133)۔ یعنی اللہ کی قسم، بے شک جو وہ کہتے ہیں، اس میں شیرینی ہے، اور اس میں کشش (attraction) ہے، اور اس کا اوپری حصہ پھلدار ہے، اور اس کا نچلا حصہ زرخیز ہے، بے شک وہ ضرور غالب ہو گا ہے، کوئی اس پر غلبہ نہیں پا سکتا، اور جو اس کو سنے وہ اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔

اس طرح کے بے شمار اعترافات ہیں، جو قدیم تاریخ میں بھی موجود ہیں، اور حال کے واقعات میں بھی۔

2۔ دوسری چیز جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں، وہ قرآن کی پیشین گوئیاں ہیں، یہ پیشین گوئیاں حیرت انگیز طور پر بالکل صحیح ثابت ہوئیں۔

تاریخ میں ہمیں بہت سے ایسے ذہین اور حوصلہ مند لوگ ملتے ہیں جنھوں نے اپنے یا دوسرے کے بارے میں پیشین گوئی کی جرأت کی ہے، مگر ہمیں معلوم ہے کہ زمانے نے کبھی ایسے لوگوں کی تصدیق نہیں کی، موافق حالات غیر معمولی صلاحیت، اعوان وانصار کی کثرت اور ابتدائی کامیابیوں نے اکثر لوگوں کو اس دھوکے میں ڈال دیا ہے کہ وہ ایک ایسے انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں، جو عین اس کی مرضی کے مطابق ہے، انھوں نے فوراً ایک یقینی انجام کا دعویٰ کر دیا، مگر تاریخ نے ہمیشہ اس قسم کے دعوؤں کی تردید کی ہے، اس کے برعکس بالکل مخالف اور ناقابل قیاس حالات میں بھی قرآن کے الفاظ اس طرح صحیح ثابت ہوئے کہ ان کی توجیہ کے لیے تمام انسانی علوم بالکل ناکافی ہیں، ہم انسانی تجربات کی روشنی میں کسی طرح ان کو سمجھ نہیں سکتے۔ ان کی توجیہ کی واحد صورت صرف یہ ہے کہ ان کو غیر انسانی ہستی کی طرف منسوب کیا جائے۔

نپولین بونا پارٹ (Napoléon Bonaparte, 1769-1821) اپنے وقت کا عظیم جنرل تھا۔ اس کی ابتدائی کامیابیاں بتاتی تھیں کہ وہ سیزر اور اسکندر کے لیے بھی ایک قابل رشک فاتح ثابت ہوگا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نپولین کے ذہن میں یہ خیال پرورش پانے لگا کہ وہ تقدیر کا مالک ہے، اس کو اپنے اوپر اتنا اعتماد ہو گیا کہ اپنے قریبی مشیروں تک کے مشورے کو قبول کرنا اس نے چھوڑ دیا، اس کا کہنا تھا کہ کامل غلبہ کے سوا میرا کوئی دوسرا انجام نہیں ہوسکتا۔ مگر اس کا انجام کیا ہوا، وہ سب کو معلوم ہے۔ 12 جون 1815ء کو نپولین اپنی سب سے بڑی فوج لے کر پیرس سے روانہ ہوا کہ دشمن کو اس کے راستے ہی میں ختم کر دے، اس کے چھ دن بعد واٹرلو (بلجیم) میں آرتھر ویلزلی (Arthur Wellesley, 1769-1852) نے خود اس کو فیصلہ کن شکست دینے میں کامیابی

حاصل کی، جواس وقت برطانیہ، ہالینڈ اور جرمنی کی فوجوں کی قیادت کرر ہا تھا۔اب نپولین کی ساری امیدیں ختم ہوگئیں۔وہ اپنا تخت چھوڑ کر امریکا کے ارادے سے بھاگ کھڑا ہوا، مگر ابھی ساحل پر پہنچا تھا کہ دشمن کے نگراں دستوں نے اسے پکڑ لیا، اور مجبور کیا کہ وہ ایک برطانوی جہاز پر سوار ہو۔اس کے بعد اس کو جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے لیے جنوبی اٹلانٹک کے جزیرہ سینٹ ہیلنیا پہنچا دیا گیا، جہاں وہ تنہائی اور مشکل حالات میں زندگی گزارتے ہوئے 5 مئی 1821ء کو مر گیا۔

مشہور کمیونسٹ مینی فسٹو جو 1848 میں شائع ہوا، اس میں سب سے پہلے جس ملک میں اشتراکی انقلاب کی امید ظاہر کی گئی تھی، وہ جرمنی ہے، مگر ایک سو بیس سال گزرنے کے بعد بھی جرمنی اب تک اس ''انقلاب'' سے ناآشنا ہے۔مئی 1859ء میں کارل مارکس نے لکھا تھا ''سرخ جمہوریت پیرس کے اوپر سے جھانک رہی ہے''۔اس پیشین گوئی کو ایک صدی سے زیادہ مدّت گزر گئی، مگر ابھی تک پیرس کے اوپر سرخ جمہوریت کا آفتاب نہیں نکلا، اڈولف ہٹلر نے 14 اپریل 1936ء کو میونخ کی مشہور تقریر میں کہا تھا:

''میں اپنے راستہ پر اس اعتماد کے ساتھ چل رہا ہوں کہ غلبہ میرے حق میں مقدر ہو چکا ہے۔''

A Study of History (Abridgment) p.447

مگر ساری دنیا جانتی ہے کہ جرمنی کے اس عظیم ڈکٹیٹر کے حق میں جو چیز مقدر تھی وہ یہ کہ وہ شکست کھائے اور خودکشی کر کے اپنی جان دے۔اس طرح کی بے شمار مثالوں کے ہجوم میں صرف کتاب الٰہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے جس جس چیز کی پیشین گوئی کی وہ حرف بحرف پوری ہوئی— یہ واقعہ اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ یہ کلام ایسے مافوق ذہن سے نکلا ہے، جس کے قبضہ میں حالات کی باگ ڈور ہے اور جو ازل سے ابد تک کی خبر رکھتا ہے۔

یہاں میں صرف دو پیشین گوئیوں کا ذکر کروں گا۔ایک، خود پیغمبر اسلام کا غلبہ، اور دوسرا، رومیوں کی ایرانیوں کے اوپر مغلوبیت کے بعد فتح کی پیشین گوئی۔

1۔پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسلام کی دعوت شروع کی تو تقریباً تمام عرب آپ کا

مخالف ہو گیا ایک طرف مشرک قبائل تھے، جو آپ کے جانی دشمن ہو گئے، دوسری طرف یہودی سرمایہ دار تھے، جو ہر قیمت پر آپ کو ناکام بنا دینے کا فیصلہ کر چکے تھے، تیسری طرف منافقین تھے، جو بظاہر مسلمان بنے ہوئے تھے، مگر ان کا مقصد یہ تھا کہ آپ کی جماعت میں گھس کر آپ کی تحریک کو اندر سے ڈائنامیٹ کریں، اس طرح طاقت، سرمایہ اور اندرونی سازش— سہ طرفہ مخالفتوں کے طوفان میں آپ اس طرح اپنی تحریک چلا رہے تھے کہ تھوڑے سے غلاموں اور کمزور لوگوں کے سوا کوئی آپ کا ساتھی نہ تھا، مکہ کے سر برآوردہ لوگوں میں سے گنتی کے چند آدمی جو آپ کا ساتھ دینے کے لیے نکلے ان کا بھی حال یہ ہوا کہ آپ کی طرف آتے ہی وہ اپنی برادری سے کٹ گئے اور ان کی قوم ان کی بھی اسی طرح دشمن ہو گئی جس طرح وہ خدا کے رسول کی دشمن تھی۔

یہ تحریک یوں ہی چلتی رہی، یہاں تک کہ حالات اس قدر شدید ہو گئے کہ آپ اور آپ کے اصحاب کو اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے علاقوں کی طرف ہجرت کر جانا پڑا۔ اس طرح آپ اور آپ کے ساتھی جو پہلے ہی نہتے اور کمزور تھے، مدینے میں اس حالت میں جمع ہوئے کہ اپنے وطن میں جو کچھ ان کے پاس تھا وہ بھی چھن چکا تھا۔ مدینے میں ان لوگوں کی بے کسی کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اپنے وطن کو چھوڑ کر مدینے میں آپ کے جو ساتھی جمع ہوئے تھے، ان میں ایسے لوگ بھی تھے، جن کے رہنے کے لیے کوئی باقاعدہ مکان نہیں تھا، وہ چھپّر پڑے ہوئے ایک چبوترے پر زندگی گزارتے تھے، اسی مناسبت سے ان کا نام ''اصحاب صفہ'' پڑ گیا تھا۔ اس چبوترے پر مختلف اوقات میں جو لوگ رہے، ان کی تعداد تقریباً چار سو بتائی جاتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ میں نے اصحاب صفہ میں سے ستر آدمیوں کو دیکھا ہے، جن میں سے ہر شخص کا حال یہ تھا کہ اس کے پاس یا تو صرف ایک تہبند تھی، یا صرف ایک چادر، وہ اس کو اپنی گردن میں باندھ لیتا تھا، اور وہ اس کی پنڈلی تک لٹکتا رہتا تھا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 442)۔ حضرت ابوہریرہ اس زمانے کا خود اپنا حال بیان کرتے ہیں کہ مسجد نبوی میں خاموش لیٹا رہتا تھا، اور لوگ سمجھتے تھے کہ میں بیہوش ہوں، حالانکہ حقیقت صرف یہ تھی کہ مسلسل فاقے کی وجہ سے میں نڈھال ہو جاتا تھا، اور مسجد میں جا کر لیٹ رہتا تھا (جامع الترمذی، حدیث نمبر 2367)۔

چند انسانوں کا یہ بے سروسامان قافلہ مدینے کی زمین پر اس طرح پڑا ہوا تھا کہ ہر آن یہ خطرہ تھا کہ چاروں طرف اس کے پھیلے ہوئے دشمن اس کو اچک لے جائیں گے، مگر خدا کی طرف سے بار بار آپ کو یہ بشارت آتی تھی کہ تم ہمارے نمائندے ہو اور تمھیں کوئی زیر نہیں کر سکتا۔ قرآن میں ایک مقام پر یہ اعلان ہے: كَتَبَ اللّٰهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي إِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ (58:21)۔ یعنی اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب رہیں گے۔ بیشک اللہ قوت والا، زبردست ہے۔

اسی طرح ایک اور مقام پر ہے کہ ساری مخالفتوں کے باوجود اللہ تم کو غالب کر کے رہے گا:

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۔ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (61:8-9)۔ یعنی یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنی روشنی کو مکمل کر کے رہے گا، خواہ منکروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو، وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے، خواہ شرک کرنے والوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

اس دعوے کو تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ سارا عرب آپ کے ماتحت ہو گیا۔ تھوڑے سے نہتے اور بے سروسامان لوگ ان پر غالب آ گئے جو تعداد میں بہت زیادہ تھے، وقت جن کا ساتھ دے رہا تھا اور جن کے پاس ہتھیار اور سازوسامان کا زبردست ذخیرہ موجود تھا۔

مادی اصطلاحات میں اس بات کی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی کہ آپ کو عین اپنی پیشین گوئی کے مطابق عرب کے لوگوں اور ہمسایہ ملکوں پر کیسے اتنی زبردست فتح حاصل ہو گئی۔ اس کی صرف ایک ہی توجیہ ممکن ہے، وہ یہ کہ آپ خدا کے نمائندے تھے۔ خدا نے اپنی مدد سے آپ کو آپ کے دشمنوں کے مقابلے میں غالب کیا اور آپ کے مشن کو اس حد تک کامیاب کیا کہ آپ کے دشمن آپ کے ساتھی بن گئے، غیر معمولی مخالفت اور زبردست دشمنوں کے مقابلے میں نبی امّی کا عین اپنے دعوے کے مطابق کامیاب ہونا اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ آپ کائناتی طاقت کے نمائندے تھے۔ اگر آپ کا مشن

محض ایک انسانی مشن ہوتا تو کبھی یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ کے الفاظ تاریخ بن جائیں۔ایسی تاریخ جس کی مثال سارے انسانی واقعات میں کوئی ایک بھی نہیں۔ جے، ڈبلیو، ایچ اسٹوبرٹ (J. W. H. Stobart) کے الفاظ میں ''آپ کے پاس جتنے کم ذرائع تھے، اور جو وسیع اور مستقل کارنامہ آپ نے انجام دیا، اس کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ساری انسانی تاریخ میں اتنا نمایاں طور پر درخشاں نام اور کوئی نظر نہیں آتا جتنا نبی عربی کا ہے۔''

Islam and its Founder, p. 228

یہ آپ کے نمائندۂ الٰہی ہونے کی ایسی حیرت انگیز دلیل ہے کہ سر ولیم میور (William Muir) جیسے شخص کو بھی بالواسطہ طور پر اس کا اعتراف کرنا پڑا:

''محمد نے مخالفین کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا، انھیں مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ دن رات اپنی کامیابی کا انتظار رہتا تھا، بظاہر بالکل غیر محفوظ، بلکہ یوں کہیے کہ شیر کے منھ میں رہ کر وہ ہمت دکھائی کہ اس کی نظیر اگر کہیں مل سکتی ہے تو صرف بائبل میں جہاں ایک نبی کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے ایک موقع پر خدا سے کہا تھا— صرف میں ہی باقی رہ گیا ہوں۔''

Life of Mohammed, p. 221

2۔ قرآن کی دوسری پیشین گوئی جس کا میں یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں، وہ رومیوں کا ایرانیوں پر غلبہ ہے جو قرآن کی تیسویں سورہ (روم) میں وارد ہوئی ہے:

غُلِبَتِ الرُّومُ ۔ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ (30:2-3)۔یعنی رومی قریب کی زمین میں مغلوب ہو گئے ہیں مگر مغلوب ہونے کے بعد چند سال میں پھر وہ غالب آجائیں گے۔

جزیرہ نمائے عرب کے مشرق میں خلیج فارس کے دوسرے ساحل پر ایرانی حکومت قائم تھی، اور مغرب میں بحر احمر کے کناروں سے لے کر اوپر بحر اسود تک وہ سلطنت تھی، جو تاریخ میں سلطنت روم کے نام سے مشہور ہے، اول الذکر کا دوسرا نام ساسانی سلطنت اور موخر الذکر کا بازنطینی سلطنت

ہے، ان دونوں حکومتوں کی سرحدیں عرب کے شمال میں عراق کے مشہور دریاؤں دجلہ وفرات پر آ کر ملتی تھیں، یہ دونوں اپنے زمانے کی طاقت ورترین سلطنتیں تھیں، رومی سلطنت کی تاریخ مورخ گبن کے بیان کے مطابق دوسری صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے اوراس کو اپنے وقت کی مہذب ترین سلطنت کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

ایک مصنف کے الفاظ میں، روم کے زوال پر جتنا لکھا گیا ہے، اتنا کسی تہذیب کے خاتمے پر نہیں لکھا گیا۔

Western Civilisation, p, 210

اس عنوان پر سب سے زیادہ تفصیلی اور مستند ڈیٹا (data) برٹش مؤرخ و مستشرق ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon, 1737-1794) کی کتاب میں ہے، جس کا نام ہے:

The History of the Decline and Fall of the Roman Empire (1767)

اس کتاب کی پانچویں جلد کے دوسرے باب میں قابل مصنف نے اس دور کے واقعات قلم بند کیے ہیں، جو اس وقت ہمارا موضوع بحث ہے۔ روم کے ایک سابق بادشاہ قسطنطین نے 325ء میں مسیحیت قبول کر کے اس کو سرکاری مذہب کے حیثیت دیدی تھی، چنانچہ روم کی بیشتر آبادی اب حضرت عیسیٰ کی پیرو تھی، اس کے مقابلے میں ایرانی سورج دیوتا کے پرستار تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے روم پر جس بادشاہ کی حکومت تھی، اس کا نام ماریس (Maurice) تھا، ماریس کی نااہلی اور بدانتظامی کی وجہ سے آپ کو نبوت ملنے سے آٹھ سال قبل 602ء میں اس کی فوج نے اس کے خلاف بغاوت کردی، اس بغاوت کی قیادت ایک فوجی کپتان فوکاس (Phocas) نے کی تھی، بغاوت کامیاب ہوگئی، اور فوکاس روم کے شہنشاہ کی جگہ تخت پر قابض ہوگیا— اس نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد شہنشاہ روم ماریس اور اس کے خاندان کو نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کردیا۔

فوکاس (Phocas) نے اپنی ہمسایہ سلطنت ایران کو ایک سفیر بھیج کر نئی تخت نشینی کی اطلاع دی۔ اس وقت ایران کے تخت پر نوشیرواں عادل کا لڑکا خسرو پرویز (Chosroes 2) تھا۔ خسرو

پرویز کو 91-590ء میں اندرونی سازش اور بغاوت کی وجہ سے اپنے ملک سے فرار ہونا پڑا تھا۔ اس زمانے میں مقتول رومی شہنشاہ ماریس نے اس کو اپنے علاقہ میں پناہ دی تھی، اور دوبارہ قبضہ حاصل کرنے کے سلسلے میں اس کی مدد کی تھی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھیں دنوں قسطنطنیہ کے زمانۂ قیام میں خسرو نے ماریس کی لڑکی سے شادی کرلی تھی اور اس رشتہ کی بنا پر ماریس کو وہ اپنا باپ کہتا تھا۔ چنانچہ جب خسرو کو رومی انقلاب کی خبر ملی تو وہ سخت برہم ہوا، اس نے رومی سفیر کو قید کرادیا، اور نئی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔

اس کے بعد فوراً اس نے اپنی فوجوں کے ذریعے روم پر چڑھائی کردی، 603ء میں اس کی فوجیں دریائے فرات کو پار کرکے شام کے شہروں میں داخل ہوگئیں — فوکاس اپنی نااہلی کی وجہ سے اس غیر متوقع حملہ کو روکنے میں کامیاب نہ ہوا، ایرانی فوجیں بڑھتی رہیں، یہاں تک کہ انطاکیہ کو فتح کرتے ہوئے یروشلم پر قابض ہوگئیں، ایرانی سلطنت کے حدود فرات سے پار کرکے یکایک وادئ نیل تک وسیع ہوگئے، سابقہ رومی سلطنت کے مذہبی داروگیری کی وجہ سے چرچ کے مخالف فرقے نسطوری اور یعقوبی نیز یہودی پہلے سے رومی حکومت سے ناراض تھے، اب انھوں نے روم دشمنی میں نئے فاتحین کا ساتھ دیا، اس چیز نے خسرو کی کامیابی کو بہت آسان بنادیا۔

فوکاس کی ناکامی دیکھ کر سلطنت کے کچھ امراء نے افریقہ کے رومی گورنر کے یہاں خاموش پیغام بھیجا کہ وہ ملک کو بچانے کی کوشش کرے۔ اس نے اپنے لڑکے ہرقل (Heraclius) کو اس مہم پر روانہ کیا، ہرقل سمندر کے راستہ سے فوج لے کر افریقہ سے روانہ ہوا، اور یہ ساری کارروائی اس قدر رازداری کے ساتھ انجام پائی کہ فوکاس کو اس وقت تک اس کی خبر نہیں ہوئی جب تک اس نے اپنے محل سے سمندر میں آتے ہوئے جہازوں کے نشانات نہیں دیکھ لیے، ہرقل معمولی لڑائی کے بعد دارالسلطنت پر قابض ہوگیا، اور فوکاس قتل کردیا گیا۔

ہرقل نے فوکاس کو تو ختم کردیا، مگر وہ ایرانی سیلاب کو روکنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ 616ء تک رومی دارالسلطنت سے باہر اپنی شہنشاہی کا تمام مشرقی اور جنوبی حصّہ کھو چکے تھے، عراق، شام فلسطین،

مصر، ایشیائے کوچک، ہر جگہ صلیبی علم کے بجائے درفش کاویانی لہرا رہا تھا، رومی سلطنت قسطنطنیہ کی چہار دیواری میں محدود ہو کر رہ گئی تھی، محاصرہ کی وجہ سے تمام راستے بند تھے، چنانچہ شہر میں قحط اور وبائی امراض نے پھیل کر مزید مصیبت پیدا کر دی، رومی سلطنت کے عظیم الشان درخت کا صرف تنا باقی رہ گیا تھا، اور وہ بھی خشک ہو رہا تھا، خود قسطنطنیہ کے اندر دشمن کے گھس آنے کا خوف تمام آبادی پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ تمام کاروبار بند تھے، وہ پبلک مقامات جہاں رات دن چہل پہل رہتی تھی، اب سنسان پڑے ہوئے تھے۔



جزیرۃ العرب اوراس کے پڑوسی ممالک

آتش پرست حکومت نے رومی علاقہ پر قبضہ کرنے کے بعد مسیحیت کو مٹانے کے لیے شدید ترین مظالم شروع کیے، مذہبی شعائر کی توہین شروع کی گئی، گرجا گھر مسمار کر دئے گئے، تقریباً ایک لاکھ عیسائیوں کو بے گناہ قتل کر دیا گیا ہر جگہ آتش کدے تعمیر کیے گئے اور مسیح کے بجائے آگ و سورج کی جبری پرستش کو رواج دیا گیا، مقدس صلیب کی اصل لکڑی جس کے متعلق

عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اس پر مسیح نے جان دی تھی وہ چھین کر مدائن پہنچادی گئی۔مورخ گبن کے الفاظ میں:

''اگر خسرو کے مقاصد واقعی نیک اور درست ہوتے تو وہ باغی فوکاس کے خاتمہ کے بعد رومیوں سے اپنے جھگڑے کو ختم کر دیتا اور افریقی فاتح کا اپنے بہترین ساتھی کی حیثیت سے استقبال کرتا جس نے نہایت خوبی کے ساتھ اس کے محسن ماریس کا انتقام لے لیا تھا،مگر جنگ کو جاری رکھ کر اس نے اپنے اصل کردار کو نمایاں کر دیا۔'' (گبن،ص74)

اس وقت ایرانی شہنشاہیت اور رومی سلطنت میں کیا فرق پیدا ہو چکا تھا اور ایرانی فاتح اپنے کو کتنا بڑا سمجھنے لگا تھا،اس کا اندازہ خسرو پرویز کے اس خط سے ہوتا ہے،جو اس نے بیت المقدس سے ہرقل کو لکھا تھا:

''سب خداؤں سے بڑا خدا،تمام روئے زمین کے مالک خسرو کی طرف سے اس کے کمینہ اور بے شعور بندے ہرقل کے نام،تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے خدا پر بھروسہ ہے،کیوں نہ تیرے خدا نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچالیا۔''

ان حالات نے قیصر روم کو بالکل مایوس کر دیا،اور اس نے طے کرلیا کہ اب وہ قسطنطنیہ چھوڑ کر بحری راستہ سے اپنی جنوبی افریقہ کی ساحلی قیام گاہ میں چلا جائے جو قرطاجنہ(Carthage) موجودہ تیونس میں واقع تھی،اب اس کے سامنے ملک کو بچانے کے بجائے اپنی ذات کو بچانے کا مسئلہ تھا— شاہی کشتیاں محل کی خزانوں سے لادی جا چکی تھیں،مگر عین وقت پر رومی کلیسا کے بڑے پادری نے اس کو مذہب کا واسطہ دے کر روکنے میں کامیابی حاصل کرلی،اور اس کو سینٹ صوفیا کی قربان گاہ پر لے گئے،اور اس کو آمادہ کیا کہ وہاں وہ اس بات کا عہد کرے کہ وہ اپنی اس رعایا کے ساتھ جیے گا یا مرے گا جس کے ساتھ خدا نے اس کو وابستہ کیا ہے(گبن،صفحہ75)۔اسی دوران میں ایرانی جنرل سین (Saine) نے تجویز کیا کہ ہرقل ایک صلح کا قاصد شہنشاہ ایران کی خدمت میں روانہ کرے،اس کو ہرقل اور اس کے مشیروں نے بڑی خوشی سے قبول کیا،مگر جب

شہنشاہ ایران خسرو پرویز کو اس کی خبر پہنچی تو اس نے کہا:

''مجھ کو یہ نہیں بلکہ خود ہرقل زنجیروں میں بندھا ہوا میرے تخت کے نیچے چاہیے، میں رومی حکمران سے اس وقت تک صلح نہیں کروں گا، جب تک وہ اپنے صلیبی خدا کو چھوڑ کر ہمارے سورج دیوتا کی پرستش نہ کرے۔'' (گبن، صفحہ 76)

تاہم چھ سالہ لڑائی نے بالآخر ایرانی حکمران کو مائل کیا کہ وہ فی الحال کچھ شرائط پر صلح کر لے، اس نے شرط پیش کی:

''ایک ہزار ٹالنٹ (یونانیوں اور رومیوں کا ایک قدیم وزن) سونا، ایک ہزار ٹالنٹ (Talent) چاندی، ایک ہزار ریشمی تھان، ایک ہزار گھوڑے، ایک ہزار کنواری لڑکیاں۔''

گبن ان شرائط کو بجا طور پر شرم ناک شرائط (ignominious terms) کہتا ہے، ہرقل یقیناً ان شرائط کو قبول کر لیتا، مگر جتنی کم مدت میں اور جس چھوٹے سے لٹے ہوئے علاقہ سے اس کو ان قیمتی شرائط کی تکمیل کرنی تھی، اس کے مقابلے میں اس کے لیے زیادہ قابل ترجیح بات یہ تھی کہ وہ انھیں ذرائع کو دشمن کے خلاف آخری حملہ کی تیاری کے لیے استعمال کرے۔

ایک طرف یہ واقعات ہو رہے تھے، دوسری طرف ایران و روم کے درمیان عرب کے مرکزی مقام ''مکہ'' میں ان واقعات نے ایک اور کشمکش پیدا کر دی تھی، ایرانی سورج دیوتا کو مانتے تھے، اور آگ کی پرستش کرتے تھے، اور رومی وحی و رسالت کے ماننے والے تھے، اس لیے نفسیاتی طور پر اس جنگ میں مسلمانوں کی ہمدردیاں رومی عیسائیوں کے ساتھ تھیں اور مشرکین مظاہر پرست ہونے کی وجہ سے مجوسیوں سے اپنا مذہبی رشتہ جوڑتے تھے، اس طرح روم و ایران کی کشمکش اس کشمکش کا ایک خارجی نشان بن گئی جو مکہ میں اہل اسلام اور کفار و مشرکین کے درمیان جاری تھی، دونوں گروہ سرحد پار کی اس جنگ کے انجام کو خود اپنی باہمی کشمکش کے انجام کی ایک علامت سمجھنے لگے، چنانچہ 616ء میں جب ایرانیوں کا غلبہ نمایاں ہو گیا اور رومیوں کے تمام مشرقی علاقے ایرانیوں کے قبضہ میں چلے گئے، اور اس کی خبریں مکہ پہنچیں تو اسلام کے مخالفین نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے

کہنا شروع کیا کہ دیکھو ہمارے بھائی تمھارے جیسا مذہب رکھنے والوں پر غالب آگئے ہیں، اسی طرح اپنے ملک میں بھی ہم تم کو اور تمھارے دین کو مٹا کر رکھ دیں گے، مکہ کے مسلمان جس بے بسی اور کمزوری کی حالت میں تھے، اس میں یہ الفاظ ان کے لیے زخم پر نمک کا کام کرتے تھے، عین اس حالت میں پیغمبر خدا کی زبان سے یہ الفاظ جاری کیے گئے:

غُلِبَتِ الرُّومُ ۔ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ ۔ فِي بِضْعِ سِنِينَ لِلَّهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ ۔ بِنَصْرِ اللَّهِ يَنْصُرُ مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۔ وَعْدَ اللَّهِ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ وَعْدَهُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (30:2-6) ۔یعنی رومی قریب کی زمین میں مغلوب ہو گئے ہیں مگر مغلوب ہونے کے بعد چند سال میں پھر وہ غالب آجائیں گے، پہلے اور پیچھے سب اختیار خدا کے ہاتھ میں ہے، اور اس دن مسلمان خدا کی مدد سے خوش ہوں گے وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے وہ غالب اور مہربان ہے خدا کا وعدہ ہے خدا اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

''اس وقت جب کہ یہ پیشین گوئی کی گئی''، گبن لکھتا ہے ''کوئی بھی پیشگی خبر اتنی بعید از وقوع نہیں ہو سکتی تھی، کیوں کہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال رومی سلطنت کے خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے'' (صفحہ 74)۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ پیشین گوئی ایک ایسی ذات کی طرف سے کی گئی تھی، جو تمام ذرائع و وسائل پر تنہا قدرت رکھتا ہے، اور انسانوں کے دل جس کی مٹھی میں ہیں، چنانچہ ادھر خدا کے فرشتے نے ایک امی کی زبان سے یہ خبر دی اور ادھر ہرقل قیصر روم میں ایک انقلاب آنا شروع ہو گیا، گبن لکھتا ہے۔

''تاریخ کے نمایاں کرداروں میں سے ایک غیر معمولی کردار وہ ہے، جو ہرقل کے اندر ہم دیکھتے ہیں، اپنے لمبے دور حکومت کے ابتدائی اور آخری سالوں میں یہ شہنشاہ سستی، عیاشی اور اوہام کا بندہ دکھائی دیتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی رعایا کی مصیبتوں کا ایک بے حس اور نامراد تماشائی ہے، مگر صبح و شام کا بے رونق کہر، دوپہر کے سورج سے کچھ دیر کے لیے چھٹ

جاتا ہے، یہی حال ہرقل کا ہوا، محل کا آرکیڈیس (۱) Arcadius یکا یک میدان جنگ کا سیزر Caesar بن (۲) گیا، اور روم کی عزت چھ جرأت مندانہ مہموں کے ذریعہ حاصل کرلی گئی۔ یہ رومی مورخین کا فرض تھا کہ وہ حقیقت سے پردہ اٹھاتے اور اس کی اس خواب اور بیداری کے وجوہ بیان کرتے، اتنے دنوں بعد اب ہم یہی قیاس کر سکتے ہیں کہ اس کے پیچھے کوئی سیاسی اسباب نہیں تھے، بلکہ یہ زیادہ تر اس کے شخصی جذبے کا نتیجہ تھا، اسی کے تحت اس نے اپنی تمام دلچسپیاں ختم کردیں، حتیٰ کہ اپنی بھانجی (Martina) کو بھی چھوڑ دیا جس سے اس کو اس قدر تعلق تھا کہ محرم ہونے کے باوجود اس کے ساتھ اس نے شادی کرلی تھی۔''

Gibbon, vol. 5, p. 76-77

وہی ہرقل جس کی ہمت پست ہوچکی تھی، اور جس کا دماغ اس سے پہلے کچھ کام نہیں کرتا تھا، اب اس نے ایک نہایت کامیاب منصوبہ بنایا، قسطنطنیہ میں بڑے عزم وانہماک کے ساتھ جنگی تیاریاں شروع ہوگئیں، تاہم اس وقت صورت حال ایسی تھی کہ 622ء میں جب ہرقل اپنی فوجیں لے کر قسطنطنیہ سے روانہ ہوا تو لوگوں نے سمجھا کہ دنیا رومن امپائر کا آخری تماشا دیکھ رہی ہے۔

ہرقل جانتا تھا کہ ایرانی حکومت سمندری طاقت میں کمزور ہے، اس نے اپنے سمندری بیڑے کو پشت سے حملہ کے لیے استعمال کیا، اس نے اپنی فوجیں بحر اسود کے راستے سے گزار کر آرمینیا میں اتاردیں اور وہاں عین اس مقام پر ایرانیوں کے اوپر ایک بھرپور حملہ کیا، جہاں سکندر اعظم نے اس وقت کی ایرانی سلطنت کو شکست دی تھی جب اس نے شام سے مصر تک اپنا مشہور مارچ کیا تھا، ایرانی اس غیر متوقع حملہ سے گھبرا گئے اور ان کے قدم اکھڑ گئے، مگر ابھی وہ ایشیائے کوچک میں زبردست فوج رکھتے تھے، وہ دوبارہ اس فوج سے حملہ کرتے اگر ہرقل نے اس کے بعد شمال کی جانب سمندر سے اسی قسم کی دوسری غیر متوقع چڑھائی نہ کی ہوتی، پھر وہ سمندر کے راستہ سے قسطنطنیہ

---

(۱) آرکیڈیس (408-378ء) رومی سلطنت کا ایک کمزور بادشاہ جو 395ء میں تخت نشین ہوا۔

(۲) جولیس سیزر 44۔102 ق م) عظیم رومی فوجی جنرل اور بادشاہ۔

واپس آیا،آواریوں (Avars) سے ایک معاہدہ کیااوران کی مدد سے ایرانیوں کوان کے دار السلطنت کے گردروک دیا،ان دوحملوں کے بعداس نےمزید تین مہمیں جاری کیں—

623ء میں، 624ء میں اور 625ء میں یہ مہمیں بحراسود کے جنوبی ساحل سے حملہ آور ہوکرایرانی قلمرو میں گھسیں اورمیسوپوٹامیا تک پہنچ گئیں،اس کے بعدایرانی جارحیت کا زورٹوٹ گیا، اورتمام رومی علاقے ایرانی فوجوں سے خالی ہوگئے،اب ہرقل خودایرانی شہنشاہیت کے قلب پرحملہ کرنے کی پوزیشن میں تھا،تاہم آخری فیصلہ کن جنگ دجلہ کے کنارے نینوا کے مقام پردسمبر 627ء میں ہوئی۔

اب خسروکی ہمت چھوٹ گئی تھی ،وہ اپنے محبوب محل ’’دستگرد‘‘ سے بھاگنے کی تیاری کرنے لگا۔مگراسی دوران میں خوداس کےمحل کے اندراس کے خلاف بغاوت ہوگئی۔اس کےلڑکےشیرویہ نے اس کوگرفتارکرکےایک تہہ خانے میں بندکردیا، جہاں وہ پانچویں دن بیکسی کی حالت میں مرگیا۔ اس کے اٹھارہ لڑکوں کواس کی آنکھ کے سامنےقتل کردیا گیا،مگراس کا یہ لڑکا بھی صرف آٹھ مہینے تخت پرره سکا۔ اس کے بعددوسرے شہزادے نے اس کوقتل کرکے تاج پرقبضہ کرلیا،اس طرح شاہی خاندان کے اندرآپس میں تلواریں چلناشروع ہوگئیں۔یہاں تک کہ چارسال میں نوبادشاہ بدلے گئے۔ان حالات میں ظاہرہے کہ ازسرنورومیوں کامقابلہ کرنے کا کوئی سوال نہیں تھا،خسروپرویز کے بیٹے قبادثانی نے رومی مقبوضات سے دست بردارہوکرصلح کرلی۔مقدس صلیب کی اصل لکڑی واپس کردی گئی،اورمارچ 628ء میں فاتح ہرقل اس شان سے قسطنطنیہ واپس آیا کہ اس کے رتھ کوچارہاتھی کھینچ رہے تھے، اوربے شمارلوگ دار السلطنت کے باہرلیمپوں اورزیتون کی شاخوں کولیے ہوئے اپنے ہیروکےاستقبال کے لیےموجود تھے۔(صفحہ 94)

اس طرح قرآن نے رومیوں کے دوبارہ غلبہ کےمتعلق جوپیشین گوئی کی تھی وہ ٹھیک اپنے وقت پر(دس سال کےاندر)مکمل طورپرپوری ہوگئی۔

گبن نے اس پیشین گوئی پرحیرت کااظہارکیاہے،مگراسی کے ساتھ اس کی اہمیت گھٹانے

کے لیے اس نے بالکل غلط طور پر اس کو خسرو کے نام آپ کے دعوت نامے کے ساتھ جوڑ دیا ہے، وہ لکھتا ہے:

''ایرانی شہنشاہ نے جب اپنی فتح مکمل کر لی تو اس کو مکہ کے ایک گمنام شہری کا خط ملا جس میں اس کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ محمد کو خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے تسلیم کرے، اس نے دعوت کو نامنظور کر دیا اور خط کو چاک کر دیا، رسول عربی کو جب یہ خبر ملی تو انھوں نے کہا: ''خدا اسی طرح خسرو کی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا اور اس کی طاقت کو برباد کر دے گا۔'' مشرق کی دو عظیم سلطنتوں کے عین کنارے بیٹھے ہوئے محمد ان دونوں حکومتوں کی باہمی تباہی سے اندر ہی اندر خوش ہوتے رہے اور ایرانی فتوحات کے درمیان میں انھوں نے پیشین گوئی کرنے کی جرأت کی کہ چند سال کے بعد فتح دوبارہ رومیوں کے جھنڈے کی طرف لوٹ آئے گی، اس وقت جب کہ یہ پیشین گوئی کی گئی، کوئی بھی پیشگی خبر اتنی بعید وقوع نہیں ہو سکتی تھی، کیوں کہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال رومی شہنشاہیت کے خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے۔''

Gibbon. pp.73-74

مگر اسلامی تاریخ کا ہر مورخ جانتا ہے کہ اس پیشین گوئی کا خسرو کے نام دعوت نامے سے کوئی تعلق نہیں، کیوں کہ شہنشاہ ایران کے نام اسلام کا دعوت نامہ ہجرت کے ساتویں سال صلح حدیبیہ کے بعد بھیجا گیا ہے، جو سَن عیسوی کے لحاظ سے 628ء ہوتا ہے، جب کہ رومیوں کی فتح کی پیشین گوئی ہجرت سے پہلے مکہ میں 216ء میں نازل ہوئی تھی۔ (اعجاز قرآن پر انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں مقالہ Quran جلد 1، صفحات 54، 541، 545 قابل ملاحظہ ہیں)

3۔ قرآن کی تیسری خصوصیت جس کو میں اس کی صداقت کے ثبوت میں پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ واقعہ ہے کہ قرآن باوجود یہ کہ علمی ترقی سے بہت پہلے نازل ہوا، اس کی کوئی بات آج تک غلط ثابت نہ ہو سکی، اگر یہ صرف ایک انسانی کلام ہوتا تو ایسا ہونا ناممکن تھا۔

چین کے نوجوان طلبہ کی ایک جماعت جو حکومت کے زیر اہتمام کیلی فورنیا یونیورسٹی میں تعلیم

حاصل کر رہی تھی، ان میں سے تقریباً بارہ افراد نے برکلے کے گرجا گھر میں جا کر پادری سے کہا کہ وہ ان کے لیے اتوار کے دن ایک کلاس کا انتظام کرے، چینی نوجوان نے نہایت صفائی سے کہا کہ انھیں ذاتی طور پر عیسائیت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، اور نہ وہ خود عیسائی بننا چاہتے ہیں، البتہ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس مذہب نے امریکی تمدن پر کیا اور کتنے اثرات ڈالے ہیں۔ پادری نے اس جماعت کی ہفتہ وار تعلیم کے لیے ریاضیات اور فلکیات کے ایک عالم (Peter W. Stoner) کو مقرر کیا، اس واقعہ کے چار مہینے بعد تمام نوجوانوں نے عیسائیت قبول کرلی، اس غیر معمولی تبدیلی کی وجہ کیا تھی، اس کو خود معلم کی زبان سے سنیے:

''میرے سامنے سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ اس طرح کے لوگوں کے سامنے مذہب کی کون سی بات رکھی جائے، کیوں کہ یہ نوجوان بائبل پر سرے سے ایمان ہی نہیں رکھتے، بائبل کی محض رواجی تعلیم بے فائدہ معلوم ہوتی تھی، اس وقت میرے ذہن میں ایک خیال آیا، میں نے اپنی تعلیم کے زمانے میں بائبل کے پہلے باب (کتاب پیدائش) اور سائنس میں بہت قریبی مناسبت پائی تھی میں نے فیصلہ کیا کہ اس جماعت کے سامنے یہی بات پیش کروں۔

میں اور طلبہ قدرتی طور پر اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ کائنات کی پیدائش کے متعلق یہ مواد زمین وآسمان کے بارے میں سائنس کی موجودہ معلومات حاصل ہونے سے ہزاروں سال پہلے لکھا گیا ہے، ہمیں یہ بھی احساس تھا کہ موسیٰ کے زمانے میں کائنات کے متعلق لوگوں کے جو خیالات تھے، اس کو موجودہ زمانے کی معلومات کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ نہایت لغو معلوم ہوں گے۔

ہم نے پورا موسم سرما کتاب پیدائش کے پہلے باب میں گزار دیا، طلبہ کام لے کر یونیورسٹی کی لائبریری میں چلے جاتے اور بڑی محنت کے ساتھ جوابات تیار کر کے لاتے، موسم سرما کے خاتمہ پر پادری نے مجھے بتایا کہ طلبا کی پوری جماعت اس کے پاس یہ کہنے کے لیے آئی تھی کہ وہ عیسائی بننا چاہتے ہیں، انھوں نے اقرار کیا کہ ان کے اوپر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ بائبل خدا کی الہامی کتاب ہے۔''

The Evidence of God, p.137-138

مثال کے طور پر زمین کی ابتدا کے بارے میں بائبل کی کتابِ پیدائش میں ہے:

''گہرائیوں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔''

Darkness was over the surface of the deep (Genesis 1)

یہ موجودہ معلومات کے مطابق اس وقت کی بہترین تصویر ہے، جب زمین ابھی گرم تھی اور اس کی گرمی کی وجہ سے پانی بخارات بن کر اڑ گیا تھا، اس وقت ہمارے تمام سمندر کثیف بادلوں کی شکل میں فضا میں معلق تھے، اور اس کی وجہ سے روشنی زمین کی سطح تک نہیں پہونچ پاتی تھی۔

ہمارا ایمان ہے کہ انجیل اور تورات اصلاً اسی طرح خدا کی کتابیں ہیں، جیسے قرآن خدا کی کتاب ہے، اس لیے ان میں علم الٰہی کے شرارے بلاشبہ موجود ہیں، مگر ان کتابوں کے اصل الفاظ محفوظ نہیں رہے، ہزاروں برس گزرنے کے بعد بائبل اب ہمارے سامنے ایک ایسی کتاب کی شکل میں ہے، جس میں کریسی ماریسن کے الفاظ میں ترجمہ (Translation) اور انسانی الحاق (Human Interpolation) کی وجہ سے اصل خدائی نسخہ کے مقابلے میں بہت فرق پیدا ہو چکا ہے۔

Man Does not stand Alone, p. 120

اس طرح یہ صحیفے پوری شکل میں اصل حیثیت کو کھو چکے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں کو منسوخ کر کے ہمارے لیے اپنی کتاب کا تصحیح شدہ ایڈیشن (قرآن) نازل کیا، قرآن اپنی صحت اور جامعیت کی وجہ سے بدرجہ اتم ان خصوصیات کا حامل ہے، جن کی صرف ایک جھلک اب کتب قدیمہ میں باقی رہ گئی ہے۔

یہاں میں قرآن کی اسی خصوصیت کو اس کی صداقت کی تیسری دلیل کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں قرآن باوجود یہ کہ علمی ترقی سے بہت پہلے نازل ہوا اس کی کوئی بات آج تک غلط ثابت نہ ہو سکی، اگر یہ انسانی کلام ہوتا تو ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔

قرآن ایک ایسے زمانے میں اترا جب انسان عالم فطرت کے بارے میں بہت کم جانتا

تھا، اس وقت بارش کے متعلق یہ تصور تھا کہ آسمان میں کوئی دریا ہے، جس سے پانی بہہ کر زمین پر گرتا ہے، اور اسی کا نام بارش ہے، زمین کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ وہ چپٹی فرش کی مانند ہے، اور آسمان اس کی چھت ہے جو پہاڑوں کی چوٹیوں کے اوپر کھڑی کی گئی ہے، ستاروں کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ چاندی کی چمکتی ہوئی کیلیں ہیں، جو آسمان کے گنبد میں جڑی ہوئی ہیں یا وہ چھوٹے چھوٹے چراغ ہیں، جو رات کے وقت رسیوں کی مدد سے لٹکائے جاتے ہیں، قدیم اہل ہند یہ سمجھتے تھے کہ زمین ایک گائے کی سینگ پر ہے، اور جب گائے زمین کو ایک سینگ سے دوسری سینگ پر منتقل کرتی ہے تو اس کے سر کی جنبش سے زلزلہ آجاتا ہے، کوپرنیکس (1473-1543) تک یہ نظریہ تھا کہ سورج ساکن ہے، اور زمین اس کے گرد گھوم رہی ہے۔

اس کے بعد علم کی ترقی ہوئی، انسان کے مشاہدے اور تجربے کی قوت بڑھ گئی جس کی وجہ سے بے شمار نئی معلومات حاصل ہوئیں، زندگی کا کوئی شعبہ اور علم کا کوئی گوشہ ایسا نہیں رہا جس میں پہلے کے مسلمات بعد کی تحقیق سے غلط ثابت نہ ہوگئے ہوں— اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈیڑھ ہزار برس پہلے کا کوئی بھی انسانی کلام ایسا نہیں ہوسکتا جو آج بھی اپنی صحت کو پوری طرح باقی رکھے ہوئے ہو— یوں کہ آدمی اپنے وقت کی معلومات کی روشنی میں بولتا ہے، وہ شعور کے تحت بولے یا لاشعور کے تحت، بہر حال وہ وہی کچھ دہرائے گا، جو اس نے اپنے زمانہ میں پایا ہو، چنانچہ ڈیڑھ ہزار برس پہلے کی کوئی بھی انسانی کتاب آج ایسی موجود نہیں ہے، جو غلطیوں سے پاک ہو — مگر قرآن کا معاملہ اس سے مختلف ہے، وہ جس طرح ڈیڑھ ہزار برس پہلے کے دور میں برحق تھا، آج بھی وہ اسی طرح برحق ہے، زمانے کے گزرنے سے اس کی صداقت میں کوئی فرق نہیں آیا، یہ واقعہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ یہ ایک ایسے ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے جس کی نگاہ ازل سے ابد تک محیط ہے— جو سارے حقائق کو اپنی اصل شکل میں جانتا ہے، جس کی واقفیت زمانے اور حالات کی پابند نہیں اگر یہ محدود نظر رکھنے والے انسان کا کلام ہوتا تو بعد کا زمانہ اسی طرح اس کو غلط ثابت کر دیتا، جیسے ہر انسانی کلام بعد کے زمانے میں غلط ہو چکا ہے۔

قرآن کا اصل موضوع اخروی سعادت ہے، اس لحاظ سے وہ دنیا کے معروف علوم وفنون میں سے کسی کی تعریف میں نہیں آتا، مگر اس کا مخاطب چوں کہ انسان ہے، اس لیے قدرتی طور پر وہ اپنی تقریروں میں ہر اس علم مس (touch) کو کرتا ہے جس کا تعلق انسان سے ہے، یہ ایک بہت نازک صورت حال ہے کیوں کہ آدمی اپنی گفتگو میں اگر کسی فن کو مس (touch) کر رہا ہے تو خواہ وہ اس پر کوئی تفصیلی کلام نہ کرے، اگر اس کی معلومات ناقص ہیں، تو یقینی طور پر وہ ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو صورت واقعہ سے ٹھیک ٹھیک مطابقت نہ رکھتے ہوں، مثلاً ارسطو نے عورت کی کمتری ثابت کرنے کے لیے یہ کہا کہ — ''اس کے منھ میں مرد سے کم دانت ہوتے ہیں۔'' ظاہر ہے کہ یہ بیان علم الاجسام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، یہ ایک ایسا بیان ہے جو علم الاجسام سے ناواقفیت کا ثبوت دیتا ہے۔ کیوں کہ یہ معلوم ہے کہ مرد اور عورت کے منہ میں دانت کی تعداد یکساں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، یہ حیرت انگیز بات ہے کہ قرآن اگرچہ مختلف انسانی علوم کو بیان کرتا ہے یا اس کی طرف اشارہ کرتا ہے، مگر اس کے بیانات میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں آنے پائی، جو بعد کی وسیع تر تحقیقات سے یہ ثابت کرے کہ یہ ایسے شخص کا کلام ہے، جس نے کم تر معلومات کی روشنی میں اپنی باتیں کہیں تھیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بالاتر ہستی کا کلام ہے، جو اس وقت بھی جانتا تھا، جب کوئی نہیں جانتا تھا، اور ان چیزوں کو بھی جانتا تھا، جس سے اب تک لوگ ناواقف ہیں۔

یہاں میں مختلف علوم سے متعلق چند مثالیں دوں گا جس سے اندازہ ہوگا کہ ایک علم کو مس (touch) کرتے ہوئے بھی قرآن کس طرح حیرت انگیز طور پر ان صداقتوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، جو قرآن کے نزول کے وقت معلوم شدہ نہیں تھیں، بلکہ بعد کو دریافت ہوئیں۔

اس بحث سے پہلے بطور تمہید یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ جدید تحقیقات سے قرآنی الفاظ کی مطابقت اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ یہ تحقیقات متعلقہ واقعہ کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو چکی ہیں، اور اس طرح مادی کائنات کے بارے میں قرآن کے اشاراتی الفاظ کی تفسیر کے لیے ہم کو ضروری مواد حاصل ہو گیا ہے، اب اگر مستقبل کا مطالعہ کسی موجودہ تحقیق کو مکمل طور پر یا جزئی طور پر غلط ثابت

کردے تو اس سے کسی بھی درجہ میں قرآن کی تغلیط نہیں ہوگی، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ قرآن کے مجمل اشارہ کے تفصیلی تعین میں غلطی ہوگئی تھی، ہم کو یقین ہے کہ آئندہ کی صحیح تر معلومات قرآن کے اشاراتی الفاظ کو زیادہ صحیح طور پر واضح کرنے والی ہوں گی، وہ کسی اعتبار سے اس سے مختلف نہیں ہوسکتیں۔

اس سلسلے میں قرآن کے جو بیانات ہیں، ان کو ہم دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک وہ جو ان امور سے متعلق ہے، جن کے متعلق انسان کو نزول قرآن کے وقت کسی قسم کی معلومات حاصل نہیں تھیں۔ اور دوسرے وہ جن کے متعلق وہ سطحی اور ظاہری معلومات رکھتا تھا۔

کائنات کی بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کے متعلق دورِ سابق کے لوگ کچھ نہ کچھ جانتے تھے — مگر ان کا یہ علم ان دریافتوں کے مقابلے میں بے حد ناقص اور ادھورا تھا، جو بعد کے زمانے میں علمی ترقی کے دور میں انسان کے سامنے آئیں۔ قرآن کی مشکل یہ تھی کہ وہ کوئی سائنسی کتاب نہیں تھی، اس لیے اگر وہ عالم فطرت کے بارے میں یکا یک نئے نئے انکشافات لوگوں کے سامنے رکھنا شروع کر دیتا تو انھیں چیزوں پر بحث چھڑ جاتی اور اس کا اصل مقصد — انسان کی اصلاح — پس پشت چلا جاتا، یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس نے علمی ترقی سے بہت پہلے کے زمانے میں اس طرح کی چیزوں پر کلام کیا، اور ان کے بارے میں ایسے الفاظ ستعمال کیے جس میں دورِ سابق کے لوگوں کے لیے کنفیوزن کا کوئی سامان نہیں تھا، اور اسی کے ساتھ بعد کے انکشافات کا بھی وہ پوری طرح احاطہ کیے ہوئے تھے۔

(الف) قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر پانی کا ایک خاص قانون بیان کیا گیا ہے:

ایک مقام پر یہ الفاظ ہیں:

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَحْجُورًا (25:53)۔ یعنی اور وہی ہے جس نے ملائے دو دریا، ایک کا پانی میٹھا خوش گوار ہے اور ایک کا کھاری تلخ، اور دونوں کے درمیان ایک آڑ (barrier) رکھ دی۔

دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں:

وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا (27:61)۔ یعنی دو سمندروں کے درمیان آڑ ڈال دیا۔

سورہ الرحمٰن میں یہ الفاظ ہیں:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ۔ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيَانِ (55:19-20)۔یعنی اس نے چلائے دو دریا ملتے ہوئے دونوں کے درمیان ایک آڑ ہے، جس سے وہ تجاوز نہیں کر سکتے۔

ان آیات میں جس مظہر قدرت کا ذکر ہے، وہ قدیم ترین زمانے سے انسان کو معلوم تھا، وہ یہ کہ دو دریاؤں کے پانی باہم مل کر بہتے ہیں تو وہ ایک دوسرے میں شامل نہیں ہوجاتے مثال کے طور پر چاٹگام (بنگلہ دیش) سے لے کر ارکان (برما) تک دو دریا مل کر بہتے ہیں، اور اس پورے سفر میں دونوں کا پانی بالکل الگ الگ نظر آتا ہے، دونوں کے بیچ میں ایک دھاری سی برابر چلی گئی ہے، ایک طرف کا پانی میٹھا اور دوسری طرف کا کھاری۔ اسی طرح سمندر کے ساحلی مقامات پر جو دریا بہتے ہیں، ان میں سمندر کے اثر سے برابر مدوجزر (جوار بھاٹا) آتا رہتا ہے، مد کے وقت جب سمندر کا پانی ندی میں آجاتا ہے تو میٹھے پانی کی سطح پر کھاری پانی بہت زور سے چڑھ جاتا ہے، لیکن اس وقت بھی دونوں پانی الگ الگ رہتے، اوپر کھاری رہتا ہے، نیچے میٹھا، اس کے بعد جب جزر ہوتا ہے تو اوپر سے کھاری پانی اتر جاتا ہے، اور میٹھا پانی جوں کا توں رہتا ہے، الٰہ آباد میں گنگا اور جمنا کے سنگم کے مقام پر میں نے خود دیکھا کہ دونوں دریا ملنے کے باوجود الگ الگ بہتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور درمیان میں ایک لکیر مسلسل چلی گئی ہے۔

یہ بات قدیم ترین زمانے سے انسان کے مشاہدے میں آچکی ہے، مگر یہ واقعہ کس قانون فطرت کے تحت واقع ہوتا ہے، یہ ابھی حال میں دریافت کیا گیا ہے، جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ رقیق اشیا میں سطح کا تناؤ (Surface Tension) کا ایک خاص قانون ہے، اور یہی دونوں قسم کے پانی کو الگ الگ رکھتا ہے — چوں کہ دونوں سیالوں کا تناؤ (tension) مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے وہ دونوں کو اپنی اپنی حد میں رکھتا ہے۔ قرآن (55:20) نے اس فطری قانون کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيَانِ'' (دونوں کے درمیان ایک آڑ ہے جس سے وہ آگے نہیں بڑھتے)۔ یہ الفاظ بول کر قرآن نے اس فطری قانون کی ایسی تعبیر کی ہے، جو قدیم مشاہدے کے اعتبار سے بھی

ٹکرانے والی نہیں تھی، اوراب جدید دریافت اوربھی واضح ہوجاتی ہے۔کیوں کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ برزخ (آڑ) سے مرادسطح کا تناؤ (Surface Tension) ہے،جودونوں قسم کے پانی کے درمیان پایا جاتا ہے،اورجودونوں کومل جانے سے روکے ہوئے ہے۔

سطحی تناؤ کے قانون کوایک سادہ سی مثال سے سمجھیے،اگرآپ گلاس میں پانی بھریں تووہ کنارے تک پہنچ کرفوراً بہنے نہیں لگے گا، بلکہ ایک سوت کے بقدراٹھ کرگلاس کے کناروں کےاوپر گولائی میں ٹھہرجائے گا،یہی وہ چیز ہےجس کوشاعرنے”خط پیمانہ“ کہا ہے:

اندازۂ ساقی تھا کس درجہ حکیمانہ ساغر سے اٹھیں موجیں بن کرخط پیمانہ

گلاس کے کناروں کےاوپر پانی کی جومقدارہوتی ہے،وہ کیسے ٹھہرتی ہے۔بات یہ ہے کہ رقیق اشیا کی سطح کے سالمات (Molecules) کے بعد چوں کہ کوئی چیز نہیں ہوتی اس لیے ان کارخ اندر کی طرف ہوجاتا ہے،اس طرح کے سالمات کے درمیان کشش اتصال بڑھ جاتی ہے،اورقانون اتصال (Cohesion) کےعمل کی وجہ سے پانی کی سطح کے اوپرایک قسم کی لچک دارجھلی (Elastic Film) سی بن جاتی ہے،اور پانی گویااس کے غلاف میں اس طرح ملفوف



پانی کے جوقطرے دکھائی دے رہے ہیں،وہ سرفیس ٹینشن کی وجہ سے ہیں۔

ہو جاتا ہے، جیسے پلاسٹک کی سفید جھلی میں پسا ہوا نمک ملفوف ہوتا ہے، سطح کا یہی پردہ اوپر ابھرے ہوئے پانی کو روکتا ہے، یہ پردہ اس حد تک قوی ہوتا ہے کہ اس کے اوپر سوئی ڈال دی جائے تو وہ ڈوبے گی نہیں، بلکہ پانی کی سطح پر تیرتی رہے گی۔اسی کو سطح کا تناؤ (Surface Tension) کہا جاتا ہے، اور یہی وہ ''آڑ'' یا فطری قانون ہے جس کی بنا پر تیل اور پانی ایک دوسرے میں گھلتا ملتا نہیں، اور یہی وہ ''آڑ'' ہے، جس کی وجہ سے کھاری پانی اور میٹھے پانی کے دو دریا مل کر بہتے ہیں مگر ایک کا پانی دوسرے میں شامل نہیں ہوتا۔

(ب) قرآن میں آیا ہے:

اللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (13:2)۔یعنی اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا، بغیر ایسے ستونوں کے جنھیں تم دیکھ سکو۔

دورِ قدیم کے انسان کے لیے یہ الفاظ اس کے ظاہری مشاہدے کے عین مطابق تھے۔کیوں کہ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے سر کے اوپر سورج، چاند اور ستاروں کی ایک دنیا کھڑی ہے، مگر کہیں اس کا پایہ اور کھمبا نظر نہیں آتا اور اب جدید ترین معلومات رکھنے والے انسان کے لیے بھی اس میں مکمل معنویت موجود ہے، کیوں کہ جدید ترین مشاہدہ بتاتا ہے کہ اجرام سماوی ایک لامحدود خلا میں بغیر کسی سہارے کے قائم ہیں، اور ایک ''عمد غیر مرئی''، یعنی کشش ثقل (gravitational pull) ان کو بالائی فضا میں سنبھالے ہوئے ہے۔

(ج) اسی طرح سورج اور تمام ستاروں کے بارے میں کہا گیا ہے:

كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (21:33)۔یعنی سب کے سب ایک آسمان میں تیر رہے ہیں۔

دور قدیم میں بھی انسان اجرام سماوی کو حرکت کرتا ہوا دیکھتا تھا، اس لیے ان الفاظ سے اس کو توحش نہیں ہوا، مگر جدید معلومات نے ان الفاظ کو اور زیادہ بامعنی بنا دیا ہے، بسیط اور لطیف خلا میں اجرام سماوی کی گردش کے لیے ''تیرنے'' سے بہتر کوئی تعبیر نہیں ہوسکتی۔

(د) رات اور دن کے متعلق قرآن میں ہے:

يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا (7:54) ۔یعنی اللہ اوڑھاتا ہے رات پر دن کہ وہ اس کے پیچھے لگا آتا ہے دوڑتا ہوا۔

یہ الفاظ قدیم انسان کے لیے صرف رات دن کی ظاہری آمدورفت کو بتاتے تھے، مگر اس میں نہایت عمدہ اشارہ زمین کی محوری گردش کی طرف بھی موجود ہے، جو جدید مشاہدے کے مطابق رات اور دن کی تبدیلی کی اصل وجہ ہے، یہاں میں یاد دلاؤں گا کہ روس کے پہلے خلائی مسافر نے خلا سے واپسی کے بعد اپنے جو مشاہدات بیان کیے تھے، اس میں ایک یہ بھی تھا کہ زمین کو اس نے اس شکل میں دیکھا کہ سورج کے سامنے محوری گردش کی وجہ سے اس کے اوپر اندھیرے اور اجالے کی آمدورفت کا ایک تیز تسلسل (rapid succession) جاری تھا۔اس طرح کے بیانات قرآن میں کثرت سے موجود ہیں۔

دوسری مثالیں وہ ہیں، جن کے متعلق پچھلے زمانے کے لوگ قطعاً کوئی معلومات نہیں رکھتے تھے۔قرآن نے ان کا ذکر کیا، اور ایسی باتیں کہیں جو حیرت انگیز طور پر جدید انکشافات سے صحیح ثابت ہوتی ہیں، یہاں میں مختلف علمی شعبوں سے اس کی چند مثالیں پیش کروں گا۔

فلکیات

قرآن میں کائنات کے آغاز وانجام کو بیان کیا گیا ہے۔یہ تصور سو برس پہلے تک انسان کے لیے بالکل نامعلوم تھا اور نزول قرآن کے زمانے میں تو اس کا تصور بھی کسی ذہن میں نہیں گزر سکتا تھا۔ مگر جدید مطالعہ نے حیرت انگیز طور پر اس کی تصدیق کی ہے، آغاز کائنات کے بارے میں قرآن کا بیان یہ ہے: أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا (21:30)۔ یعنی کیا منکرین نہیں دیکھتے کہ زمین وآسمان دونوں ملے ہوئے (مُنضم الاجزاء) تھے، پھر ہم نے اس کو پھاڑ دیا۔

اور اس کا انجام یہ بتایا گیا ہے: يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ (21:104) ۔یعنی اس دن لپیٹ دیں گے ہم آسمان کو جیسے لپیٹتے ہیں طومار (scroll) میں کاغذ۔

ان الفاظ کے مطابق کائنات ابتدا میں ایک سمٹی ہوئی حالت میں تھی، اور اس کے بعد پھیلنا

شروع ہوئی، اس پھیلاؤ کے باوجود اس کا اصل مادہ اتنا کم ہے کہ تھوڑی سی جگہ میں اس کو دوبارہ سمیٹا جاسکتا ہے۔

کائنات کے بارے میں جدید ترین تصور یہی ہے، مختلف قرائن اور مشاہدات کی بنیاد پر سائنسداں اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ ابتدا میں کائنات کا مادہ جامد اور سکون کی حالت میں تھا، یہ ایک بہت ہی سخت سکڑی ہوئی اور گھٹی ہوئی انتہائی گرم گیس تھی، تقریباً پچاس کھرب سال پہلے ایک زبردست دھماکے سے وہ پھٹ پڑی اور اس کے ساتھ ہی اس کے ٹوٹے ہوئے اجزاء چاروں طرف پھیلنے لگے، جب ایک بار پھیلاؤ شروع ہوگیا تو اس کا جاری رہنا لازمی تھا، کیوں کہ اجزائے مادہ جیسے جیسے دور ہوں گے، ان کا باہمی کشش کا اثر ایک دوسرے پر کم ہوتا جائے گا، آغاز میں کائنات کا جو مادہ تھا، اس کے مکانی دائرہ کا اندازہ تقریباً ایک ہزار ملین سالِ نور ہے اور اب پروفیسر ایڈنگٹن کے اندازے کے مطابق وہ سابقہ دائرہ کے مقابلے میں تقریباً دس گنا بڑھ چکا ہے(۱)۔ یہ عمل توسیع مسلسل جاری ہے، پروفیسر ایڈنگٹن کے الفاظ میں— ''ستاروں اور کہکشاؤں کی مثال ایک ایسے ربر کے غبارے کی سطح کے نشانات کی سی ہے جو مسلسل پھیل رہا ہو، اسی طرح اپنی ذاتی حرکت کے ساتھ تمام خلائی کرّے کائناتی پھیلاؤ کے ساتھ ہر آن دور ہوتے جارہے ہیں۔''

'We can picture the stars and galaxies,' says Professor Eddington, 'as embedded in the surface of a rubber balloon

---

(۱) امریکن اسپیس ایجنسی ناسا کے مطابق —

How Big is the Universe: No one knows if the universe is infinitely large, or even if ours is the only universe there is. Although our view of the universe is limited, our imaginations are not. Astronomers have indirect evidence that the universe of galaxies extends far beyond the region we can see. But no one knows if the whole universe is infinitely large—large beyond limit. According to the leading theories, other parts of the universe may look very different from our own—and may even have different laws of nature. We may never be able to find out for sure. But it is possible that clues to the answer lie in plain view, just waiting to be discovered!

www.lweb.cfa.harvard.edu/seuforum/howfar/howbig.html (accessed: 30.03.2021)

which is being steadily inflated; so that apart from their individual motions and the effects of their ordinary gravitational attraction on one another, celestial objects are becoming farther and farther apart simply by the inflation.

The Limitations of Science, 1938, England, p. 27

دوسری بات بھی جدید ترین مطالعہ سے کائنات کے ڈھانچے کے عین مطابق ثابت ہوئی ہے، قدیم انسان یہ سمجھتا تھا کہ ستارے اتنے ہی فاصلوں پر ہیں جیسے کہ وہ بظاہر نظر آتے ہیں، مگر اب معلوم ہوا کہ وہ دوری کی وجہ سے قریب دکھائی دیتے ہیں، ورنہ وہ ایک دوسرے سے بے انتہا بعید فاصلے پر واقع ہیں، اور یہی نہیں بلکہ وہ اجسام جو بظاہر سالم نظر آتے ہیں، ان کا بھی ایک بڑا حصہ درحقیقت خلا ہے، جس طرح شمسی نظام میں بہت سارے سیارے اور سیارچے ایک دوسرے سے دور دور فاصلوں پر رہتے ہوئے ایک نظام کے تحت گردش کرتے ہیں، اسی طرح ہر مادی جسم چھوٹے پیمانے کے بے شمار شمسی نظاموں کا مجموعہ ہے، جن کو "ایٹم" کہتے ہیں، نظام شمسی کا خلا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں، مگر ایٹمی نظام کا خلا، انتہائی چھوٹا ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتا- گویا ہر چیز، خواہ وہ بظاہر ٹھوس نظر آرہی ہو، اندر سے کھوکھلی ہے۔ مثلاً چھ فٹ لمبے چوڑے انسان کا جسم جن ایٹموں کا مجموعہ ہے، ان کے الکٹران اور پروٹان کو اگر اس طرح ملا دیا جائے کہ ان کے درمیان خلا یا مکان (Space) باقی نہ رہے تو اس کی حقیقت صرف ایک ایسے دھبہ (spot) کی ہوگی، جس کو صرف خوردبین (microscope) سے دیکھا جاسکے۔

اسی طرح فلکی طبیعیات کے ماہرین (Astrophysicists) نے کائنات میں پھیلے ہوئے پورے مادہ کا حساب لگایا ہے، ان کا کہنا ہے:

"If all this were squeezed without leaving any space,the size of the universe will be only thirty times the size of the sun."

یعنی اگر سارے کائنات کو اس طرح سمیٹ دیا جائے کہ اس میں خلا باقی نہ رہے تو سب کا حجم موجودہ سورج سے صرف 30 گنا زیادہ ہوگا، جب کہ کائنات کی وسعت کا یہ حال ہے کہ شمسی نظام سے

بعید ترین کہکشاں جواب تک دیکھی جاسکی ہے، وہ سورج سے کئی ملین سال نور کے فاصلے پر واقع ہے۔

دور جدید کے ماہرین فلکیات (astronomers) اپنے مشاہدات (observations) اور ریاضیاتی اندازے (mathematical estimate) کی بنا پر اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ اجرام سماوی (astronomical object) جس قانون کے تحت گردش کر رہے ہیں، اس کے مطابق مستقبل میں ایک وقت آنے والا ہے، جب چاند زمین کے بہت قریب آجائے گا، اور دوطرفہ کشش کی تاب نہ لاکر پھٹ جائے گا اور اس کے ٹکڑے زمین کے گرد فضا میں پھیل جائیں گے۔

Man does not Stand Alone, p.34

''شق قمر'' کا یہ واقعہ اسی قانون کشش کے تحت ہوگا، جس کا مظاہرہ جوار بھاٹے کی شکل میں سمندروں میں ہوتا رہتا ہے، چاند بالائی فضا میں ہمارا قریب ترین ہمسایہ ہے، یعنی زمین سے اس کا فاصلہ صرف دولاکھ چالیس ہزار میل ہے، اس قربت کی وجہ سے اس کی کشش کا اثر سمندروں پر پڑتا ہے، اور دن میں دوبار پانی اوپر اٹھ کر غیر معمولی تموج پیدا کرتا ہے، یہ موجیں بعض مقامات پر ساٹھ فٹ کے قریب اوپر تک اٹھ جاتی ہیں، اور خشکی کی سطح بھی اس قمری کشش سے چندانچ تک متاثر ہوتی ہے، چانداور زمین کا موجودہ فاصلہ بہت مناسب مقدار پر ہے، اور اس کے بہت سے فوائد ہیں، اس کے بجائے اگر یہ فاصلہ گھٹ جائے مثلاً پچاس ہزار میل پر آجائے تو سمندروں میں اس شدت سے طوفان برپا ہو کہ خشکی کا بیشتر حصہ اس میں غرق ہوجائے اور طوفانی موجوں کے مسلسل ٹکراؤ سے پہاڑ کٹ کر ریزے ریزے ہوجائیں، اور زمین اس کی کشش سے پھٹنے لگے۔

ماہرین فلکیات کا اندازہ ہے کہ زمین کی ابتدائی پیدائش کے وقت چانداسی طرح زمین کے قریب تھا، اور اس وقت زمین کی سطح پر یہ سب کچھ ہوچکا ہے، اس کے بعد فلکیاتی قانون نے اسے موجودہ دوری پر پہنچادیا، ان کا خیال ہے کہ ایک بلین سال تک یہ صورت باقی رہے گی، اور اس کے بعد یہی فلکی قانون دوبارہ چاند کو زمین کے قریب لائے گا، اور اس وقت زمین اور چاند کی باہمی کشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چاند پھٹ جائے گا اور ٹکڑے ہوکر زمین کے گرد ایک حلقہ کی شکل میں پھیل جائے گا۔

یہ نظریہ حیرت انگیز طور پر اس پیشین گوئی کی تصدیق ہے، جو قرآن میں آیا ہے، یعنی قیامت جب قریب آئے گی تو چاند پھٹ جائے گا اور اس کا پھٹنا قرب قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت ہوگا(۱)۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں: اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۔ وَإِنْ يَرَوْا آيَةً يُعْرِضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُسْتَمِرٌّ (54:1-2)۔ یعنی قیامت نزدیک آ گئی اور چاند پھٹ گیا اور یہ لوگ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔

ارضیات

پہاڑوں کے بارے میں قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کہا گیا ہے کہ وہ زمین کا توازن برقرار رکھنے کے لیے ہیں، مثلاً فرمایا: وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ (31:10)۔ یعنی اور زمین میں پہاڑ بنا دیے، تا کہ زمین تم کو لے کر جھک نہ پڑے۔

ان الفاظ کے نزول کے پورے تیرہ سو برس تک انسانی علم پہاڑوں کی اس حیثیت کے بارے میں بالکل بے خبر تھا۔ مگر اب جغرافیہ اس سے آشنا ہو چکا ہے، اور جدید جغرافیائی اصطلاح میں اس کو توازن (Isostasy) کہا جاتا ہے اگر چہ اس سلسلے میں انسان کا علم ابھی ابتدائی منزل میں ہے، تاہم انگلن کے الفاظ میں ''یہ سمجھا جاتا ہے کہ زمین کی سطح پر جو ہلکا مادہ تھا، وہ پہاڑوں کی شکل میں ابھرا آیا اور جو بھاری مادہ تھا، وہ گہری خندقوں کی صورت میں دب گیا جن میں اب سمندر کا پانی بھرا ہوا ہے، اس

(۱) شق قمر کا مسئلہ قدیم مفسرین و متکلمین سے لے کر اب تک شدید بحث کا موضوع رہا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ قیامت کے قریب ہوگا (قَالَ بَعْضُ الْمُفَسِّرِينَ الْمُرَادُ سَيَنْشَقُّ ، تفسیر کبیر، جلد 29، صفحہ 288)۔ اس دوسرے گروہ میں امام حسن بصری بھی شامل ہیں جن کا قول ابوحیان اندلسی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے: إذ جَاءَتِ السَّاعَةُ انْشَقَّ الْقَمَرُ بَعْدَ النَّفْخَةِ الثَّانِيَةِ (البحر المحیط، جلد 10، صفحہ 33)۔ یعنی ''اقتربت الساعۃ وانشق القمر'' کا مطلب یہ ہے کہ جب قیامت قریب آئے گی تو چاند پھٹ جائے گا اور یہ واقعہ دوسری بار صور پھونکے جانے کے بعد ہوگا۔ ابومنصور الماتریدی نے اپنی تفسیر میں یہ قول نقل کیا ہے: لم يكن انشقاق القمر بعد، ولكن يكون في المستقبل، وعند قيام الساعة (تفسیر الماتریدی، جلد 9، صفحہ 441)۔ یعنی شق قمر کا واقعہ ابھی تک پیش نہیں آیا ہے، یہ مستقبل میں پیش آئے گا، جب قیامت آئے گی۔

طرح ابھار اور دباؤ نے مل کر زمین کا توازن برقرار رکھا ہے۔''

O. R. Van Engeln, *Geomorphology*, New York 1948, p.26-27

ایک اور مصنف لکھتا ہے:

''جیسے خشکی پر وادیاں ہیں، اسی طرح سمندر کے نیچے بھی وادیاں ہیں، مگر سمندر کی تہہ کی اکثر وادیاں زیادہ گہری اور انسان کے تجرباتی دائرہ کے لحاظ سے بہت دور ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی غیر معمولی دباؤ سے سمندروں میں گہرے غار ہو گئے ہیں۔ یہ وادیاں سمندر سے 35 ہزار فٹ تک گہری ہیں، یہ گہرائی کسی بھی پہاڑ کی بلندی سے زیادہ ہے، بعض مقامات پر یہ گھاٹیاں اتنی گہری ہیں کہ اگر زمینی پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی ماونٹ ایورسٹ کو جو 29031.7 فٹ بلند ہے، وہاں ڈال دیا جائے تو اس کے اوپر ایک میل کی اونچائی تک پانی بہتا رہے گا۔ حیرت یہ ہے کہ یہ سمندری خندقیں (oceanic trenches) دو سمندر کے درمیان واقع ہونے کے بجائے خشکی کے قریب قریب پائی جاتی ہیں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون سا عظیم دباؤ تھا، جس نے سمندر کی تہہ میں یہ زبردست غار پیدا کر دیے، مگر جزائری سلسلوں اور آتش فشاں پہاڑوں سے ان کی قربت ظاہر کرتی ہے کہ پہاڑی بلندیوں اور سمندری خندقوں میں کوئی باہمی تعلق ہونا چاہیے، گویا کہ زمین اونچائی اور گہرائی کے ذریعہ اپنے توازن (balance) کو قائم رکھتی ہے، جغرافیہ کے بعض مستند علما کا خیال ہے کہ سمندری گہرائیاں آئندہ ابھرنے والے خشکی کی علامتیں ہوسکتی ہیں، کیوں کہ پانی کے نیچے ان اندھیرے غاروں میں صدیوں سے بہہ بہہ کر خشکی اور سمندر کی تہہ کی گاد (sediment) تہہ بہ تہہ جمع ہو رہی ہے، اور میلوں پاٹتی چلی جا رہی ہے، اس لیے کسی وقت عدم توازن کی بنا پر ہوسکتا ہے کہ سمندر کے نیچے اتھاہ گہرائیوں میں جمع ہونے والے مادے کا دباؤ پڑنے سے نئے پہاڑ ابھر آئیں یا نئے جزائری سلسلے پیدا ہو جائیں، ساحل کے بعض پہاڑوں میں اس طرح کی سمندری گاد کے نشانات پائے جاتے ہیں، مگر انسان کی موجودہ معلومات کے

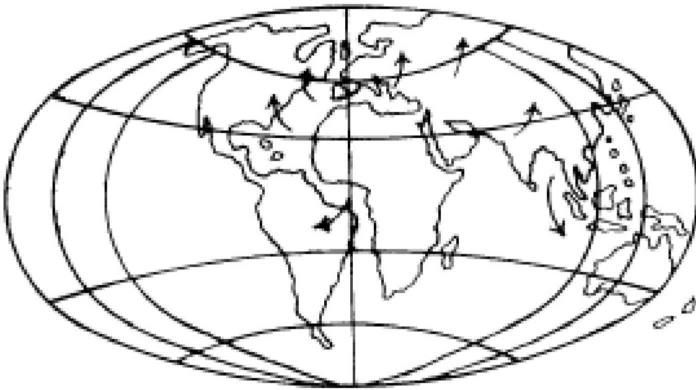
دائرے میں کوئی بھی نظریہ سمندری خندقوں کی مکمل توجیہ نہیں کرتا، یہ دائمی سرد اور دائمی تاریک غار جو فی مربع انچ سات ٹن بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں، وہ ابھی انسان کے لیے سمندر کے دوسرے معمّوں میں سے ایک معمّا ہیں۔''

The World We Live In, New York 1965

اسی طرح قرآن میں یہ کہا گیا ہے کہ زمین پر ایک وقت ایسا گزرا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو پھاڑ کر پھیلا دیا: وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَٰلِكَ دَحَاهَا ۔ أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَهَا وَمَرْعَاهَا (79:30-31)۔ یعنی اس کے بعد خدا نے زمین کو پھیلایا اور اس میں سے اس کا پانی اور چارہ نکالا۔

یہ الفاظ جدید ترین نظریۂ انتشار براعظم (Theory of Drifting Continents) کے عین مطابق ہیں، اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے تمام براعظم کسی زمانے میں ایک بڑی زمین کے حصّے تھے، اس کے بعد وہ پھٹ کر سطح زمین پر اِدھر اُدھر پھیل گئے اور بھرے ہوئے سمندروں کے اردگرد براعظموں کی ایک دنیا آباد ہوگئی۔

اس نظریے کو پہلی بار باقاعدہ طور پر 1915ء میں ایک جرمن ماہر ارضیات الفرڈ ویگنر (Alfred Wegener) نے پیش کیا، اس کی دلیل یہ تھی کہ براعظموں کو اگر قریب کیا جائے تو وہ سب کے سب جگسا پزل (Jigsaw Puzzle) کی طرح آپس میں جڑ جاتے ہیں۔ مثلاً جنوبی امریکا کا مشرقی ساحل افریقہ کے مغربی ساحل سے مل رہا ہے۔



اس قسم کی اور بھی بہت سے مشابہتیں ہیں جو وسیع سمندروں کے دونوں طرف پائی گئی ہیں۔ مثلاً ایک قسم کے پہاڑ یکساں ارضیاتی سال کی چٹانیں، ایک قسم کے جانور اور مچھلیاں اور ایک طرح کے پودے۔ چنانچہ علم نباتات کا ماہر پروفیسر رونالڈ گڈ (Ronald Good) اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

''نباتات کے ماہرین کا تقریباً متفقہ نظریہ ہے کہ مختلف پودے جو زمین کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں، ان کی توجیہ اس کے بغیر نہیں ہوسکتی کہ ہم یہ فرض کریں کہ زمین کے ٹکڑے ماضی میں کبھی باہم ملے ہوئے تھے۔''

Geography of the Flowering Plants

اب تو حجری کشش (Fossil Magnetism) سے تصدیق حاصل ہونے کے بعد اس کو قطعی سائنسی نظریہ کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، پتھر کے ذرات کے رخ کا مطالعہ کر کے یہ معلوم کرلیا جاتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں اس کی چٹان کا عرض البلد اور طول البلد کیا تھا، اس مطالعہ سے معلوم ہوا کہ زمین کے موجودہ ٹکڑے ماضی میں ان مقامات پر نہیں تھے، جہاں وہ آج نظر آتے ہیں، بلکہ ٹھیک ان مقامات پر تھے، جہاں براعظموں کے انتشار کا نظریہ تقاضا کرتا ہے، امپیریل کالج (لندن) میں فزکس کے استاد پروفیسر پی۔ ایم۔ ایس۔ بلیکٹ (Patrick Maynard Stuart Blackett, 1897-1974) نے کہا ہے:

''ہندستانی پتھر کی پیمائش یقینی طور پر بتاتی ہے کہ 70 ملین سال پہلے ہندستان خط استوا کے جنوب میں واقع تھا، جنوبی افریقہ کی چٹانوں کا مشاہدہ ثابت کرتا ہے کہ افریقی براعظم تین سو ملین سال پہلے قطب جنوبی سے ٹوٹ کر نکلا ہے۔'' (ریڈرز ڈائجسٹ، جون 1961ء)

اوپر ہم نے جو آیت نقل کی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے ''دحو'' کا لفظ استعمال کیا ہے، دحو کے معنی کسی مجتمع چیز کو پھیلانے اور بکھیر دینے کے ہیں، عربی میں کہا جاتا ہے: دَحَا الْمَطَرُ الْحَصَى عَنْ وَجْهِ الْأَرْضِ'' (معجم مقاییس اللغۃ لابن فارس، جلد 2، صفحہ 333)۔ یعنی بارش زمین پر سے

کنکریوں کو بہالے گئی۔تقریباً یہی مفہوم انگریزی لفظ (drift) کا بھی ہے، جو اس جغرافی نظریے کی تعبیر کے لیے موجودہ زمانے میں اختیار کیا گیا ہے،قدیم ترین ماضی اورحال میں اس حیرت انگیز یکسانیت کی توجیہ اس کے سوااور کیا ہوسکتی ہے کہ یہ ایسی ہستی کا کلام ہے ،جس کا علم ماضی اورحال سب پر محیط ہے۔

غذائیات

کتاب الٰہی میں انسان کے لیے جو مینیو (menu) بتایا گیا ہے،اس کے مطابق خون ہمارے لیےحرام ہے(مثلاً دیکھیے، البقرۃ، 2:173)۔نزولِ کتاب کے وقت تک انسان اس قانون کی غذائی اہمیت سے بے خبر تھا،لیکن بعد کو جب سائنسی طور پرخون کے اجزاء کی تحلیل کی گئی تومعلوم ہوا کہ یہ قانون نہایت اہم مصلحت پر مبنی تھا،سائنسی تجزیہ نے اس کو رد نہیں کیا بلکہ اس کی معنویت ہم پر واضح کی۔

یہ تجزیہ بتاتا ہے کہ خون میں کثرت سے یورک ایسڈ (Uric Acid) موجود ہے، جو ایک تیزابی مادہ ہونے کی وجہ سے خطرناک زہریلی تاثیر اپنے اندر رکھتا ہے،اور غذا کے طور پر اس کا استعمال سخت مضر ہے،ذبیحہ کا مخصوص طریقہ جو اسلام میں بتایا گیا ہے،اس کی مصلحت بھی یہی ہے، اسلامی اصطلاح میں ذبیحہ سے مراد جانور کو خدا کے نام پر ایسے طریقہ سے ذبح کرنا ہے،جس سے اس کے جسم کا سارا خون نکل جائے ،اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ جانور کی صرف شہ رگ کو کاٹا جائے لیکن گردن کی رگوں کو قائم رکھا جائے تاکہ مذبوحہ کے دل اور دماغ کے درمیان موت تک تعلق قائم رہے، اور جانور کی موت کا باعث صرف اخراج خون ہو، نہ کہ کسی اعضائے رئیسہ (vital organ) پر صدمہ (injury) کا پہنچنا۔کیوں کہ کسی اعضائے رئیسہ مثلاً دماغ، دل یا جگر کے صدمہ رسیدہ ہونے سے فوراً موت آجاتی ہے۔لیکن ایسی صورت میں خون جسم کے اندر ہی جم جاتا ہے۔اس طرح جمے ہوئے خون کے ساتھ سارا گوشت یورک ایسڈ کی وجہ سے آلودہ (polluted) ہوجاتا ہے۔

اسی طرح قرآن میں سور کو بھی حرام کیا گیا ہے(مثلاً دیکھیے، البقرۃ، 2:173)۔زمانۂ قدیم میں انسان کو اس کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہ تھا،مگر جدید طبّی تحقیقات نے بتایا ہے کہ اس کے اندر

بہت سے نقصانات ہیں، مثلاً مذکورہ بالا یورک ایسڈ جو ایک زہریلا مادہ ہے اور ہر جاندار کے خون میں موجود رہتا ہے، وہ اور جانداروں کے جسم سے تو خارج ہو جاتا ہے، مگر سور کے اندر سے خارج نہیں ہوتا، گردے جو ہر انسانی جسم میں ہوتے ہیں، وہ اس زہریلے مادے کو پیشاب کے ذریعہ خارج کرتے رہتے ہیں، انسانی جسم اس مادے کو نوے فیصد خارج کر دیتے ہیں، مگر سور کے جسم کے عضلات کی ساخت (biochemistry) کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ اس کے خون کا یورک ایسڈ صرف دو فیصد ہی خارج ہو پاتا ہے، اور بقیہ حصہ اس کے جسم کا جزء بنتا رہتا ہے، چنانچہ سور خود بھی جوڑوں کے درد میں مبتلا رہتا ہے، اور اس کا گوشت کھانے والے بھی وجع المفاصل (rheumatism) جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اس طرح کی مثالیں کثرت سے قرآن وحدیث میں موجود ہیں اور یہ مثالیں اس بات کا قطعی ثبوت ہیں کہ یہ غیر انسانی ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے۔ بعد کی معلومات نے حیرت انگیز طور پر قرآن کی اس پیشین گوئی کی تصدیق کی ہے، جس کو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ یعنی—

> ''عنقریب ہم آفاق وانفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے گا کہ یہ حق ہے۔'' (فصلت، 41:53)

اس باب کو میں ایک واقعہ پر ختم کروں گا، جس کے راوی علامہ عنایت اللہ مشرقی ہیں، اور اس واقعہ کا تعلق انگلستان سے ہے:

> ''1909ء کا ذکر ہے، اتوار کا دن تھا، اور زور کی بارش ہو رہی تھی، میں کسی کام سے باہر نکلا تو جامعہ کیمبرج کے مشہور ماہر فلکیات سر جیمز جینس (James Jeans) پر نظر پڑی جو بغل میں انجیل دبائے چرچ کی طرف جا رہے تھے، میں نے قریب ہو کر سلام کیا، انھوں نے کوئی جواب نہ دیا، دوبارہ سلام کیا تو وہ متوجہ ہوئے اور کہنے لگے، ''تم کیا چاہتے ہو'' میں نے کہا، دو باتیں اول یہ کہ زور سے بارش ہو رہی ہے اور آپ نے چھاتا بغل میں داب رکھا ہے، سر جیمز اپنی بدحواسی پر مسکرائے اور چھاتا کھول لیا، دوم یہ کہ آپ جیسا شہرۂ آفاق آدمی

گرجا گھر میں عبادت کے لئے جا رہا ہے، یہ کیا؟ میرے اس سوال پر پروفیسر جیمز لمحہ بھر کے لئے رک گئے اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا ''آج شام کو چائے میرے ساتھ پیو'' چنانچہ شام کو میں ان کی رہائش گاہ پہنچا ٹھیک 4 بجے لیڈی جیمز باہر آ کر کہنے لگیں ''سر جیمز تمہارے منتظر ہیں'' اندر گیا تو ایک چھوٹی سی میز پر چائے لگی ہوئی تھی، پروفیسر صاحب تصورات میں کھوئے ہوئے تھے، کہنے لگے ''تمہارا سوال کیا تھا'' اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اجرام آسمانی کی تخلیق، ان کے حیرت انگیز نظام، بے انتہا پہنائیوں اور فاصلوں، ان کی پیچیدہ راہوں اور مداروں نیز باہمی کشش اور طوفان ہائے نور پر وہ ایمان افروز تفصیلات پیش کیں کہ میرا دل اللہ کی اس داستانِ کبریا و جبروت پر دہلنے لگا، اور ان کی اپنی کیفیت یہ تھی سر کے بال سیدھے اٹھے ہوئے تھے، آنکھوں سے حیرت و خشیت کی دوگونہ کیفیتیں عیاں تھیں، اللہ کی حکمت و دانش کی ہیبت سے ان کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے، اور آواز لرز رہی تھی، فرمانے لگے ''عنایت اللہ خاں! جب میں خدا کے تخلیقی کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو میری تمام ہستی اللہ کے جلال سے لرزنے لگتی ہے، اور جب میں کلیسا میں خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر کہتا ہوں ''تو بہت بڑا ہے'' تو میری ہستی کا ہر ذرہ میرا ہم نوا بن جاتا ہے، مجھے بیحد سکون اور خوشی نصیب ہوتی ہے، مجھے دوسروں کی نسبت عبادت میں ہزار گنا زیادہ کیف ملتا ہے، کہو عنایت اللہ خاں! تمہاری سمجھ میں آیا کہ میں گرجے کیوں جاتا ہوں۔''

علامہ مشرقی کہتے ہیں کہ پروفیسر جیمز کی اس تقریر نے میرے دماغ میں عجیب کہرام پیدا کر دیا میں نے کہا ''جناب والا! میں آپ کی روح افروز تفصیلات سے بے حد متاثر ہوا ہوں، اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یاد آ گئی اگر اجازت ہو تو پیش کروں، فرمایا ''ضرور'' چنانچہ میں نے یہ آیت پڑھی:

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ ۔ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَٰلِكَ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (35:27-28) ۔یعنی پہاڑوں میں خطے ہیں، سفید اور سرخ اور طرح طرح کے رنگ کے اور کالے اور آدمیوں میں

اور کیڑوں میں اور چوپاؤں میں اسی طرح مختلف رنگ ہیں، اللہ سے ڈرتے وہی ہیں اس کے بندوں میں سے جو علم رکھتے ہیں۔

یہ آیت سنتے ہی پروفیسر جیمز بولے:

''کیا کہا— اللہ سے صرف اہل علم ڈرتے ہیں، حیرت انگیز، بہت عجیب، یہ بات جو مجھے پچاس برس مسلسل مطالعہ ومشاہدہ کے بعد معلوم ہوئی، محمد کو کس نے بتائی، کیا قرآن میں واقعی یہ آیت موجود ہے، اگر ہے تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے، محمد ان پڑھ تھا، اسے یہ عظیم حقیقت خود بخود معلوم نہیں ہوسکتی، اسے یقیناً اللہ نے بتائی تھی، بہت خوب، بہت عجیب— (نقوش شخصیات نمبر، صفحات 9-1208)

مذہب اور تمدّنی مسائل

تمدّنی مسائل کے سلسلے میں بنیادی سوال یہ ہے کہ اس کا قانون کیا ہو، تمدّنی مسائل انسانوں کے باہمی روابط سے پیدا ہوتے ہیں، اور ان روابط کو جو چیز منصفانہ طور پر متعین کرتی ہے، وہ قانون ہے، مگر یہ حیرت انگیز بات ہے کہ آج تک انسان اپنی زندگی کا قانون دریافت نہ کرسکا، کہنے کو اگرچہ ساری دنیا میں قانونی حکومتیں قائم ہیں، مگر یہ تمام ''قوانین'' نہ صرف یہ کہ اپنے مقصد میں بری طرح ناکام ہیں بلکہ جبری نفاذ کے سوا ان کی پشت پر کوئی حقیقی وجہ جواز بھی موجود نہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ، رائج الوقت قوانین اپنے حق میں علمی اور نظریاتی بنیاد سے محروم ہیں — فلر (Lon Luvois Fuller, 1902-1078) کے الفاظ میں قانون نے ابھی اپنے آپ کو نہیں پایا ہے، اس نے ایک کتاب لکھی ہے، جس کا نام ہے۔ ''قانون خود اپنی تلاش میں۔''

The Law in Quest of Itself

دورِ جدید میں اس پر بے شمار لٹریچر تیار ہوا ہے۔ بڑے بڑے دماغ اپنی اعلیٰ صلاحیتیں اور اپنے بہترین اوقات اس کے لیے صرف کر رہے ہیں، اور چیمبرز انسائیکلو پیڈیا کے مقالہ نگار کے الفاظ میں ''قانون کو ایک زبردست فن کی حیثیت دے کر اس کو عظیم ترقی تک پہونچا دیا ہے۔'' مگر اب تک کی ساری کوششیں قانون کا کوئی متفقہ تصور حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں، حتیٰ کہ ایک عالم قانون کے الفاظ میں ''اگر دس قانون دانوں کو قانون کی تعریف بیان کرنے کے لیے کہا جائے تو بلا مبالغہ ہم کو گیارہ مختلف قسم کے جوابات سننے کے لیے تیار رہنا چاہیے'' ۔ ماہرین قانون کی مختلف اقسام کو الگ کرنے کے لیے انھیں مختلف مکاتیب فکر میں تقسیم کیا جاتا ہے، مگر ان کی قسمیں اتنی زیادہ ہیں کہ بہت سے مصنفین اس طرح کی اختیار کردہ وسیع ترین تقسیم کی حد بندیوں میں بھی نہیں آتے، مثال کے طور پر جان آسٹن (John Austin, 1790-1859) کے متعلق پروفیسر پیٹن (G. W. Paton) نے لکھا ہے کہ وہ ہماری وسیع قسم بندی (Broad Division) میں سے کسی

ایک میں بھی پوری طرح موزوں نہیں بیٹھتا۔‘‘

A Textbook of Jurisprudence,1905, p. 5

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ماہرینِ قانون کو وہ صحیح اساس ہی نہیں ملی جس کی بنیاد پر وہ مطلوبہ قانون کی تشکیل کرسکیں۔ وہ قانون کے اندر جن ضروری قدروں (values) کو یکجا کرنا چاہتے ہیں، جب وہ انھیں یکجا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ یکجا نہیں ہو رہی ہیں۔ اس سلسلے میں ماہرینِ قانون کی مثال اس شخص کی سی ہے، جو زندہ مینڈکوں کو ترازو میں رکھ کر تولنے کی کوشش کررہا ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ پانچ مینڈکوں کو یکجا کرے گا تو دوسرے پانچ اس کے پلڑے میں سے پھدک کر نکل چکے ہوں گے۔ اس طرح معیاری قانون کو حاصل کرنے کی کوششیں اب تک صرف ناکامی پر ختم ہوئی ہیں۔ فرائڈمین (W. Friedmann) کے الفاظ میں —’’یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب کو اس مسئلہ کا کوئی حل اب تک اس کے سوا نہیں مل سکا کہ وہ گاہ بگاہ ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف لڑھک جایا کرے۔‘‘

The only ‘solution’ that western civilization has found, says, W. Friedmann, is to “keep wavering from one extreme to the other.” (*Legal Theory*, p.18)

جان آسٹن جس کی کتاب پہلی بار 1861ء میں شائع ہوئی، اس نے دیکھا کہ قوت نافذہ کے بغیر کوئی قانون، قانون نہیں بنتا، اس لیے اس نے قانون کی تعریف یہ کی —’’قانون ایک حکم ہے جو سیاسی طور پر اعلیٰ شخص (political superior) نے سیاسی طور پر ادنیٰ شخص (political inferior) کے لیے نافذ کیا ہو۔‘‘

> Law is what is imposed by a superior on an inferior, be that superior the king or the legislature. (*A Textbook of Jurisprudence*, p. 56)

پیٹن کے مطابق، اس تعریف میں قانون بس ایک صاحب اقتدار کا فرمان (Command of the Sovereign) بن کر رہ گیا ہے۔

G. W. Paton, *A Textbook of Jurisprudence*, p. 6

چنانچہ اس پر شدید اعتراضات کیے گئے۔ نیز حکمرانوں کی بدعنوانی دیکھ کر ذہنوں میں یہ تصور ابھرا کہ قانون سازی میں عوام کی مرضی کو بھی جگہ ملنی چاہیے۔ ایسے علمائے قانون پیدا ہوئے جنھوں نے کسی ایسے ضابطہ وقاعدہ کو قانون تسلیم کرنے سے انکار کیا جس کی پشت پر قوم کی رضامندی نہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ضابطہ تمام اہل علم اور معلمین اخلاق کے نزدیک صحیح اور مفید ہونے کے باوجود محض اس لیے رائج نہیں کیا جاسکتا تھا، کیوں کہ رائے عامہ اس کے خلاف ہے۔ مثلاً امریکا میں شراب کی پابندی کے قانون کو امریکی قوم کی رضامندی نہ ملنے کی وجہ سے قانون کی حیثیت حاصل نہ ہوسکی۔ اسی طرح برطانیہ میں قتل کی سزا میں ترمیم کرنی پڑی اور ہم جنسی جیسی قبیح حرکت کے لیے قانونی طور پر اجازت دینی پڑی۔ حالانکہ ملک کے جج اور سنجیدہ لوگ اس کے خلاف تھے۔

اسی طرح یہ بات بھی زبردست بحث کا موضوع رہی ہے کہ قانون قابل تغیّر ہے یا ناقابل تغیّر — قرونِ وسطیٰ اور زمانۂ ماقبل تجدید (Post Renaissance Period) میں قانونِ طبعی یا قانونِ فطرت کو کافی فروغ حاصل ہوا، اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان کی جو فطرت ہے، وہی قانون کا بہترین ماخذ ہے:

''فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شے پر حکومت کا حق خود اسی کے فطری تقاضوں اور رہنما اصولوں کو پہونچتا ہے، اور انسان کے لیے قدرت نے یہ رہنما اصول اس کی عقل کی صورت میں پیدا کیے ہیں لہٰذا انسان پر حکومت خود اپنی عقل کے زور سے ہی قائم کی جاسکتی ہے۔''

Jurisprudence by Bodenheimer, p. 164

اس تصور نے قانون کو ایک آفاقی بنیاد فراہم کردی، یعنی وہ ایک ایسی چیز سمجھا جانے لگا جس کو ہمیشہ ایک ہی رہنا چاہیے، یہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کا تصور قانون تھا، اس کے بعد دوسرا مکتب فکر پیدا ہوا اور اس نے دعویٰ کیا کہ قانون کے آفاقی قواعد معلوم کرنا بالکل ناممکن ہیں، کوہلر (Kohler) لکھتا ہے:

''یہاں کوئی ابدی قانون (eternal law) نہیں ہے، ایک قانون جو ایک عہد کے

لیے موزوں ہو، وہی لازمی طور پر دوسرے عہد کے لیے موزوں نہیں ہوسکتا، ہم صرف اس بات کی کوشش کرسکتے ہیں کہ ہر کلچر کے لیے اس کے مناسب حال نظام قانون کو فراہم کریں، کوئی چیز جو ایک کے لیے خیر ہو، وہی دوسرے کے لیے مہلک ہوسکتی ہے۔''

Philosophy of Law, p.5

اس تصور نے فلسفۂ قانون کا سارا استحکام ختم کردیا، یہ تصور انسانی فکر کو اندھا دھند تغیر پذیری (Relativism) کی طرف لے جاتا ہے، اور چوں کہ یہ کسی بنیاد سے محروم ہے، اس لیے اس کی کوئی منزل نہیں، یہ تصور زندگی کی تمام اقدار کو تلپٹ کرکے رکھ دیتا ہے۔

پھر ایک گروہ نے عدل کے پہلو کو بہت زیادہ اہمیت دی، اور یہ سمجھا کہ وہ فلسفہ قانون کا آخری راز پا گیا ہے — لارڈ رائٹ (Lord Wright) نے ڈین راسکو پاونڈ (DeanRoscoe Pound) کا ایک اقتباس نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''راسکو پاونڈ ایک ایسی بات کہتا ہے جس کی صداقت پر میں اپنے تمام تجربات اور قانونی مطالعہ کے نتیجے میں بالکل مطمئن ہو چکا ہوں، وہ یہ قانون کا ابتدائی اور بنیادی مقصد عدل کی تلاش (Quest of Justice) ہے۔''

Interpretation of Modern Legal Philosophies, NY, 1947, p. 794

مگر یہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ انصاف کیا ہے، اور اس کو کیسے متعین کیا جاسکتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ بات گھوم پھر کر دوبارہ وہیں پہونچ جاتی ہے، جہاں آسٹن کو ہم نے چھوڑا تھا، اس طرح سیکڑوں برس کی تلاش وتحقیق کے باوجود انسان اب تک قانون کی تشکیل کے لیے کوئی واقعی بنیاد فراہم نہ کرسکا، یہ احساس روز بروز بڑھ رہا ہے کہ جدید فلسفہ، مقاصد قانون کے اہم مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہا ہے، پروفیسر پیٹن (George Whitecross Paton) لکھتے ہیں:

''کیا مفادات (interests) ہیں جن کا تحفظ ایک معیاری قانونی نظام کو کرنا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے، جو اقدار (values) سے متعلق ہے، اور وہ فلسفۂ قانون کے دائرۂ بحث میں آتا ہے، مگر اس معاملے میں ہم فلسفہ سے جتنی زیادہ مدد لینا چاہتے ہیں اتنا ہی اس

کا حصول مشکل ہوتا ہے، کوئی بھی قابل قبول پیمانہ اقدار (Scale of Values) اب تک دریافت نہیں ہوسکا ہے، درحقیقت صرف مذہب ہی میں ایسا ہے کہ ہم اس کی ایک بنیاد پاسکتے ہیں، مگر مذہب کی صداقتیں عقیدہ یا وجدان کے تحت قبول کی جاتی ہیں، نہ کہ منطقی استدلال کی بنیاد پر۔''

A Textbook of Jurisprudence, p.104

آگے وہ کچھ علمائے قانون کا یہ خیال نقل کرتا ہے کہ وہ مدتوں فلسفہ قانون کی بھول بھلیوں میں گردش کرنے کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ فلسفۂ قانون کے مقصد کے فلسفیانہ مطالعہ کی جو کوشش کی ہے، وہ کسی نتیجہ تک نہیں پہنچتی۔ (صفحہ 106) پھر وہ سوال کرتا ہے کہ '' کیا کچھ معیاری اقدار (ideal values) ہیں، جو ارتقائے قانون میں اس کی رہنمائی کرتی ہیں۔'' (صفحہ 108) ایسی اقدار اگرچہ اب تک دریافت نہیں ہوسکیں لیکن وہ قانون کے لیے ناگزیر ہیں، مگر دقت یہ ہے کہ مذہب کو الگ کرنے کے بعد اس کے حصول کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، اس کے الفاظ یہ ہیں:

The Orthodox Natural Law Theory based its absolutes on the revealed truths of religion.If we attempt to secularise jurisprudence, where can we find an agreed basis of values. (*A Textbook of Jurisprudence*, p.109)

یہ طویل تجربہ انسان کو دوبارہ اسی طرف لوٹنے کا اشارہ کرتا ہے، جہاں سے اس نے انحراف کیا تھا، قدیم زمانے میں قانون کی تدوین وتشکیل میں مذہب کا بہت بڑا حصہ ہوتا تھا، چنانچہ تاریخ قانون کا ماہر سر ہنری مین (Sir Henry Maine) لکھتا ہے:

''تحریری طور پر منضبط قانون کا کوئی ایسا نظام، چین سے پیرو (Peru) تک ہمیں نہیں ملتا جو اپنے دور آغاز ہی سے مذہبی رسوم وعبادات کے ساتھ ہم رشتہ نہ رہا ہو۔''

Early Law and Custom, p.5

اب وقت آ گیا ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ خدا کی رہنمائی کے بغیر انسان خود اپنے لیے قانون وضع نہیں کرسکتا، لاحاصل کوشش کو مزید جاری رکھنے کے بجائے اب ہمارے لیے

بہتر ہوگا کہ، ڈاکٹر فرائڈ مین کے الفاظ میں، ہم اعتراف کرلیں کہ —

''ان مختلف کوششوں کا جائزہ لیا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ انصاف کے حقیقی معیار کو معین کرنے کے لیے مذہب کی رہنمائی حاصل کرنے کے سوا دوسری ہر کوشش بے فائدہ ہوگی، اور انصاف کے مثالی تصور کو عملی طور پر متشکل کرنے کے لیے مذہب کی دی ہوئی بنیاد بالکل منفرد طور پر حقیقی اور سادہ بنیاد ہے۔''

Legal Theory, p.450

مذہب کے اندر ہم کو وہ تمام بنیادیں نہایت صحیح شکل میں مل جاتی ہیں، جو ایک معیاری قانون کے لیے ماہرین تلاش کر رہے ہیں، مگر وہ اب تک اسے نہ پا سکے۔

1۔ قانون کا سب سے پہلا اور لازمی سوال یہ ہے کہ قانون کون دے، وہ کون ہو جس کی منظوری (sanction) سے کسی قانون کو قانون کا درجہ عطا کیا جائے، ماہرین قانون اب تک اس سوال کا جواب حاصل نہ کر سکے، اگر حاکم کو بحیثیت حاکم یہ مقام دیں تو نظری طور پر اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ ایک یا چند اشخاص کو دوسرے تمام لوگوں کے مقابلے میں یہ امتیازی حق کیوں دیا جائے کہ وہ جو چاہے، قانون بنائے اور جس طرح چاہے نافذ کرے، اور اگر معاشرہ اور اجتماع کو ''قانون ساز'' قرار دیں تو یہ اور زیادہ مہمل بات ہے، کیوں کہ معاشرہ بحیثیت مجموعی وہ علم وعقل ہی نہیں رکھتا جو قانون سازی کے لیے ضروری ہے، قانون بنانے کے لیے بہت سی مہارتوں اور واقفیتوں کی ضرورت ہے جس کی نہ عام لوگوں میں صلاحیت ہوتی ہے، اور نہ ان کو اتنا موقع ہوتا ہے کہ وہ ان میں درک حاصل کرسکیں، اسی طرح عملاً بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ معاشرہ کی کوئی ایسی رائے معلوم کی جا سکے جو سارے معاشرہ کی اپنی رائے ہو۔

موجودہ زمانے میں اس مسئلے کا یہ حل نکالا گیا ہے کہ پوری آبادی کے عاقل اور بالغ افراد اپنے نمائندے منتخب کریں اور یہ منتخب لوگ اجتماع کے نمائندے کی حیثیت سے اجتماع کے لیے قانون بنائیں، مگر اس اصول کی غیر معقولیت اسی سے ظاہر ہے کہ 51 فیصد کو صرف دو عدد کی اکثریت کی بنا پر یہ

حق مل جاتا ہے کہ وہ 49 فیصد کی نام نہاد اقلیت پر حکمرانی کریں، مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس طریقے کے اندر اتنے خلا ہیں کہ عموماً 51 فیصد کی اکثریت بھی حاصل نہیں ہوتی اور مطلق اقلیت کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ اکثریت کے اوپر حکومت بنائے۔

اس طرح فلسفۂ قانون کو آج تک اس مسئلہ کا کوئی واقعی حل معلوم نہ ہو سکا، مذہب اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ قانون کا ماخذ خدا ہے، جس نے زمین و آسمان کا اور ساری طبیعی دنیا کا قانون مقرر کیا ہے، اسی کو حق ہے کہ وہ انسان کے تمدن و معاشرت کا قانون وضع کرے، اس کے سوا کوئی بھی نہیں ہے، جس کو یہ حیثیت دی جا سکے، یہ جواب اتنا سادہ اور معقول ہے کہ وہ خود ہی بول رہا ہے کہ اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی اور جواب نہیں ہو سکتا، یہ جواب اس سوال پر اسی طرح بالکل راست آرہا ہے، جیسے کوئی ڈھکّن غلط شیشیوں پر بیٹھ نہ رہا ہو، اور جیسے ہی اس کے اصل مقام پر اسے لایا جائے وہ ٹھیک ٹھیک اس پر بیٹھ جائے۔

اس جواب میں قانون بنانے اور حکم دینے کا حق ٹھیک اس جگہ پہونچ گیا جہاں نہ پہونچنے کی وجہ سے ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم اس کو کہاں لے جائیں، انسانوں کے اوپر انسان کو حاکم اور قانون ساز نہیں بنایا جا سکتا، اس کا حق صرف اسی کو ہے جو سارے انسانوں کا خالق اور بالفعل ان کا طبیعی حاکم ہے۔

2۔ قانون کا ایک بہت بڑا سوال یہ ہے کہ کیا اس کا سارا حصہ اضافی ہے یا اس کا کوئی جزء حقیقی نوعیت بھی رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہر قانون جو آج رائج ہے کل بدلا جا سکتا ہے یا اس کا کوئی حصہ ایسا بھی ہے جو ناقابل تغیر ہے۔ اس سلسلے میں طویل ترین بحثوں کے باوجود آج تک کوئی قطعی بنیاد حاصل نہ ہو سکی۔ علمائے قانون اصولی طور پر اس کو ضروری سمجھتے ہیں کہ قانون میں ایک ایسا عنصر ضروری ہے جو دوامی نوعیت رکھتا ہو، اور اسی کے ساتھ اس میں ایسے اجزاء بھی ہونے چاہئیں جن میں لچک ہو، تاکہ بدلتے ہوئے حالات پر انھیں بآسانی اپلائی کیا جا سکے — دونوں میں سے کسی ایک پہلو کی کمی بھی قانون کے لیے سخت مضر ہے۔ امریکا کے ایک جج مسٹر کارڈوزو (Justice Cardozo) لکھتے ہیں:

''آج قانون کی اہم ترین ضروریات میں سے ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ ایک ایسا فلسفۂ قانون مرتب کیا جائے جو ثبات اور تغیر کے متحارب تقاضوں کے درمیان توافق پیدا کرے۔''

The Growth of the Law, Benjamin Nathan Cardozo

ایک اور عالم قانون لکھتا ہے:

''قانون کو ضرور مستحکم ہونا چاہیے، لیکن اس کے باوجود اس میں جمود نہیں پیدا ہونا چاہیے، اسی وجہ سے قانون کے متعلق مفکرین نے اس بارے میں کافی جدوجہد کی ہے کہ کس طرح استحکام اور تبدیلی کے دوطرفہ تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔''

Roscoe Pound, *Interpretation of Legal History*, p. 1

مگر حقیقت یہ ہے کہ انسانی قوانین میں اس قسم کا فرق پیدا کرنا ناممکن ہے، کیوں کہ قانون کے کسی حصہ کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ دائمی اور ناقابل تغیر ہے، کوئی دلیل چاہتا ہے، اور انسانی قانون ایسی کوئی دلیل پیش کرنے سے عاجز ہے، آج کچھ لوگ ایک قانون کو اپنی عقل سے دائمی قرار دیں گے، اور کل کچھ لوگوں کی عقل کو نظر آئے گا کہ وہ دائمی ہونے کے قابل نہیں ہے، اور وہ دوبارہ اس کے قابلِ تغیر ہونے کا اعلان کر دیں گے۔

خدا کا قانون ہی اس مسئلے کا واحد حل ہے، خدا کا قانون ہم کو وہ تمام بنیادی اصول دے دیتا ہے جو غیر متبدل طور پر ہمارے قانون کا لازمی جزء ہوسکیں۔ یہ قانون کچھ بنیادی امور کے بارے میں بنیادی پہلوؤں کا تعین کرتا ہے، اور بقیہ امور اور دیگر پہلوؤں کے بارے میں خاموش ہے، اس طرح وہ اس فرق کا تعین کر دیتا ہے کہ قانون کا کون سا حصہ دائمی ہے، اور کون سا حصہ قابلِ تغیر ہے، پھر وہ خدا کا قانون ہونے کی وجہ سے اپنے ساتھ یہ ترجیحی دلیل بھی رکھتا ہے کہ کیوں ہم اس تعین کو مبنی برحق سمجھیں اور اس کو لازمی قرار دیں۔

یہ خدائی قانون کی بہت بڑی دَین ہے، بلکہ ایک ایسی دَین ہے، جس کا بدل فراہم کرنا انسان کے لیے قطعی ناممکن ہے۔

3۔ اسی طرح قانون کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس اس بات کی کوئی معقول وجہ موجود ہو کہ وہ کیوں کسی جرم کو ''جرم'' قرار دیتا ہے۔ انسانی قانون کے پاس اس کا جواب یہ ہے کہ جو عمل ''امن عامہ یا نظم مملکت'' میں خلل ڈالتا ہو وہ جرم ہے، اس کے بغیر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی فعل کو جرم کیسے قرار دے، یہی وجہ ہے کہ قوانین مروجہ کی نگاہ میں زنا اصلاً جرم نظر نہیں آتا بلکہ وہ صرف اس وقت جرم بنتا ہے، جب کہ طرفین میں سے کسی نے دوسرے پر جبر کیا ہو، گویا انسانی قانون کے نزدیک اصل جرم زنا نہیں بلکہ جبر و اکراہ ہے۔ جس طرح زبردستی کسی کے مال پر ہاتھ ڈالنا جرم ہے، اسی طرح زبردستی اس کے جسم پر دست درازی بھی جرم ہے۔ لیکن باہمی رضامندی سے جس طرح ایک کا مال دوسرے کے لیے جائز ہو جاتا ہے، اسی طرح گویا قانون کی نظر میں فریقین کی رضامندی سے ایک کا جسم بھی دوسرے کے لیے حلال ہو جاتا ہے۔ اس باہمی رضامندی کی شکل میں قانون، زنا کا حامی و محافظ بن جاتا ہے، اور اگر تیسرا شخص زبردستی مداخلت کر کے انھیں روکنا چاہے تو الٹا وہی شخص مجرم بن جائے گا۔

زنا کا ارتکاب سوسائٹی میں زبردست فساد پھیلاتا ہے، وہ ناجائز اولاد کے مسائل پیدا کرتا ہے، وہ رشتۂ نکاح کو کمزور کر دیتا ہے، وہ سطحی لذتیت کا ذہن پیدا کرتا ہے، وہ چوری اور خیانت کی تربیت کرتا ہے، وہ قتل اور اغوا کو فروغ دیتا ہے، وہ سارے سماج کے دل و دماغ کو گندا کر دیتا ہے، مگر اس کے باوجود قانون اسے کوئی سزا نہیں دے سکتا، کیوں کہ اس کے پاس زنا بالرضا کو جرم قرار دینے کے لیے کوئی بنیاد نہیں ہے۔

اسی طرح انسانی قانون کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہے کہ وہ شراب نوشی کو جرم کیوں قرار دے۔ کیوں کہ کھانا پینا انسان کا ایک فطری حق ہے، اس لیے وہ جو چاہے کھائے پیے۔ اس میں قانون کو مداخلت کرنے کی کیا ضرورت۔ اس لیے اس کے نزدیک نہ شراب پینا جرم ہے، اور نہ اس سے پیدا شدہ بدمستی اصلاً قابل مواخذہ ہے۔ البتہ نشے کی حالت میں اگر مخمور کسی سے گالم گلوچ کر بیٹھا یا ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی، یا عام راستے پر وہ اس طرح جھومتا ہوا چلا کہ اس کی حرکات سے دوسروں کو

پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے، تب کہیں جا کر قانون اس پر ہاتھ ڈالنا جائز سمجھے گا۔ گویا انسانی قانون کی رو سے درحقیقت شراب نوشی کا فعل قابل گرفت نہیں ہے، بلکہ اصل قابل گرفت جرم دوسروں کو ایک خاص شکل میں ایذا پہنچانا ہے۔

شراب نوشی صحت کو تباہ کرتی ہے، وہ مال کے بربادی اور بالآخر معاشی بربادی تک لے جاسکتی ہے۔ اس سے اخلاق کا احساس کمزور پڑتا ہے، اور انسان دھیرے دھیرے حیوان بن جاتا ہے۔ شراب مجرمین کی بہترین مددگار ہے، جس کو پینے کے بعد لطیف احساسات مفلوج ہو جاتے ہیں، اور پھر قتل، چوری، ڈاکہ اور عصمت دری کے واقعات کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے، مگر قانون اسے بند نہیں کرسکتا۔ کیوں کہ اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے کہ وہ کیوں لوگوں کے کھانے پینے کے پسند وناپسند پر روک لگائے۔

اس مشکل کا جواب صرف خدا کے قانون میں ہے۔ کیوں کہ خدا کا قانون مالک کائنات کی مرضی کا اظہار ہوتا ہے، کسی قانون کا خدا کا قانون ہونا بذات خود اس بات کی کافی وجہ ہے کہ وہ بندوں کے اوپر نافذ ہو اس کے بعد اس کے لیے کسی اور سبب کی ضرورت نہیں، اس طرح خدائی قانون، قانون کی اس ضرورت کو پورا کرتا ہے کہ کس بنیاد پر کس فعل کو قانون کی زد میں لایا جائے۔

4۔ قانون کبھی اخلاق سے بے نیاز نہیں ہوسکتا، مختلف اسباب کی بنا پر قانون کے ساتھ اخلاق کا تعلق ہونا ضروری ہے۔

(الف) مثلاً ایک مقدمہ قانون کے سامنے آتا ہے۔ اس وقت اگر خالص سچائی منظرِ عام پر نہ آئے تو قانون کا عادلانہ مقصد کبھی پورا نہیں ہوسکتا۔ اگر فریقین اور گواہ عدالتوں میں سچ بولنے سے گریز کریں تو انصاف کا خاتمہ ہو جائے گا، اور اس کے قیام کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوں گی گویا قانون کے ساتھ کسی ایسے ماورائے قانون کا تصور کی بھی لازمی ضرورت ہے، جو لوگوں کے لیے سچ بولنے کا محرک بن سکے۔ سچائی کے لازمۂ قانون وانصاف ہونے کا اعتراف دنیا بھر کی عدالتیں اس طرح کرتی ہیں کہ وہ ہر گواہ کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ سچ بولنے کی قسم کھائے اور حلف

اٹھا کر اپنا بیان دے۔ قانون کے لیے مذہبی اعتقادات کی اہمیت کی یہ ایک نہایت واضح مثال ہے۔ مگر جدید سوسائٹی میں مذہب کی حقیقی اہمیت چوں کہ ہر پہلو سے ختم کر دی گئی ہے، اس لیے عدالتوں کی مذہبی قسمیں اب صرف ایک روایت بلکہ مسخرہ بن کر رہ گئی ہیں، اور ان کا کوئی واقعی فائدہ باقی نہیں رہا ہے۔

(ب) اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ قانون جس فعل کو جرم قرار دے کر اس پر سزا دینا چاہتا ہے، اس کے بارے میں خود سماج کے اندر بھی یہ احساس موجود ہو کہ یہ فعل جرم ہے، محض قانونی کوڈ میں چھپے ہوئے الفاظ کی بنا پر وہ فضا پیدا نہیں ہو سکتی، جو کسی جرم پر سزا کے اطلاق کے لیے درکار ہے، ایک شخص جب جرم کرے تو اس کے اندر احساسِ جرم (guilty mind) کا پایا جانا ضروری ہے، وہ خود اپنے آپ کو مجرم سمجھے اور سارا سماج اس کو مجرم کی نظر سے دیکھے، پولیس پورے اعتماد کے ساتھ اس پر دست اندازی کرے، عدالت میں بیٹھنے والا جج پوری آمادگیٔ قلب کے ساتھ اس پر سزا کا حکم جاری کرے، دوسرے لفظوں میں ایک فعل کے ''جرم'' ہونے کے لیے اس کا ''گناہ'' ہونا ضروری ہے، قانون کے تاریخی مکتبِ فکر کا یہ کہنا کہ — قانون سازی اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب کہ وہ ان لوگوں کے داخلی اعتقادات (internal convictions) کے مطابق ہو، جس کے لیے قانون وضع کیا گیا ہے، اگر وہ اس سے غیر متعلق ہو تو ایسے قانون کا ناکام ہونا یقینی ہے۔''

A Texbook of Jurisprudence, p.15

اپنے مخصوص مکتبِ فکر کے استدلال کے طور پر تو صحیح نہیں ہے مگر اس میں ایک خارجی صداقت بیشک موجود ہے۔

(ج) ان سب چیزوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قانون کے عمل درآمد سے پہلے سماج کے اندر ایسے محرکات موجود ہوں جو لوگوں کو جرم کرنے سے روکتے ہوں، صرف پولیس اور عدالت کا خوف اس کے لیے کافی محرک نہیں بن سکتا، کیوں کہ پولیس اور عدالت کے اندیشہ سے تو رشوت، سفارش، غلط وکالت اور جھوٹی گواہیاں بھی بچا سکتی ہیں، اور اگر ان چیزوں کو استعمال کر کے کوئی شخص اپنے آپ

کو جرم کے قانونی انجام سے بچالے جائے تو پھر اسے مزید کوئی اندیشہ باقی نہیں رہتا۔

خدائی قانون میں ان تمام چیزوں کا جواب موجود ہے، خدائی قانون کے ساتھ مذہب و آخرت کا عقیدہ وہ ماورائے قانون فضا پیدا کرتا ہے، جو لوگوں کو سچائی پر ابھارے، وہ اس درجہ موثر ہے کہ اگر کوئی شخص وقتی مفاد کے تحت جھوٹا حلف اٹھائے تو اپنے دل کو ملامت سے نہیں بچا سکتا، ویسٹرن سرکٹ کی عدالت میں ایک پتھر نصب ہے جو اس واقعہ کی یاد تازہ کرتا ہے کہ ایک گواہ نے قسم کے عام کلمات دہرانے کے بعد یہ بھی کہا تھا کہ ''اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا میری جان یہیں قبض کرلے'' چنانچہ وہ شخص وہیں دھڑام سے گرا اور گر کر اس کا خاتمہ ہوگیا۔

The Changing Law, p. 103

اسی طرح جرم کے فعل شنیع ہونے کا عام احساس بھی محض اسمبلی کے پاس کردہ ایکٹوں کے ذریعہ پیدا نہیں ہوسکتا، اس کی بھی واحد بنیاد خدا اور آخرت کا عقیدہ ہے، اسی طرح جرم نہ کرنے کا محرک بھی صرف مذہب ہی پیدا کرسکتا ہے، کیوں کہ مذہب صرف قانون نہیں دیتا بلکہ اسی کے ساتھ یہ تصور بھی دلاتا ہے کہ جس نے یہ قانون عائد کیا ہے، وہ تمہاری پوری زندگی کو دیکھ رہا ہے، تمہاری نیت، تمہارا قول، تمہاری تمام حرکتیں اس کے ریکارڈ میں مکمل طور پر منضبط ہوچکی ہیں، مرنے کے بعد تم اس کے سامنے پیش کیے جاؤ گے اور تمہارے لیے ممکن نہ ہوگا کہ تم اپنے جرائم پر پردہ ڈال سکو، آج سزا سے بچ گئے تو وہاں کی سزا سے کسی طرح بچ نہیں سکتے، بلکہ دنیا میں اپنے جرم کی سزا سے بچنے کے لیے اگر تم نے غلط کوششیں کیں تو آخرت کی عدالت میں تمہارے اوپر دہرا مقدمہ چلے گا، اور وہاں ایک ایسی سزا ملے گی جو دنیا کی سزا کے مقابلے میں کروڑوں گنا سخت ہے۔

5۔ انگلستان کی تاریخ کا ایک واقعہ ہے۔ جیمز اول (James1) نے اعلان کیا کہ وہ مطلق العنان بادشاہ کی طرح حکومت کرسکتا ہے، اور عدالتوں میں استغاثہ اور مرافعہ کے بغیر معاملات میں آخری فیصلے دے سکتا ہے، یہ مشہور چیف جسٹس لارڈ کوک (Coke) کا زمانہ تھا، وہ ایک مذہبی آدمی تھے، اور اپنے دن کا ایک چوتھائی حصہ عبادت میں بسر کیا کرتے تھے، انھوں نے بادشاہ سے

کہا: ''تمھیں فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، تمام مقدمات عدالت میں جانے چاہئیں''۔ بادشاہ نے کہا: ''میرا خیال ہے اور یہی میں نے سنا بھی ہے کہ تمہارے قوانین کی بنیاد عقل پر رکھی گئی ہے، تو کیا مجھ میں ججوں سے کم تر عقل ہے''۔ چیف جسٹس نے جواب دیا: ''تم بلاشبہ بہت علم وصلاحیت کے مالک ہو، لیکن قانون کے لیے بڑے تجربے اور مطالعہ کی ضرورت ہے، یہ تو ایک سنہری پیمانہ ہے، جس سے رعایا کے حقوق کی پیمائش کی جاتی ہے، اور خود جناب والا کی حفاظت کی جاتی ہے۔'' بادشاہ نے انتہائی غصہ سے کہا: ''کیا میں بھی قانون کا ماتحت ہوں، ایسا کہنا تو غداری ہے'۔ لارڈ کوک نے بریکٹن (Bracton) کا حوالہ دیتے ہوئے جواب دیا:

''بادشاہ کسی آدمی کا ماتحت نہیں، مگر وہ خدا اور قانون کا ماتحت ہے۔''

The Changing Law by Sir Alfred Denning (1953) p. 117. 118

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم خدا کو قانون سے الگ کر دیں تو ہمارے پاس یہ کہنے کی کوئی معقول بنیاد نہیں رہتی کہ — بادشاہ قانون کے ماتحت ہے'' کیوں کہ جن افراد نے خود اپنی رایوں سے قانون بنایا ہو، جن کے اذن (Sanction) سے وہ قانونی طور پر جاری ہوا ہو، جو اس کو باقی رکھنے یا بدلنے کا حق رکھتے ہوں آخر کس بنا پر وہ اس کے ماتحت ہو جائیں گے، جب انسان ہی قانون ساز ہو تو بالکل فطری طور پر وہ خدا اور قانون دونوں کا جامع ہو جاتا ہے، وہ خود ہی خدا اور خود ہی قانون ہوتا ہے، ایسی حالت میں قانون سازوں کو قانون کے دائرے میں لانے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

یہی وجہ ہے کہ تمام جمہوریتوں میں شہری مساوات کے اصول کو تسلیم کرنے کے باوجود قانونی طور پر سب یکساں نہیں ہیں، اگر آپ ملک کے صدر، گورنر، وزیر یا کسی افسر اعلیٰ پر مقدمہ چلانا چاہیں تو آپ اسی طرح ان کے خلاف مقدمہ نہیں چلا سکتے جیسے ایک عام شہری کے خلاف آپ کر لیتے ہیں، بلکہ ایسے کسی مقدمے کو عدالت میں لے جانے سے پہلے حکومت سے اس کی اجازت لینی ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں، اگر آپ کسی اعلیٰ سیاسی یا انتظامی شخصیت پر مقدمہ چلانا چاہیں تو خود انھیں سے پوچھنا ہوگا کہ آپ کے اوپر مقدمہ چلایا جائے یا نہیں۔

یہ ملک کے قانونی نظام کا نقص نہیں ہے بلکہ انسانی قانون کا نقص ہے، اور یہ نقص ہر اس جگہ پایا جاتا ہے، جہاں انسانی قانون سازی کا اصول رائج ہے۔ صرف خدائی قانون میں یہ ممکن ہے کہ ہر شخص کی حیثیت قانون کی نظر میں یکساں ہو، اور ایک حاکم پر اسی طرح عدالت میں مقدمہ چلایا جاسکے جس طرح محکوم پر چلایا جاتا ہے، کیوں کہ ایسے نظام میں قانون ساز خدا ہوتا ہے، بقیہ تمام لوگ یکساں طور پر اس کے ماتحت۔

6۔ قانون کی آخری اور سب سے بڑی خصوصیت جس کو ہمارے ماہرین صدیوں سے تلاش کر رہے ہیں، اور اب تک وہ اسے حاصل نہ کر سکے وہ بھی صرف مذہبی قانون میں موجود ہے — یعنی قانون کی منصفانہ بنیاد، یہ سمجھا جاتا ہے کہ منصفانہ قانون کی بنیاد کا حاصل نہ ہونا تلاش کے نامکمل ہونے کا ثبوت ہے، نہ کہ اس بات کا ثبوت کہ انسان اسے حاصل ہی نہیں کرسکتا۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ طبعی قوانین کی دریافت میں انسان نے بے حساب ترقی کی ہے، اور اس کے مقابلے میں تمدنی قوانین کی دریافت میں اس درجہ کی بلکہ اس سے زیادہ کوششوں کے باوجود ایک فی صد بھی کامیابی نہیں ہوئی، تو ہم یہ ماننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ یہ محض تلاش کے نامکمل ہونے کا ثبوت نہیں ہے، بلکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جو چیز تلاش کی جارہی ہے اس کا پانا انسان کے بس میں نہیں۔

دنیا میں سب سے پہلا فوٹو ایک فرانسیسی سائنسداں نے 1826ء میں کھینچا، اس میں آٹھ گھنٹے کا وقت لگا۔ اس نے اپنے کمرے کے برآمدے کا فوٹو کھینچا تھا، لیکن تصویر کشی (photography) کی موجودہ رفتار کا حال یہ ہے کہ آج کا کیمرا ایک سیکنڈ میں دو ہزار سے بھی زیادہ تصویریں کھینچ لیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے جتنی دیر میں صرف ایک تصویر کھینچی جاسکتی تھی، اتنی دیر میں آج چھ کروڑ تصویریں لی جاسکتی ہیں۔ گویا رفتار کے معاملے میں 140 سال میں انسان نے چھ کروڑ گنا ترقی کی ہے، امریکا میں بیسویں صدی کے آغاز میں سارے ملک میں صرف چار موٹر کاریں تھیں، اب تقریباً دس کروڑ کاریں وہاں سڑکوں پر دوڑتی ہیں، انسان کی باریک بینی کا یہ حال ہے کہ آج وہ سیکنڈ کو بھی ہزارویں (1/10,00,000) حصے تک تقسیم کرسکتا ہے یعنی ایک سیکنڈ کے دس لاکھویں حصے کا ہزارواں حصہ۔

چنانچہ زمین کی گردش میں فرق پڑنے سے اگر ایک سیکنڈ کے دس لاکھویں حصے کے بقدر چھوٹا یا بڑا رصدگاہوں میں اسے معلوم کرلیا جاتا ہے۔ آج ایسے حساس آلے دریافت ہو چکے ہیں کہ اگر تیس جلدوں کی انسائیکلو پیڈیا میں کسی ایک صفحہ پر دو الفاظ بڑھائے جائیں تو اس کی سیاہی سے وزن میں جو فرق پڑے گا، اس کو وہ فوراً بتا دیں گے — یہ طبیعی قوانین کی دریافت میں انسان کی ترقی کا حال ہے، مگر جہاں تک تمدنی قوانین کا معاملہ ہے، وہ اس میں ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکا۔

یہاں میں چند تقابلی مثالیں دوں گا، جس سے اندازہ ہوگا کہ یہ دعویٰ کس قدر صحیح ہے کہ صرف خدائی مذہب ہی وہ حقیقی بنیاد ہے، جس سے ہم انسانی زندگی کا قانون اخذ کر سکتے ہیں۔

معاشرت

اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان فرق کیا ہے۔ وہ دونوں صنفوں کے درمیان آزادانہ اختلاط کو ناپسند کرتا ہے، اور اس کو بند کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے بعد جب صنعتی دور شروع ہوا تو اس اصول کا بہت مذاق اڑایا گیا، اور اس کو دور جہالت کی یادگار قرار دیا گیا۔ بڑے زور شور سے یہ بات کہی گئی کہ عورت مرد دونوں یکساں ہیں، ان کے میل جول کے درمیان کوئی دیوار کھڑی نہیں کی جا سکتی۔ ساری دنیا میں اور خاص طور سے مغرب میں اس اصول پر ایک نئی سوسائٹی ابھرنا شروع ہوئی ،مگر طویل تجربے نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ پیدائشی طور پر دونوں یکساں نہیں ہیں، اس لیے دونوں کو یکساں فرض کر کے جو سماج بنایا جائے وہ لازمی طور پر بے شمار خرابیاں پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب، خاتونِ اسلام، مطبوعہ نئی دہلی)

پہلی بات یہ کہ عورت اور مرد میں فطری صلاحیتوں کے زبردست نوعی اختلافات ہیں اس لیے دونوں کو مساوی حیثیت دینا اپنے اندر ایک حیاتیاتی تضاد رکھتا ہے، ڈاکٹر الکسس کیرل عورت اور مرد کے فعلیاتی (Physiological) فرق کو بتاتے ہوئے لکھتا ہے:

''مرد اور عورت کا فرق محض جنسی اعضا کی خاص شکل، رحم کی موجودگی، حمل یا طریقۂ تعلیم ہی کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ یہ اختلاف بنیادی قسم کے ہیں، خود نسیجوں کی بناوٹ اور پورے

نظامِ جسمانی کے اندر خاص کیمیائی مادے جو خصیۃ الرحم سے مترشح ہوتے رہتے ہیں، ان اختلافات کا حقیقی باعث ہیں، صنف نازک کے ترقی کے حامی ان بنیادی حقیقتوں سے ناواقف ہونے کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں جنسوں کو ایک ہی قسم کی تعلیم، ایک ہی قسم کے اختیارات اور ایک ہی قسم کی ذمہ داریاں ملنی چاہئیں، حقیقت یہ ہے کہ عورت، مرد سے بالکل ہی مختلف ہے، اس کے جسم کے ہر ایک خلیے میں زنانہ پن کا اثر موجود ہوتا ہے، اس کے اعضا اور سب سے بڑھ کر اس کے اعصابی نظام کی بھی یہی حالت ہوتی ہے، فعلیاتی قوانین (Physiological Law) اتنے ہی اٹل ہیں، جتنے کہ فلکیات (Sidereal World) کے قوانین اٹل ہیں، انسانی آرزوؤں سے ان کو بدلا نہیں جاسکتا، ہم ان کو اسی طرح ماننے پر مجبور ہیں، جس طرح وہ پائے جاتے ہیں، عورتوں کو چاہیے کہ اپنی فطرت کے مطابق اپنی صلاحیتوں کی ترقی دیں اور مردوں کی نقالی کرنے کی کوشش نہ کریں۔''

Man, the Unknown, p.93

عملی تجربہ بھی اس فرق کی تصدیق کر رہا ہے۔ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی اب تک عورت کو مرد کے برابر درجہ نہ مل سکا۔ حتیٰ کہ وہ شعبے جو خاص طور پر عورتوں کے شعبے سمجھے جاتے ہیں، وہاں بھی مرد کو عورت کے اوپر فوقیت حاصل ہے۔ میری مراد فلمی ادارے سے ہے۔ نہ صرف یہ کہ فلمی اداروں کی تنظیم تمام تر مردوں کے ہاتھ میں ہے، بلکہ اداکاری کے اعتبار سے بھی مرد کی اہمیت عورت سے زیادہ ہے۔ آج (1962ء میں) ایک مشہور ترین فلم ایکٹر ایک فلم کے لیے چھ لاکھ روپے لیتا ہے، جب کہ مشہور ترین فلم ایکٹرس کو اسی فلم کے لیے صرف چار لاکھ ملتے ہیں۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ اگر ہم طبیعی اور فلکیاتی قوانین کو تسلیم نہ کریں اور ان کے خلاف چلنا شروع کر دیں تو یہ صرف ایک واقعہ کا انکار ہی نہیں ہوگا بلکہ ہمیں اس کی بڑی قیمت بھی دینی پڑے گی۔ عورت اور مرد کی جداگانہ قابلیت کو نظر انداز کر کے انسان نے جو نظام بنایا، اس نے تمدن کے اندر بہت سی خرابیاں پیدا کر دی ہیں۔ مثال کے طور پر اس غلط فلسفے کی وجہ سے

دونوں صنفوں کے درمیان جو آزادانہ اختلاط پیدا ہوا ہے، اس نے جدید سوسائٹی میں نہ صرف عصمت کا وجود باقی نہیں رکھا، بلکہ ساری نوجوان نسل کو طرح طرح کی اخلاقی اور نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ آج مغربی زندگی میں یہ بات عام ہے کہ ایک غیر شادی شدہ لڑکی ڈاکٹر کے کمرہ میں داخل ہوتی ہے، اس کو سر درد اور بے خوابی کی شکایت ہے، وہ کچھ دیر اپنی ان تکلیفات پر گفتگو کرتی ہے، اس کے بعد ایک مرد کا ذکر شروع کر دیتی ہے، جس سے ابھی وہ جلد ہی ملی تھی، اتنے میں ڈاکٹر محسوس کرتا ہے کہ وہ کچھ رک رہی ہے، تجربہ کار ڈاکٹر اس کی بات سمجھ کر آگے بات شروع کر دیتا ہے:

Well, then he asked you to his flat. What did you say?

لڑکی جواب دیتی ہے:

How did you know? I was just going to tell you that...

اس کے بعد لڑکی جو کچھ کہتی ہے، اس کو ناظرین خود قیاس کر سکتے ہیں، چنانچہ علمائے جدید خود بھی اس تلخ تجربے کے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آزادانہ اختلاط کے بعد عصمت وعفت کا تحفظ ایک بے معنی بات ہے۔ اس کے خلاف کثرت سے مضامین اور کتابیں شائع کی جارہی ہیں، ایک مغربی ڈاکٹر کے الفاظ ہیں:

There can come a moment between a man and a woman when control and judgment are impossible.

یعنی اجنبی مرد اور اجنبی عورت جب باہم آزادانہ مل رہے ہوں تو ایک وقت ایسا آجاتا ہے، جب فیصلہ کرنا اور قابو رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت اور مرد کے آزادانہ اختلاط کی خرابیوں کو مغرب کے دردمند افراد شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اس سے اس قدر مرعوب ہیں کہ اصل بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی، ایک نہایت قابل اور مشہور خاتون ڈاکٹر میرین ہلیرڈ (Marrion Hiliard) نے آزادانہ اختلاط کے خلاف سخت مضمون لکھا ہے، وہ کہتی ہیں:

As a doctor, I don't believe there is such a thing as platonic relationship between a man and a woman who are alone together a good deal.

یعنی بحیثیت ڈاکٹر میں اسے تسلیم نہیں کرسکتی کہ عورت اورمرد کے درمیان بے ضرر تعلقات بھی ممکن ہیں،مگراس کے باوجودیہی خاتون ڈاکٹرلکھتی ہیں:

''میں اتنی غیرحقیقت پسندنہیں ہوسکتی کہ یہ مشورہ دوں کہ نوجوان لڑکے اورنوجوان لڑکیاں ایک دوسرے کابوسہ لیناچھوڑ دیں،مگراکثر مائیں اپنی لڑکیوں کواس سے آگاہ نہیں کرتیں کہ بوسہ صرف اشتہاپیدا کرتاہے، نہ کہ وہ جذبات کوتسکین دیتاہے۔''(ریڈرز ڈائجسٹ،دسمبر1957ء)

خاتون ڈاکٹر یہ کہہ کر بالواسطہ طور پرفطری قانون کوتسلیم کرتی ہے کہ آزادانہ اختلاط کے ابتدائی مظاہر جومغربی زندگی میں نہایت عام ہیں،وہ جذبات میں ٹھہراؤ پیدانہیں کرتے، بلکہ اشتہا کوبڑھا کر مزیدتسکین نفس کی طرف ڈھکیلتے ہیں، اور بالآخرانتہائی جنسی جرائم تک پہنچادیتے ہیں،مگراس کے باوجوداس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان محرکات کوکس طرح حرام قرار دے۔

یہاں میں اقوام متحدہ کے ڈیموگرافک سالنامہ 1959ء کاحوالہ دوں گا، اس میں اعداد وشمار کے ذریعہ بتایا گیاہے کہ جدیددنیامیں جوصورتحال ہے،وہ یہ کہ بچے''اندر سے کم اور باہر سے زیادہ'' پیدا ہورہے ہیں۔ڈیموگرافک سالنامہ کے مطابق کچھ ملکوں میں ناجائز بچوں کا تناسب ساٹھ فیصد ہے،اوربعض ممالک مثلاً پناما میں توچار بچوں میں سے تین بچے پادریوں کی مداخلت یاسول میرج رجسٹری کےبغیرہی پیداہورہے ہیں،یعنی 75فیصدناجائز بچے۔لاطینی امریکامیں اس قسم کے بچوں کی تعدادسب سےزیادہ ہے۔

اقوامِ متحدہ کے اس ڈیموگرافک سالنامہ سےمعلوم ہوتاہے کہ مسلم ملکوں میں ناجائز بچوں کی پیدائش کاتناسب نفی کے برابر ہے۔چنانچہ اس میں بتایا گیاہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ(مصر) میں ناجائز بچوں کاتناسب ایک فی صدی سے بھی کم ہے،جب کہ متحدہ عرب جمہوریہ تمام مسلم ملکوں میں

شاید سب سے زیادہ مغربی تہذیب سے متاثر ہوا ہے۔ مسلم ممالک دور جدید کی اس عام وبا سے محفوظ کیوں ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مسلم ممالک مغربی ممالک کے برخلاف میں عورت اور مرد کے درمیان آزادانہ اختلاط بہت کم ہے۔ اس لیے وہاں ناجائز ولادت کم ہیں۔

(“More Out Than In” مطبوعہ ہندستان ٹائمس، 12 ستمبر 1960ء)

تعدد ازواج

اسی طرح اسلام میں ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کو بھی تہذیب جدید نے بڑے زورشور کے ساتھ جہالت (ignorance) کا قانون قرار دیا ہے۔ مگر تجربے نے ظاہر کردیا ہے کہ اسلام کا یہ اصول سماجی ضرورت کے مطابق ہے۔ یہ سماج میں پیدا ہونے والے مسئلہ کا حل، نہ کہ حکم، جس پر عمل کرنا ہر وقت ضروری ہو۔ وہ مسئلہ کیا ہے۔

سروے بتاتے ہیں کہ باعتبار پیدائش عورت اور مرد کی تعداد تقریباً یکساں ہوتی ہے۔ یعنی جتنے بچے، تقریباً اتنی ہی بچیاں۔ مگر شرح اموات (Mortality) کے سروے سے معلوم ہوا ہے کہ عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کے درمیان موت کی شرح زیادہ ہے۔ یہ فرق بچپن سے لے کر آخر عمر تک جاری رہتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984) کے مطابق، عمومی طور پر، موت کا خطرہ عمر کے ہر مرحلہ میں، عورتوں کے لیے کم پایا گیا ہے اور مردوں کے لیے زیادہ:

> In general, the risk of death at any given age is less for females than for males (EB. VII/37)

اکثر حالات میں سماج کے اندر عورتوں کی تعداد کا زیادہ ہونا اور مردوں کی تعداد کا کم ہونا مختلف اسباب سے ہوتا ہے۔ مثلاً جنگ۔ پہلی عالمی جنگ (1914-18) میں آٹھ ملین سے زیادہ فوجی مارے گئے۔ شہری لوگ جو اس جنگ میں ہلاک ہوئے وہ اس کے علاوہ ہیں۔ یہ زیادہ تر مرد تھے۔ دوسری عالمی جنگ (1939-45) میں ساڑھے چھ کروڑ آدمی ہلاک ہوئے یا جسمانی طور پر ناکارہ ہو گئے۔ یہ سارے لوگ زیادہ تر مرد تھے۔ عراق، ایران جنگ میں (1979-88) میں ایران کی 82

ہزار عورتیں بیوہ ہو گئیں۔ عراق میں ایسی عورتوں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہے جن کے شوہر اس دس سالہ جنگ میں ہلاک ہوئے۔

اسی طرح مثال کے طور پر جیل اور قید کی وجہ سے بھی سماج میں مردوں کی تعداد کم اور عورتوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے۔ امریکہ کو موجودہ زمانہ میں دنیا کی مہذب ترین سوسائٹی کی حیثیت حاصل ہے۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ امریکہ میں ہر روز تقریباً 13 لاکھ آدمی کسی نہ کسی جرم میں پکڑے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک تعداد وہ ہے جو لمبی مدت تک کے لیے جیل میں ڈال دی جاتی ہے۔ ان سزا یافتہ قیدیوں میں دوبارہ ۹۷ فیصد مرد ہی ہوتے ہیں (EB-14/1102)

اسی طرح جدید صنعتی نظام نے حادثات کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں حادثاتی موتیں روزمرہ کا معمول بن گئی ہیں۔ سڑک کے حادثے، ہوائی حادثے، کارخانوں کے حادثے اور دوسرے مشینی حادثے ہر ملک میں اور ہر روز ہوتے رہتے ہیں۔ جدید صنعتی دور میں یہ حادثات اتنے زیادہ بڑھ گئے ہیں کہ اب سیفٹی انجینئرنگ (safety engineering) کے نام سے ایک مستقل فن وجود میں آ گیا ہے۔ 1967ء کے اعداد و شمار کے مطابق، اس ایک سال میں پچاس ملکوں کے اندر مجموعی طور پر 175000 حادثاتی موتیں واقع ہوئیں، یہ سب زیادہ تر مرد تھے (EB-16/137)۔

صنعتی حادثات کی موتوں میں، سیفٹی انجینئرنگ کے باوجود، پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر، ہوائی حادثات جتنے 1988ء میں ہوئے، اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح تمام صنعتی ملکوں میں مستقل طور پر اسلحہ سازی کے تجربات ہو رہے ہیں۔ ان میں برابر لوگ ہلاک ہوتے رہتے ہیں۔ ان ہلاک شدگان کی تعداد کبھی نہیں بتائی جاتی، تاہم یہ یقینی ہے کہ ان میں بھی تمام تر صرف مرد ہی ہیں جو ناگہانی موت کا شکار ہوتے ہیں۔

اس طرح کے مختلف اسباب کی بنا پر عملی صورت حال اکثر یہی ہوتی ہے کہ سماج میں عورتوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہو، اور مردوں کی تعداد نسبتاً کم ہو جائے۔ دنیا کی آبادی میں مرد اور عورت کی تعداد کے فرق کو بتانے کے لیے یہاں کچھ مغربی ملکوں کے اعداد و شمار دیے جا رہے ہیں۔ یہ اعداد و شمار

انسائیکلوپیڈیابرٹانیکا (1984) سے لیے گئے ہیں:

COUNTRY	MALE	FEMALE
1. Austria	47.07%	52.93%
2. Burma	48.81	51.19
3. Germany	48.02	51.89
4. France	48.99	51.01
5. Italy	48.89	51.11
6. Poland	48.61	51.39
7. Spain	48.94	51.06
8. Switzerland	48.67	51.33
9. Soviet Union	46.59	53.03
10. United States	48.58	51.24

انڈیا کے حوالے سے اس کی تفصیل جاننا ہوتو انڈیا ٹوڈے (15 نومبر 1978) کی 8 صفحات کی باتصویر رپورٹ ملاحظہ فرمائیں، جو اس بامعنی عنوان کے تحت شائع ہوئی ہے کہ بیوائیں، انسانیت کا بربادشدہ ملبہ:

Widows: Wrecks of humanity

اس مسئلہ کے حل کے لیے ایک صورت یہ ہے کہ یہ ''فاضل'' عورتیں جنسی آوارگی یا معاشرتی بربادی کے لیے چھوڑ دی جائیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنی آزادانہ مرضی سے ایسے مردوں کے ساتھ ازدواجی رشتہ میں وابستہ ہوجائیں جو ایک سے زیادہ بیویوں کے ساتھ عدل کر سکتے ہوں۔ مذکورہ بالا دوممکن صورتوں میں سے اسلام نے دوسری صورت کا انتخاب کیا ہے۔ یعنی مخصوص شرائط کے ساتھ کچھ مردوں کے لیے ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت۔

تعدد ازواج کا یہ اصول جو اسلامی شریعت میں مقرر کیا گیا ہے، وہ دراصل عورتوں کو مذکورہ بالا قسم کے بھیانک انجام سے بچانے کے لیے ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھیے کہ عملی طور پر کوئی عورت کسی مرد کی دوسری یا تیسری بیوی بننے پر ہنگامی حالات ہی میں راضی ہوسکتی ہے، نہ کہ معمول کے

حالات میں۔ بظاہر یہ ایک عام حکم ہے، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ حکم دراصل ایک سماجی مسئلہ کے عملی حل (practical wisdom) کے طور پر وضع کیا گیا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوراقم الحروف کی کتاب، تعدد ازواج، مطبوعہ گڈ ورڈ بکس نئی دہلی)

تمدن

اسلام میں قتل عمد کی سزا موت ہے الا یہ کہ مقتول کے ورثاء خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں، لیکن جدید دورِ ترقی میں جہاں مذہب کی اور تعلیمات کے خلاف ذہن پیدا ہوا اسی طرح سزائے قتل کے بارے میں بھی سخت تنقیدیں کی جانے لگیں، ان حضرات کا خاص استدلال یہ ہے کہ اس قسم کی سزا کا مطلب یہ ہے کہ ایک انسانی جان کے ضائع ہونے کے بعد دوسری انسانی جان کو بھی کھو دیا جائے، پچھلے برسوں میں اکثر ملکوں میں اس رجحان نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے، اور پھانسی کے بجائے قید کی سزائیں تجویز کی جا رہی ہیں۔

اسلام نے قاتل کی جو سزا مقرر کی ہے، اس میں دو اہم ترین فائدے ہیں، ایک یہ کہ ایک شخص نے سوسائٹی کے ایک فرد کو قتل کر کے جس برائی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی جڑ آئندہ کے لیے کٹ جائے، مجرم کا یہ عبرتناک انجام دیکھ کر دوسرے لوگ آیندہ اس قسم کی ہمت نہ کر سکیں، اسی کے ساتھ دیت کی جو صورت ہے، اس میں گویا اسلام نے نتائج کا لحاظ کیا ہے، مثلاً اگر کسی کے والدین بوڑھے ہوں اور ان کا اکلوتا بیٹا قتل ہو جائے تو وہ بے سہارا رہ جاتے ہیں، ایسی حالت میں قاتل کو سزائے موت بھی مل جائے تو انھیں کیا فائدہ، اسلام نے ایسے والدین کی تلافی کے لیے یہ طریقہ رکھا ہے کہ قاتل کے ورثاء مقتول کے والدین کو ایک خاص رقم بطور خوں بہا دے کر انھیں راضی کر لیں، اور وہ قاتل کو معاف کر دیں، اس صورت میں مقتول کے بوڑھے والدین کو مثلاً ایک بڑی رقم مل جائیگی، اور وہ اس رقم سے اپنی گزر بسر کا انتظام کر سکیں گے — مخصوص حالات میں ریاست کو بھی یہ حق ہے کہ وہ دیت کی رقم میں اضافہ کر دے تا کہ بے سہارا وارثین کی کچھ مدد ہو جائے۔

یہ ایک نہایت حکیمانہ قانون ہے، اور تجربہ بتاتا ہے کہ وہ جہاں رائج ہوا قتل کا خاتمہ ہو گیا۔ اس

کے برعکس، جن ممالک میں سزائے موت کومنسوخ کیا گیا ہے، وہاں جرائم گھٹنے کے بجائے اور بڑھ گئے ہیں۔ اعداد وشمار سے معلوم ہوا ہے کہ ایسے ممالک میں قتل کی وارداتوں میں بارہ فیصد تک اضافہ ہوگیا ہے۔

چنانچہ اس کی بھی مثالیں موجود ہیں کہ پہلے سزائے موت کومنسوخ کیا گیا۔ اوراس کے بعد نتائج دیکھ کردوبارہ اسے بدل دیا گیا، سیلون (سری لنکا) اسمبلی نے 1956ء میں ایک قانون پاس کیا، جس کے مطابق سیلون کی حدود میں موت کی سزا کوختم کردیا گیا، اس قانون کے نفاذ کے بعد سیلون میں جرائم تیزی سے بڑھنا شروع ہوگئے، ابتدا میں لوگوں کوہوش نہیں آیا مگر 26 ستمبر 1959ء کوجب ایک شخص نے سیلون کے وزیراعظم بندرانائک کے مکان میں گھس کرنہایت بے دردی کے ساتھ ان کوقتل کردیا توسیلون کے قانون سازوں کی آنکھ کھلی، اوروزیراعظم کی لاش کوٹھکانے لگانے کے فوراً بعدسیلون اسمبلی کاایک ہنگامی اجلاس ہوا، جس میں چار گھنٹے کے بحث ومباحثہ کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ سیلون کی حکومت 1956ء کے قانون کومنسوخ کرکے ملک میں سزائے موت کودوبارہ جاری کرنے کافیصلہ کرتی ہے۔

معیشت

مذہب، معاشیات کی جوتنظیم کرتا ہے، اس میں ذرائع پیداوار پرانفرادی ملکیت کوتسلیم کیا گیا ہے بلکہ اس کاساراڈھانچہ بنیادی طور پر، انفرادی ملکیت کےاوپر قائم ہے، یہ نظام عرصہ تک باقی رہا، (۱) مگرصنعتی انقلاب کے بعد یورپ میں انفرادی ملکیت کے اصول پر زبردست تنقیدیں شروع ہوئیں، یہاں تک کہ تعلیم یافتہ طبقہ کی عام فضااس کے خلاف ہوگئی، انیسویں صدی کے نصف آخراوربیسویں صدی کےنصف اول کے درمیان سوبرس تک ایسی فضارہی گویاانفرادی ملکیت ایک

---

(۱) انفرادی ملکیت کانظام جوساری دنیامیں جاری ہواوہ دراصل مذہب ہی کے اثرکانتیجہ تھا، اوراسی لیے مارکس اوراس کے متبعین نے مذہب کی شدیدمخالفت کی کیوں کہ اس کے بغیرانفرادی ملکیت کی اہمیت کوذہنوں سے نکال نہیں سکتے تھے۔

مجرمانہ قانون تھا، جو دورِ وحشت میں انسانوں کے درمیان رائج ہو گیا، اوراب جدید علمی ترقی نے اجتماعی ملکیت کا اصول دریافت کیا ہے، جو معاشیات کی بہتر تنظیم کے لیے اعلیٰ ترین اصول ہے۔

اس کے بعد تاریخ میں پہلی بار اجتماعی ملکیت کے نظام کا تجربہ شروع ہوا، زمین کے ایک بڑے حصّے میں اس کو نافذ کیا گیا، اس کے حق میں بڑے بڑے دعوے کیے گئے، بڑی بڑی امیدیں باندھی گئیں، مگر طویل تجربہ سے ثابت ہو گیا کہ اجتماعی ملکیت کا نظام نہ صرف یہ کہ غیر فطری ہونے کی وجہ سے اپنے قیام کے لیے تشدد پیدا کرتا ہے، نہ صرف یہ کہ وہ انسان کی ہمہ جہتی ترقی میں مانع ہے، نہ صرف یہ کہ سرمایہ داری سے بھی زیادہ ایک مرکوز اور جابرانہ نظام کا موجب ہے بلکہ خود وہ زرعی اور صنعتی پیداوار بھی اس میں ملکیتی نظام کے مقابلے میں کم حاصل ہوتی ہے، جس کے لیے آزادی اور ہمہ جہتی ترقی کی قربانی دی گئی تھی۔

یہاں میں روس کی مثال دوں گا، روس کی تمام زمینیں اس وقت سرکاری ملکیت میں تبدیل کی جا چکی ہیں، اور پورے ملک میں ''اجتماعی انتظام'' کے تحت کاشت کی جاتی ہے، ساری زمینیں سرکاری اور پنچایتی فارم کی صورت میں ہیں، نہ کہ نجی ملکیت کی صورت میں۔ البتہ 1935ء کے فیصلہ کے مطابق ہر کسان کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے رہائشی مکان سے متصل اپنے ذاتی استعمال کے لیے ایک تہائی یا نصف ایکڑ اور بعض مخصوص صورتوں میں دو ایکڑ تک زمین پر قبضہ رکھ سکتا ہے، اسی طرح اسے یہ بھی حق ہے کہ اپنے مکان میں محدود تعداد میں گائے، بکری، بھیڑ اور مرغی وغیرہ پالے، 1961ء کے اعداد و شمار کے مطابق روس میں کل زیر کاشت رقبہ 204 بلین ہیکٹیر (Hectares) تھا، جس میں نجی رقبہ کی مجموعی مقدار چھ ملین ہیکٹیر تھی، یعنی کل کاشت زمین کا صرف تین فیصد حصّہ، مگر 1961ء میں آلو کی پیداوار کا جو تناسب تھا، وہ حسب ذیل ہے:

	زیر کاشت زمین	پیداوار
اجتماعی رقبہ	43,5,2,000	3,08,00,000 ٹن
نجی رقبہ	45,26,000	5,35,00,000 ٹن

اس طرح نجی رقبہ پر پیدا ہونے والے آلو کی مقدار گیارہ ٹن فی ہیکٹیر تھی، جب کہ سرکاری فارموں میں یہ مقدار صرف سات ٹن فی ہیکٹیر تھی، حالانکہ سرکاری فارموں کو جدید زرعی مشینیں، موزوں زمین اور معدنی کھاد وغیرہ کی وہ سہولتیں حاصل تھیں جن سے نجی رقبے قدرتی طور پر محروم تھے۔ اسی قسم کا تناسب دوسرے اجناس کی پیداوار میں بھی پایا جاتا ہے۔

مویشیوں کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب ہے، چارہ کی کمی اور ناقص دیکھ بھال کی وجہ سے سرکاری فارموں میں کثرت سے جانور مرجاتے ہیں چنانچہ صرف ایک ریاست میں 1962ء کے گیارہ مہینوں میں مجموعی طور پر تقریباً ایک لاکھ 70 ہزار مویشی مر گئے، اس کے مقابلے میں ہر قسم کی دشواریوں کے باوجود نجی طور پر پالے ہوئے مویشیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، اور بااعتبار تناسب وہ سرکاری جانوروں سے زیادہ مفید ثابت ہورہے ہیں، اور زیادہ پیداوار دے رہے ہیں۔ چنانچہ سرکاری فارم جو کل تعداد کا 75 فی صدی مرغیوں اور مویشیوں کے مالک ہیں، انھوں نے نجی ذرائع کے مقابلے میں صرف دس (10) فیصد زیادہ گوشت فراہم کیا اور انڈے میں تو نجی پیداوار نے انھیں بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ 1961ء کے اعداد و شمار ملاحظہ ہوں:

	اجتماعی رقبہ	نجی رقبہ
گوشت	48,00,000 ٹن	39,00,000 ٹن
دودھ	3,4,00,000 ٹن	2,85,00,000 ٹن
انڈا	6,300 ٹن	23,000 ٹن
اون	2,87,000 ٹن	79,000 ٹن

حتیٰ کہ یہ محدود نجی ذرائع خود حکومتی مرکزوں کو غذائی اشیا سپلائی کرتے ہیں، چنانچہ 1962ء میں صرف ایک ریاست میں حکومت نے اپنے دفاتر کا 26 فیصد آلو اور 34 فیصد انڈا نجی فارموں سے حاصل کیا ہے، اور اسی طرح دوسری چیزیں۔

Bulletin, Germany, November 1963

اس اجتماعی ملکیت کا آخری انجام یہ ہے کہ روس جوزار کے زمانے میں، جب کہ وہاں نجی ملکیت کا نظام رائج تھا، اناج کے معاملے میں دنیا کے چند بڑے برآمدی ملکوں میں سے تھا، اس نے 1963ء میں کناڈا، آسٹریلیا اور امریکا سے پندرہ ملین ٹن گیہوں خریدا ہے، اور یہ صورت حال مسلسل جاری ہے، چنانچہ 56۔1941ء میں اس نے امریکا سے بارہ لاکھ پچاس ہزار ٹن غلہ خریدا ہے، اسی طرح بعد کے سالوں میں بھی یہی حال دوسرے اشتراکی ملک چین کا بھی ہے۔

Bulletin, Oct. 1963

اس تجربے سے معلوم ہوا کہ مذہب کا قانون جس ذہن سے نکلا ہے، وہ انسانی فطرت کو زیادہ جاننے والا ہے، اور اس کے مسائل کو زیادہ گہرائی کے ساتھ سمجھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کچھ جو تمدن کی تعمیر کے لیے ہمیں درکار ہے، اس کا واحد اور حقیقی جواب صرف مذہب کے پاس ہے۔ مذہب اعلیٰ انسانی ذہن سازی کی طرف رہنمائی کرتا ہے، وہ تمدن کے لیے موزوں ترین اساس فراہم کرتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر معاملے میں وہ صحیح ترین بنیاد دیتا ہے، جس کی روشنی میں ہم زندگی کا مکمل نقشہ بنا سکیں۔ وہ حاکموں اور محکوموں کے درمیان قانونی مساوات پیدا کرنے کی واحد صورت ہے، وہ قانون کے لیے وہ نفسیاتی بنیاد فراہم کرتا ہے، جس کی عدم موجودگی میں قانون عملاً بیکار ہو کر رہ جاتا ہے، وہ سوسائٹی کے اندر وہ موافق فضا پیدا کرتا ہے، جو کسی قانون کے نفاذ کے لیے ضروری ہے، اس طرح مذہب ہمیں وہ سب کچھ دیتا ہے، جس کی ہمیں اپنے تمدن کی تعمیر کے لیے ضرورت ہے، جب کہ لامذہبیت ان میں سے کچھ بھی نہیں دیتی اور نہ حقیقتاً دے سکتی ہے۔

جس زندگی کی ہمیں تلاش ہے

جرمن مفکر فریڈرش انگلس (Friedrich Engels, 1829-1895) نے کہا ہے — ''آدمی کوسب سے پہلے تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی چاہیے، اس کے بعد ہی وہ فلسفہ وسیاست کے مسائل پر غور کرسکتا ہے۔'' مگر حقیقت یہ ہے انسان سب سے پہلے جس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے، وہ یہ سوال ہے — ''میں کیا ہوں' یہ کائنات کیا ہے' میری زندگی کیسے شروع ہوئی اور کہاں جا کر ختم ہوگی'' یہ انسانی فطرت کے بنیادی سوالات ہیں، آدمی ایک ایسی دنیا میں آنکھ کھولتا ہے، جہاں سب کچھ ہے مگر یہی ایک چیز نہیں، سورج اس کو روشنی اور حرارت پہونچاتا ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے اور کیوں انسان کی خدمت میں لگا ہوا ہے، ہوا اس کو زندگی بخشتی ہے مگر انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اس کو پکڑ کر پوچھ سکے کہ تم کون ہو اور کیوں ایسا کر رہی ہو، وہ اپنے وجود کو دیکھتا ہے، اور نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں اور کس لیے اس دنیا میں آگیا ہوں ان سوالات کا جواب متعین کرنے سے انسان کا ذہن قاصر ہے ،مگر انسان بہر حال ان کو معلوم کرنا چاہتا ہے، یہ سوالات معلوم کرنا چاہتا ہے، یہ سوالات خواہ لفظوں کی شکل میں متعین ہو کر ہر شخص کی زبان پر نہ آئیں مگر وہ انسان کی روح کو بے چین رکھتے ہیں، اور کبھی کبھی اس شدت سے ابھرتے ہیں کہ آدمی کو پاگل بنا دیتے ہیں۔

انگلس کو دنیا ایک ملحد انسان کی حیثیت سے جانتی ہے، مگر اس کا الحاد اس کے غلط ماحول کا ردعمل تھا جو بہت بعد کو اس کی زندگی میں ظاہر ہوا، اس کی ابتدائی زندگی مذہبی ماحول میں گزری ،مگر جب وہ بڑا ہوا اور نظر میں گہرائی پیدا ہوئی تو رسمی مذہب سے بے اطمینانی پیدا ہوگئی، اپنے اس دور کا حال وہ ایک دوست کے خط میں اس طرح لکھتا ہے:

''میں ہر روز دعا کرتا ہوں اور تمام دن یہی دعا کرتا رہتا ہوں کہ مجھ پر حقیقت آشکارا ہو جائے، جب سے میرے دل میں شکوک پیدا ہوئے ہیں یہی دعا کرنا میرا مشغلہ ہے، میں

تمہارے عقیدے کو قبول نہیں کرسکتا، میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور میرا دل آنسوؤں سے امڈا چلا آرہا ہے، میری آنکھیں رو رہی ہیں، لیکن مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں راندۂ درگاہ نہیں ہوں، مجھے امید ہے کہ میں خدا تک پہونچ جاؤں گا، جس کے دیدار کا میں دل وجان سے متمنی ہوں، اور مجھے اپنی جان کی قسم! یہ میری جستجو اور عشق کیا ہے، یہ روح القدس کی جھلک ہے، اگر انجیل مقدس دس ہزار مرتبہ بھی اس کی تردید کرے تو میں نہیں مان سکتا۔''

(David Riazanov: *Essays on the History of Marxism*, p. 36, copied from "Max Eastman: *Marx, Lenin and the Science of Revolution*," p. 148, accessed from Google Book, 07.04.2020)

یہ وہی حقیقت کی تلاش کا فطری جذبہ ہے جو نوجوان انگلس میں ابھرا تھا، مگر اس کی تسکین نہ مل سکی اور مروجہ مسیحی مذہب سے غیر مطمئن ہو کر وہ معاشی اور سیاسی فلسفوں میں گم ہو گیا۔

اس طلب کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں ایک خالق اور مالک کا شعور پیدائشی طور پر پیوست ہے، وہ اس کے لاشعور کا ایک لازمی جزء ہے۔ ''خدا میرا خالق ہے، اور میں اس کا بندہ ہوں'' یہ ایک خاموش عہد ہے جو ہر شخص اول روز سے اپنے ساتھ لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔ ایک پیدا کرنے والے آقا و محسن کا تصور غیر محسوس طور پر اس کی رگوں میں دوڑتا رہتا ہے، اس کے بغیر وہ اپنے اندر عظیم خلا محسوس کرتا ہے، اس کی روح اندر سے زور کرتی ہے جس آقا کو اس نے نہیں دیکھا، اس کو وہ پالے، وہ اس سے لپٹ جائے اور اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دے۔

خدا کی معرفت ملنا گویا اس جذبے کے صحیح مرجع کو پالینا ہے، اور جو لوگ خدا کو نہیں پاتے ان کے جذبات کسی دوسری مصنوعی چیز کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، ہر شخص اپنے اندر یہ خواہش رکھنے پر مجبور ہے کہ کوئی ہو جس کے آگے وہ اپنے بہترین جذبات کو نذر کر دے۔ 15 اگست 1947ء کو جب ہندستان کی سرکاری عمارتوں سے یونین جیک اتار کر ملک کا قومی جھنڈا لہرایا گیا تو یہ منظر دیکھ کر ان قوم پرستوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جو اپنے ملک کو آزاد دیکھنے کے لیے تڑپ رہے تھے، یہ آنسو دراصل آزادی کی دیوی کے ساتھ ان کے تعلق کا اظہار تھا — یہ اپنے معبود کو پالینے کی

خوشی تھی، جس کے لیے انھوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ صرف کر دیا تھا، اسی طرح ایک لیڈر جب ''قوم کے باپ'' کی قبر پر جا کر پھول چڑھاتا ہے، اوراس کے آگے سر جھکا کر کھڑا ہوجاتا ہے، تو وہ ٹھیک اسی عمل کو دوہراتا ہے جو ایک مذہبی آدمی اپنے معبود کے لیے رکوع اور سجدے کے نام سے کرتا ہے، ایک کمیونسٹ جب لینن کے مجسمے کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنی ہیٹ (hat) اُتارتا ہے، اوراس کے قدموں کی رفتار سست پڑ جاتی ہے تو اس وقت وہ اپنے معبود کی خدمت میں اپنے عقیدت کے جذبات نذر کررہا ہوتا ہے، اسی طرح ہر شخص مجبور ہے کہ کسی نہ کسی چیز کو اپنا معبود بنائے اوراپنے جذبات کی قربانی اس کے آگے پیش کرے۔

مگر خدا کے سوا جن جن صورتوں میں آدمی اپنا یہ نذرانہ پیش کرتا ہے وہ سب شرک کی صورتیں ہیں، اور قرآن کے الفاظ میں — ''اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ''(31:13)۔ یعنی شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔ ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کی اصل جگہ کے بجائے دوسری جگہ رکھ دینا مثلاً ڈبہ کے ڈھکن سے آپ بچے کی ٹوپی کا کام لینا چاہیں تو یہ ظلم ہوگا، گویا آدمی جب اپنے نفسیاتی خلا کو پر کرنے کے لیے خدا کو چھوڑ کر کسی اورطرف لپکتا ہے، جب وہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنی زندگی کا سہارا بناتا ہے تو وہ اپنے اصل مقام کو چھوڑ دیتا ہے، وہ ایک صحیح جذبے کا غلط استعمال کرتا ہے۔

یہ جذبہ چوں کہ ایک فطری جذبہ ہے، اس لیے ابتداً وہ ہمیشہ فطری شکل میں ابھرتا ہے، اس کا پہلا رخ اپنے اصلی معبود کی طرف ہوتا ہے، مگر حالات اور ماحول کی خرابیاں اس کو غلط سمت میں موڑ دیتی ہیں، اور کچھ دنوں کے بعد جب آدمی ایک مخصوص زندگی سے مانوس ہوجاتا ہے تو اس میں اس کو لذت ملنے لگتی ہے، برٹرینڈ رسل اپنے بچپن میں ایک کٹر مذہبی آدمی تھا، وہ باقاعدہ عبادت کرتا تھا — اسی زمانے میں ایک روز اس کے دادا جان نے پوچھا ''تمہاری پسندیدہ دعا کون سی ہے''؟ چھوٹے رسل نے جواب دیا ''میں زندگی سے تنگ آ گیا ہوں اوراپنے گناہوں کے بوجھ سے دبا ہوا ہوں۔'' اس زمانے میں خدا برٹرینڈ رسل کا معبود تھا، لیکن جب رسل تیرہ برس کی عمر کو پہنچا تو اس کی عبادت چھوٹ گئی اور مذہبی روایات اور پرانی قدروں سے باغیانہ ماحول کے اندر رہنے کی وجہ سے

خوداس کے اندر بھی ان چیزوں سے بغاوت کے رجحانات ابھرنے لگے، اور بالآخر برٹر ینڈ رسل ایک ملحد انسان بن گیا، جس کی محبوب ترین چیزیں ریاضی اور فلسفہ تھی۔ 1959ء کا واقعہ ہے، بی، بی، سی لندن پر ایک بات چیت پروگرام میں فری مین نے رسل سے پوچھا— ''کیا آپ نے مجموعی طور پر ریاضی اور فلسفے کے شوق کو مذہبی جذبات کا نعم البدل پایا ہے؟'' رسل نے جواب دیا ''جی ہاں، یقیناً میں چالیس برس کی عمر تک اس اطمینان سے ہم کنار ہو گیا تھا، جس کے متعلق افلاطون نے کہا ہے کہ آپ ریاضی سے حاصل کر سکتے ہیں— یہ ایک ابدی دنیا تھی، وقت کی قید سے آزاد دنیا، مجھے یہاں مذہب سے ملتا جلتا ایک سکون نصیب ہو گیا۔''

برطانیہ کے اس عظیم مفکر نے خدا کو اپنا معبود بنانے سے انکار کر دیا۔ مگر معبود کی ضرورت سے پھر بھی وہ بے نیاز نہ رہ سکا، اور جس مقام پر پہلے اس نے خدا کو بٹھا رکھا تھا، وہاں ریاضی اور فلسفے کو بٹھانا پڑا، اور یہی نہیں بلکہ ریاضی اور فلسفے کے لیے وہ صفات بھی تسلیم کرنی پڑیں جو صرف خدا ہی کی صفت ہو سکتی ہے۔ ابدیت اور وقت کی قید سے آزادی! کیوں کہ اس کے بغیر اسے مذہب سے ملتا جلتا وہ سکون نہیں مل سکتا تھا، جو دراصل اس کی فطرت تلاش کر رہی تھی۔

''نہرو رکوع میں''— اگر یہ خبر کسی دن اخبار میں چھپے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا کہ یہ واقعہ ہے لیکن ہندستان ٹائمس (دہلی) کی 3 اکتوبر 1963ء کی اشاعت کے آخری صفحہ پر شائع شدہ تصویر اس کی تصدیق کر رہی ہے، اس تصویر میں نظر آ رہا ہے کہ ہندستان کے سابق وزیر اعظم جواہر لال نہرو دوزانو ہو کر اور ہاتھ جوڑ کر رکوع کی مانند جھکے ہوئے ہیں، یہ گاندھی جینتی کے موقع کی تصویر ہے، اور دہلی کے نہرو راج گھاٹ میں گاندھی سمادھی پر قوم کے باپو کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔

اس قسم کے واقعات ہر سال اور ہر روز ساری دنیا میں ہوتے ہیں، لاکھوں ایسے لوگ جو خدا کو نہیں مانتے اور پرستش کو بے معنی چیز سمجھتے ہیں— وہ اپنے خود ساختہ بتوں کے آگے جھک کر اپنے اندرونی جذبۂ عبودیت کو تسکین دیتے ہیں، یہ حقیقت ہے کہ ''الٰہ'' انسان کی ایک فطری ضرورت ہے، اور یہی اس کا ثبوت ہے کہ وہ حقیقی ہے، انسان اگر خدا کے سامنے نہ جھکے تو اس

کو دوسرے الٰہوں کے سامنے جھکنا پڑے گا، کیوں کہ ''الٰہ'' کے بغیر اس کی فطرت اپنے خلا کو پُر نہیں کرسکتی۔

مگر بات صرف اتنی نہیں ہے، اس سے آگے بڑھ کر میں کہتا کہ جو لوگ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا معبود بناتے ہیں، وہ ٹھیک اسی طرح حقیقی سکون سے محروم رہتے ہیں، جیسے کوئی بے بچہ ماں پلاسٹک کی گڑیا خرید کر بغل میں دبا لے اور اس سے تسکین حاصل کرنا چاہے، ایک ملحد انسان خواہ وہ کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو، اس کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں، جب وہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ حقیقت اس کے سوا کچھ اور ہے جو میں نے پائی ہے۔

آزادی سے بارہ سال پہلے 1935ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو نے جیل خانے میں اپنی آپ بیتی مکمل کی تو اس کے آخر میں انھوں نے لکھا:

> ''میں محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی کا ایک باب ختم ہو گیا اور اب اس کا دوسرا باب شروع ہوگا، اس میں کیا ہوگا، اس کے متعلق میں کوئی قیاس نہیں کرسکتا، کتاب زندگی کے اگلے ورق سربمہر ہیں۔''

Nehru— An Autobiography, London, 1953, p. 597

پنڈت نہرو کی زندگی کے اگلے اوراق کھلے تو معلوم ہوا کہ وہ دنیا کے تیسرے سب سے بڑے ملک کے وزیر اعظم ہیں، اور دنیا کی آبادی کے چھٹے حصہ پر بلا شرکت حکومت کر رہے ہیں، مگر اس کامیابی نے نہرو کو مطمئن نہیں کیا اور اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی وہ محسوس کرتے رہے کہ کتابِ زندگی کے مزید کچھ اوراق ہیں جو ابھی تک بند ہیں، اور وہی سوال آخر عمر میں بھی ان کے ذہن میں گھومتا رہا، جس کو لے کر ہر انسان پہلے روز پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ جنوری 1964ء کے پہلے ہفتہ میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانفرنس نئی دہلی میں ہوئی، جس میں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے بارہ سو ڈیلی گیٹ شریک ہوئے، پنڈت نہرو نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

> ''میں ایک سیاست داں ہوں اور مجھے سوچنے کے لیے وقت کم ملتا ہے پھر بھی بعض

اوقات میں یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہوں کہ آخر یہ دنیا کیا ہے، کس لیے ہے، ہم کیا ہیں اور کیا کررہے ہیں، میرا یقین ہے کہ کچھ طاقتیں ہیں جو ہماری تقدیر کو بناتی ہیں۔''

National Herald, Jan 6, 1964

یہ ایک عدم اطمینان ہے، جوان تمام لوگوں کی روحوں پر گہرے کہر کی طرح چھایا رہتا ہے، جنھوں نے خدا کو اپنا الٰہ اور معبو بنانے سے انکار کیا۔ دنیا کی مصروفیتوں اور وقتی دلچسپیوں میں عارضی طور پر کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اطمینان سے ہم کنار ہیں، مگر جہاں یہ مصنوعی ماحول ختم ہوا، حقیقت اندر سے زور کرنا شروع کر دیتی ہے، اور انھیں یاد دلاتی ہے کہ وہ سچے اطمینان سے محروم ہیں۔

خدا سے محروم قلوب کا یہ حال صرف ایک دنیوی بے اطمینانی کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ وہ اس سے بہت زیادہ اہم ہے، یہ چندروزہ مسئلہ نہیں بلکہ دائمی مسئلہ ہے، یہ دراصل اس تاریک اور بے سہارا زندگی کے آثار ہیں، جس کے کنارے وہ کھڑا ہوا ہے، یہ اس ہولناک زندگی کی ابتدائی گھٹن ہے، جس میں ایسے ہر آدمی کو موت کے بعد داخل ہونا ہے، اور اس خطرے کا ایک پیشگی الارم ہے، جس میں اس کی روح کو بالآخر مبتلا ہونا ہے، مختصر یہ کہ وہ اس جہنم کا دھواں ہے جو ہر کافر ومشرک کے لیے تیار کی گئی ہے گھر میں آگ لگ جائے تو اس کا دھواں سوتے ہوئے آدمی کے دماغ میں گھس کر اس کو آنے والے خطرے سے باخبر کرتا ہے، اگر وہ دھوئیں کی گھٹن سے جگ گیا تو اپنے آپ کو بچالے جائے گا، لیکن جب شعلے قریب آجائیں تو وہ انتباہ کا وقت نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہلاکت کا فیصلہ ہوتا ہے، جو اس کو چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تمہاری بے حسی اور بے خبری نے تمہارے لیے مقدر کر دیا ہے کہ تم آگ میں جلو۔

کیا کوئی ہے جو وقت سے پہلے بیدار ہوجائے، کیوں کہ بیداری وہی ہے، جو وقت سے پہلے ہو، وقت پر بیدار ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔

میک گل یونیورسٹی کے پروفیسر مائیکل بریچر (Michael Brecher) نے جواہر لال نہرو کی سیاسی سوانح حیات لکھی ہے، اس سلسلے میں مصنف نے پنڈت نہرو سے ملاقات بھی کی تھی، نئی دہلی کی

ایک ملاقات میں 13 جون 1956ء کو انھوں نے پنڈت نہرو سے سوال کیا:

''آپ مختصر طور پر مجھے بتائیں کہ آپ کے نزدیک اچھے سماج کے لیے کیا چیزیں ضروری ہیں، اور آپ کا بنیادی فلسفۂ زندگی کیا ہے؟''

ہندستان کے سابق وزیر اعظم نے جواب دیا:

''میں کچھ معیاروں کا قائل ہوں، آپ ان کو اخلاقی معیار (moral standards) کہہ لیجیے، یہ معیار ہر فرد اور سماجی گروہ کے لیے ضروری ہیں، اگر وہ باقی نہ رہیں تو تمام مادی ترقی کے باوجود آپ کسی مفید نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے، ان معیاروں کو کیسے قائم رکھا جائے، یہ مجھے نہیں معلوم، ایک تو مذہبی نقطۂ نظر ہے، لیکن یہ اپنے تمام رسوم اور طریقوں کے ساتھ مجھے تنگ نظر آتا ہے، میں اخلاقی اور روحانی قدروں کو مذہب سے علیٰحدہ رکھ کر بہت اہمیت دیتا ہوں، لیکن میں نہیں جانتا کہ ان کو ماڈرن زندگی میں کس طرح قائم رکھا جاسکتا ہے، یہ ایک مسئلہ ہے۔''

Nehru : A Political Biography, London, 1959, p. 607-8

یہ سوال و جواب جدید انسان کے اس دوسرے خلا کو بتاتا ہے، جس میں آج وہ شدت سے گرفتار ہے، افراد کو دیانت و اخلاق کے ایک خاص معیار پر باقی رکھنا ہر سماجی گروہ کی ایک ناگزیر ضرورت ہے اس کے بغیر تمدن کا نظام صحیح طور پر برقرار نہیں رہ سکتا، مگر خدا کو چھوڑنے کے بعد انسان کو نہیں معلوم کہ وہ اس ضرورت کو کیسے پورا کرے سیکڑوں سال کے تجربے کے بعد وہ ابھی بدستور تلاش کی منزل میں ہے، پبلک اور حکام کے درمیان عمدہ تعلقات پیدا کرنے کے لیے خوش اخلاقی کا ہفتہ (Courtesy Week) منایا جاتا ہے، مگر اس کے بعد بھی جب سرکاری ملازموں کی افسرانہ ذہنیت ختم نہیں ہوتی تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقصد اس طرح حاصل نہیں ہوتا ہے کہ ہم ڈکشنری سے ''اخلاق'' کا لفظ نکال کر لوگوں کے سامنے رکھ دیں۔ بے ٹکٹ مسافروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو روکنے کے لیے تمام اسٹیشنوں پر بڑے بڑے پوسٹر لگائے جاتے ہیں — بے ٹکٹ سفر کرنا سماجی گناہ ہے:

Ticktless travel is a social evil

مگر جب اس کے باوجود بے ٹکٹ سفر ختم نہیں ہوتا تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ''سماجی گناہ'' کا لفظ کا حوالہ وہ احساس پیدا نہیں کرسکتا، جو نظم وضبط کی تعمیل کے لیے محرک بن سکے، پریس کے ذریعہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ جرم کا انجام اچھا نہیں ہوتا (crime does not pay) مگر جرائم بڑھتی ہوئی رفتار بتاتی ہے کہ دنیوی نقصان کے اندیشہ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ آدمی کو جرم سے باز رکھے، تمام دفتروں کی دیواریں مختلف زبانوں کے ان الفاظ سے رنگین کردی جاتی ہیں — ''رشوت لینا اور شوت دینا پاپ ہے''۔ مگر جب ایک شخص دیکھتا ہے کہ ہر محکمے میں عین انھیں الفاظ کے نیچے رشوت کا کاروبار پورے زورشور سے جاری ہے تو وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس قسم کے سرکاری پروپیگنڈہ رشوت کو روکنے میں کسی درجہ میں بھی مفید نہیں ہیں، ریل کے تمام ڈبوں میں اس مضمون کے کتبے لگائے جاتے ہیں — ''ریلوے قوم کی ملکیت ہے، اس کا نقصان پوری قوم کا نقصان ہے''۔ مگر اس کے باوجود جب لوگ کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالتے ہیں، اور بجلی کے بلب غائب کردیتے ہیں، تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ ''قوم'' کے مفاد میں اتنا زور نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے ایک شخص اپنے ذاتی مفاد کو قربان کردے، اجتماعی ذرائع کو ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرنا ملک وقوم سے غداری ہے''۔ ایک طرف لیڈروں اور حکمرانوں کی زبان سے یہ اعلان ہو رہا ہے، دوسری طرف بڑے بڑے قومی منصوبے اس لیے ناکام ہو رہے ہیں کہ سرمایہ کا بڑا حصہ اصل منصوبہ پر لگنے کے بجائے متعلقہ کارکنوں کی تحویل میں چلا جاتا ہے، اسی طرح ساری قومی زندگی کی انتہائی کوشش کے باوجود ان معیاروں سے محروم ہوگئی ہے جو قومی تعمیر کے لیے ضروری ہیں، اور ان معیاروں کو پیدا کرنے کے لیے جتنے ذرائع استعمال کیے گئے وہ سب کے سب قطعی ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

یہ علامتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ بے خدا تہذیب نے انسانیت کی گاڑی کو دلدل میں لا کر ڈال دیا ہے، اس کو اس پٹری سے محروم کردیا ہے، جس کے اوپر چل کر وہ اپنا سفر بحسن وخوبی طے کر سکتی ہے، زندگی کی کشتی بے لنگر اور بغیر بادبان ہوگئی ہے، اس کا واحد حل یہ ہے کہ انسان خدا کی طرف پلٹے، وہ زندگی کے لیے مذہب کی اہمیت کو تسلیم کرے، یہی وہ تنہا بنیاد ہے، جس پر زندگی کی بہتر تعمیر

ممکن ہے، اس کے سوا کسی بھی دوسری بنیاد پر زندگی کی تعمیر نہیں کی جاسکتی۔

ہندستان میں امریکا کے سابق سفیر مسٹر چسٹر باولز (Chester Bowles) لکھتے ہیں:

''زیر ترقی ممالک صنعتی ترقی حاصل کرنے کے سلسلے میں دو طرح کے مسائل سے دو چار ہیں اور دونوں نہایت پیچیدہ ہیں، ایک یہ سرمایۂ خام اشیا اور فنی مہارت جو انھیں حاصل ہیں، ان کو کس طرح زیادہ بہتر طور پر استعمال کریں — دوسرا پیچیدہ مسئلہ وہ ہے جس کا تعلق عوام اور ادارہ سے ہے، صنعت کو تیزی سے آگے بڑھانے کے ساتھ ہمیں یہ تیقن بھی حاصل کرنا ہے کہ وہ جتنی خرابیوں کو دور کرے اس سے زیادہ خرابیاں پیدا نہ کردے، مہاتما گاندھی کے الفاظ میں ''سائنسی معلومات اور دریافتیں محض حرص کو بڑھانے کا اوزار ثابت ہوسکتی ہیں، اصل قابل لحاظ چیز انسان ہے۔''

The Making of a Society, Delhi, 1963. p 68-69

باولز کے الفاظ میں عوام گویا وہ ماحول ہیں، جس کے اندر ترقیاتی پروگرام جاری ہوتے ہیں۔ ترقی کے ضروری سامان — سرمایہ اور فنی مہارت وغیرہ تمدنی اور سیاسی خلا میں کارگر ثابت نہیں ہو سکتے۔ (ص 31)

یہ خلا کیسے پُر ہو اور وہ ماحول کیسے بنے جس میں عوام اور سرکاری کارکن دیانتداری اور اتحاد کے ساتھ ترقیاتی کاموں میں اپنے آپ کو صرف کریں، اس سوال کا کوئی جواب جدید مفکرین کے پاس نہیں ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ بے خدا تہذیب کے ماحول میں نہیں ہوسکتا، بے خدا تہذیب کے اندر ہر ترقیاتی اسکیم ایک زبردست تضاد کا شکار ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ اس کا شخصی نظریہ اس کے سماجی تصور سے ٹکراتا ہے، اس کا اجتماعی پروگرام یہ ہے کہ ایک پرامن اور خوشحال سماج کی تعمیر کی جائے، مگر اس کے ساتھ اس کے مفکرین جب یہ کہتے ہیں — ''انسان کا مقصد مادی خوشی حاصل کرنا ہے'' تو وہ اپنی پہلی بات کی تردید کر دیتے ہیں، وہ پورے سماج کو جیسا دیکھنا چاہتے ہیں، سماج کے افراد کو اس کے خلاف بنا رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی کسی اسکیم کو اب تک اپنے مقصد میں حقیقی کامیابی حاصل نہیں

ہوئی، تمام مادی فلسفے زندگی کا بہتر نظام بنانے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

مادّی خوشی کو زندگی کا مقصد بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی خواہش پوری کرنا چاہے، لیکن اس محدود دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر شخص دوسرے کو متاثر کیے بغیر یکساں طور پر اپنی اپنی خواہش پوری کر سکے، نتیجہ یہ ہے کہ ایک آدمی جب اپنی تمام خواہشیں پوری کرنا چاہتا ہے تو وہ دوسروں کے لیے مصیبت بن جاتا ہے، فرد کی خوشی، سماج کی خوشی کو درہم برہم کر دیتی ہے، ایک محدود آمدنی والا شخص جب دیکھتا ہے کہ اس کی اپنی آمدنی اس کی خواہشوں کی تکمیل کے لیے کافی نہیں ہو رہی ہے تو وہ حق ماری، بددیانتی، چوری، رشوت اور غبن کے ذریعہ اپنی آمدنی کی کمی کو پورا کرتا ہے، مگر اس طرح جب وہ اپنی خواہش پوری کر لیتا ہے تو وہ سماج کو اسی محتاجی میں مبتلا کر دیتا ہے، جس میں وہ خود پہلے مبتلا تھا۔

جدید دنیا ایک عجیب وغریب قسم کی نہایت خطرناک مصیبت میں مبتلا ہے، جس کا تاریخ میں کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ یہ جرم کم سنی (juvenile delinquency) ہے، جو جدید زندگی کا ایک لازمہ بن چکا ہے۔ یہ کمسن مجرمین کہاں سے پیدا ہوتے ہیں، ان کی پیدائش کا سرچشمہ وہی مادی خوشی کو پورا کرنا ہے۔ ایک شادی شدہ جوڑا کچھ دنوں ساتھ رہنے کے بعد ایک دوسرے سے اکتا جاتے ہیں، اور اپنی جنسی خوشی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ نیا جسم اور نیا چہرہ تلاش کریں۔ اس وقت وہ طلاق لے کر ایک دوسرے سے علیٰحدہ ہو جاتے ہیں۔ اس علیٰحدگی کی قیمت سماج کو ایسے بچوں کی شکل میں ملتی ہے، جو اپنے ماں باپ کی موجودگی میں ''یتیم'' ہو گئے ہیں، یہ بچے والدین سے چھوٹنے کے بعد ماحول کے اندر اپنی کوئی جگہ نہیں پاتے، ایک طرف وہ بالکل آزاد ہوتے ہیں، اور دوسری طرف ماحول سے بیزار، یہ صورتِ حال بہت جلد انھیں جرائم تک پہنچا دیتی ہے، سر الفرڈ ڈیننگ (Alfred Denning, 1899-1999) نے بہت صحیح لکھا ہے کہ ''اکثر کمسن اور نابالغ مجرمین اجڑے ہوئے گھرانوں (broken homes) سے نمودار ہوتے ہیں۔''

The Changing Law, p.111

اسی طرح موجودہ زندگی میں تمام خرابیوں کی جڑ صرف یہ واقعہ ہے کہ جدید دنیا کا انفرادی فلسفہ اوراس کے اجتماعی مقاصدایک دوسرے سے متضاد ہیں، وہ تمام واردات جن کو ہم ناپسند کرتے ہیں، اوران کو جرم، برائی اور بدعنوانی کہتے ہیں، وہ دراصل کسی شخص یا پارٹی یا قوم کی اپنی مادّی خوشی حاصل کرنے کی کوشش ہی ہوتی ہے، اوراسی کوشش کا سماجی انجام قتل، بدکاری، لڑائی، اغوا، جعل سازی، ڈاکہ، لوٹ کھسوٹ، جنگ اوراس طرح کی دوسری بے شمار صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ تضاد بتاتا ہے کہ زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا کہ دنیا کی مادّی چیزوں کے بجائے آخرت میں خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کو مقصد بنایا جائے ، یہی وہ مقصد ہے، جو فرد اور سماج کو باہمی تضاد سے بچا کر موافق ترقی کی راہ پر گامزن کرتا ہے— نظریۂ آخرت کی یہ خصوصیت جہاں یہ ثابت کرتی ہے کہ وہی وہ واحد بنیاد ہے، جوترقیاتی اسکیموں کو صحیح طور پر کامیاب کرسکتی ہے، اسی کے ساتھ وہ یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ وہی حقیقی مقصد ہے، کیوں کہ غیر حقیقی چیز زندگی کے لیے اتنی اہم اوراس سے اتنی ہم آہنگ نہیں ہوسکتی۔

موجودہ زمانے میں میڈیکل سائنس میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ اب یہ خیال کیا جانے لگا ہے کہ سائنس موت اور بڑھاپے کے سوا ہر جسمانی تکلیف پر قابو پا سکتی ہے، مگر اسی کے ساتھ بیماری کی اقسام میں نہایت تیزی سے ایک نئے نام کا اضافہ ہورہا ہے— اعصابی بیماری (nervous diseases)۔ یہ ’’اعصابی بیماریاں‘‘ کیا ہیں؟ یہ دراصل اسی تضاد کا ایک عملی ظہور ہے، جس میں جدید سوسائٹی شدت سے مبتلا ہے۔ مادّی تہذیب نے انسان کے اس حصّے کو جو نمکیات معدنیات اور گیسوں کا مرکب ہے، ترقی دینے کی کافی کوشش کی۔ مگر انسان کا وہ حصّہ جو شعور، خواہش اورارادہ پر مشتمل ہے، اس کی غذا اس کو فراہم نہ کرسکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلا حصہ تو بظاہر فربہ اور خوش منظر دکھائی دینے لگا۔ مگر دوسرا حصّہ جو اصل انسان ہے، وہ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو گیا۔

موجودہ امریکا کے بارے میں وہاں کے ذمہ دار ذرائع کا اندازہ ہے کہ وہاں کے بڑے شہروں

میں 80 فیصد مریض ایسے ہیں جن کی بیماری بنیادی طور پر نفسیاتی سبب (psychic causation) کے تحت واقع ہوتی ہے۔ ماہرین نفسیات نے اس سلسلے میں جو تحقیقات کی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان بیماریوں کے پیدا ہونے کے چند اہم ترین وجوہ یہ ہیں — جرم، ناراضگی، اندیشہ، پریشانی، مایوسی، تذبذب، شبہ، حسد، خودغرضی اور اکتاہٹ (boredom)، وغیرہ۔ یہ سارے عوارض، اگر گہرائی کے ساتھ غور کیجیے تو بے خدا زندگی کا نتیجہ ہیں۔ خدا پر ایمان آدمی کے اندر وہ اعتماد پیدا کرتا ہے، جو مشکلات میں اس کے لیے سہارا بن سکے، وہ ایسا برتر مقصد اس کے سامنے رکھ دیتا ہے، جس کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے مسائل کو نظر انداز کر کے اس کی طرف بڑھ سکے، وہ اس کو ایسا محرک دیتا ہے، جو سارے اخلاقی محاسن کی واحد بنیاد ہے، وہ عقیدے کی وہ طاقت دیتا ہے، جس کے متعلق ڈاکٹر سر ولیم اوسلر (Sir William Osler, 1849-1919) نے کہا ہے: ''وہ ایک عظیم قوت محرکہ (great moving force) ہے، جس کو نہ کسی ترازو میں تولا جا سکتا ہے، اور نہ لیبارٹری میں اس کی آزمائش کی جا سکتی ہے۔'' یہی عقیدے کی طاقت دراصل نفسیاتی صحت کا خزانہ ہے، جو نفسیات اس سرچشمہ سے محروم ہو وہ ''بیماریوں'' کے سوا کسی اور انجام سے دوچار نہیں ہو سکتی، یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ وقت کے ماہرین نے نفسیاتی یا اعصابی عوارض کا کھوج لگانے میں تو کمال درجے کی ذہانت کا ثبوت دیا ہے، مگر ان نو دریافت بیماریوں کا صحیح علاج تجویز کرنے میں وہ سخت ناکام ہوئے ہیں، ایک عیسائی عالم کے الفاظ میں ''نفسیاتی علاج کے ماہرین (Psychiatrists) صرف اس تالے کی باریک تفصیلات بتانے میں اپنی کوشش صرف کر رہے ہیں، جو ہمارے اوپر صحت کے دروازے بند کرنے والا ہے۔''

جدید معاشرہ بیک وقت دو متضاد عمل کر رہا ہے، ایک طرف وہ مادّی سازوسامان فراہم کرنے میں پوری قوت صرف کر رہا ہے، دوسری طرف مذہب کو ترک کر کے وہ حالات پیدا کر رہا ہے، جس سے زندگی طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہو جائے، وہ ایک طرف دوا کھلا رہا ہے، اور دوسری جانب زہر کا انجکشن دے رہا ہے، یہاں میں ایک امریکی ڈاکٹر ارنسٹ اڈولف

(Paul Ernest Adolph) کا ایک اقتباس نقل کروں گا، جو اس کے سلسلے میں ایک دلچسپ شہادت فراہم کرتا ہے:

''جن دنوں میں میڈیکل اسکول میں زیر تعلیم تھا، میں ان تبدیلیوں سے آگاہ ہوا جو زخم ہو جانے کی صورت میں جسم کے اخلاط (body tissues) میں رونما ہوتی ہیں، خوردبین کے ذریعہ نسیجوں کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ نسیجوں پر جو مختلف موافق اثرات کے واقع ہونے سے زخم کا اطمینان بخش اندمال ہو جاتا ہے، اس کے بعد جب تعلیم ختم کر کے میں عملاً ڈاکٹری کے پیشے میں داخل ہوا تو مجھے اپنے اوپر بڑا اعتماد تھا کہ میں زخم اور اس کے ٹھیک کے طریقوں کو اس حد تک جانتا ہوں کہ میں یقینی طور پر موافق نتیجہ پیدا کر سکتا ہوں جب کہ میں اس کے ضروری طبی وسائل مہیا کر کے اس کو استعمال میں لاؤں، لیکن جلد ہی میری اس خود اعتمادی کو صدمہ پہنچا، مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اپنی میڈیکل سائنس میں ایک ایسے عنصر کو نظر انداز کر دیا تھا، جو سب سے زیادہ اہم ہے — یعنی خدا۔

اسپتال میں جن مریضوں کی نگرانی میرے سپرد کی گئی ان میں ایک ستّر (70) سال کی بوڑھی عورت تھی، جس کا کولھا زخمی ہو گیا تھا، ایکسرے تصاویر کے معائنہ سے معلوم ہوا کہ اس کی نسیجیں (tissues) بڑی تیزی سے ٹھیک ہو رہی ہیں، میں نے اس سرعت کے ساتھ شفایابی پر اس کو مبارکباد پیش کی، انچارج سرجن نے مجھے ہدایت کی کہ اس خاتون کو 24 گھنٹے میں رخصت کر دیا جائے، کیوں کہ اب وہ کسی سہارے کے بغیر چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی ہے۔

اتوار کا دن تھا، اس کی بیٹی ہفتہ وار ملاقات کے معمول کے مطابق اسے دیکھنے آئی، میں نے اس سے کہا کہ چوں کہ اس کی ماں اب صحت یاب ہے، اس لیے وہ کل آ کر اسے اسپتال سے گھر لے جائے، لڑکی اس کے جواب میں کچھ نہیں بولی اور سیدھی اپنی ماں کے پاس چلی گئی، اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ اس نے اپنے شوہر سے اس کے بارے میں مشورہ کیا ہے،

اور یہ طے ہوا ہے کہ وہ اس کو اپنے گھر نہ لے جاسکیں گے، اس لیے زیادہ بہتر انتظام کی صورت یہ ہے کہ اس کو کسی اولڈ ایج ہوم (Old People's Home) میں پہنچا دیا جائے۔

چند گھنٹوں کے بعد جب میں اس بڑھیا کے پاس گیا تو میں نے دیکھا کہ بڑی تیزی کے ساتھ اس پر جسمانی انحطاط طاری ہو رہا ہے، چوبیس گھنٹے کے اندر ہی وہ مر گئی — کولھے کے زخم کی وجہ سے نہیں بلکہ دل کے صدمے کی وجہ سے:

Not of her broken hip, but of a broken heart

ہم نے ہر قسم کی ممکن طبّی امداد اسے پہنچائی، مگر وہ جانبر نہ ہوسکی، اس کے کولھے کی ٹوٹی ہوئی ہڈی تو بالکل درست ہو چکی تھی، مگر اس کے ٹوٹے ہوئے دل کا کوئی علاج نہ تھا، وٹامن، معدنیات اور ٹوٹی ہوئی ہڈی کو اپنی جگہ لانے کے لیے سارے ذرائع استعمال کرنے کے باوجود وہ صحت یاب نہیں ہوئی، یقینی طور پر اس کی ہڈیاں جڑ چکی تھیں، اور وہ ایک مضبوط کولھے کی مالک ہو چکی تھی، مگر وہ بچ نہ سکی، کیوں، اس لیے کہ اس کی صحت کے لیے اہم ترین عنصر جو درکار تھا، وہ وٹامن نہیں تھا، نہ معدنیات تھے اور نہ ہڈیوں کا جڑنا تھا، یہ صرف امنگ (hope) تھی، اور جب زندگی کی امنگ ختم ہوگئی تو صحت بھی رخصت ہوگئی۔

اس واقعہ نے مجھ پر گہرا اثر کیا، کیوں کہ اس کے ساتھ مجھے شدید احساس تھا کہ اس بوڑھی خاتون کے ساتھ ہرگز یہ حادثہ پیش نہ آتا، اگر یہ خاتون خدائی امید (God of Hope) سے آشنا ہوتی، جس پر ایک عیسائی کی حیثیت سے میں اعتقاد رکھتا ہوں۔''

The Evidence of God, p.212-14

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدید ترقی یافتہ دنیا کس قسم کے تضاد سے دوچار ہے، وہ ایک طرف سارے علوم کو اس نہج پر ترقی دے رہی ہے، جس سے خدا کا وجود حرف غلط ثابت ہو جائے، تعلیم وتربیت کے پورے نظام کو اس ڈھنگ سے چلایا جا رہا ہے، جس سے خدا اور مذہب کے احساسات

دلوں سے رخصت ہو جائیں، اس طرح روح —— اصل انسان —— کو موت کے خطرے میں مبتلا کر کے اس کے جسم —— مادی وجود —— وترقی دینے کی سعی کی جا رہی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ عین اس وقت جب کہ بہترین ماہرین اس کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے میں کامیابی حاصل کر چکے ہوتے ہیں، عقیدے کی اندرونی طاقت کی محرومی کی وجہ سے اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے، اور بظاہر جسمانی صحت کے باوجود وہ موت کے آغوش میں چلا جاتا ہے۔

یہی وہ تضاد ہے، جس نے آج پوری انسانیت کو تباہ کر رکھا ہے، خوش پوش جسم حقیقی سکون سے محروم ہیں، عالی شان عمارتیں اجڑے ہوئے دلوں کا مسکن ہیں، جگمگاتے ہوئے شہر جرائم اور مصائب کا مرکز ہیں، شان دار حکومتیں اندرونی سازش اور بے اعتمادی کا شکار ہیں، بڑے بڑے منصوبے کردار کی خامی کی وجہ سے ناکام ہو رہے ہیں —— غرض مادّی ترقیات کے باوجود انسان کی حقیقی زندگی بالکل اجڑ گئی ہے، یعنی روحانی زندگی، اور یہ سب نتیجہ ہے صرف ایک چیز کا —— انسان نے اپنے خدا کو چھوڑ دیا، اس نے اس سرچشمہ سے اپنے آپ کو محروم کر لیا، جو اس کے خالق و مالک نے اس کے لیے مہیا کیا تھا۔ انسانی فطرت کا تقاضا ایک روحانی چیز۔ پھر ایک مادی چیز ایک روحانی سوال کا جواب کس طرح بن سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سوال کا جواب صرف خداوند تعالیٰ ہے۔ مخلوق اپنے خالق کی تلاش میں ہے، اور خالق کو پانے کے بعد ہی مخلوق کو سکون حاصل ہو سکتا ہے: آلا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (13:28)۔

نفسیاتی امراض کی نوعیت جو اوپر بیان کی گئی ہے، وہ اتنی واضح حقیقت ہے کہ خود اس فن کے علما نے اس کا اعتراف کیا ہے، نفسیات کے مشہور عالم پروفیسر ینگ (Carl Gustav Jung, 1875-1961) نے اپنی زندگی بھر کا تجربہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''پچھلے تیس برسوں میں روئے زمین کے تمام متمدن ممالک کے لوگوں نے مجھ سے (اپنے نفسیاتی امراض کے سلسلے میں) مشورہ حاصل کرنے کے لیے رجوع کیا ہے، میرے مریضوں میں زندگی کے نصف آخر میں پہونچنے والے تمام لوگ —— جو کہ 35 سال کے بعد کہی

جاسکتی ہے— کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا، جس کا مسئلہ اپنے آخری تجزیے میں زندگی کا مذہبی نقطۂ نظر پانے کے سوا کچھ اور ہو، یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان میں سے ہر شخص کی بیماری یہ تھی کہ اس نے وہ چیز کھودی تھی جو کہ موجودہ مذاہب ہر دور میں اپنے پیروؤں کو دیتے رہے ہیں، اور ان مریضوں میں سے کوئی بھی حقیقتاً اس وقت تک شفایاب نہ ہوسکا، جب تک اس نے اپنا مذہبی تصور دوبارہ نہیں پالیا۔‘‘

Quoted by C.A.Coulson, *Science and Christian Belief*, p.110

یہ الفاظ اگرچہ سمجھنے والے کے لیے بجائے خود بالکل واضح ہیں، تاہم اگر میں نیویارک اکیڈمی آف سائنس کے صدر اے، کریسی ماریسن کے الفاظ نقل کردوں تو بات بالکل مکمل ہوجائے گی:

’’ادب واحترام، فیاضی، کردار کی بلندی، اخلاق، اعلیٰ خیالات اور وہ سب کچھ جس کو خدائی صفات (Divine Attributes) کہا جاسکتا ہے، وہ کبھی الحاد سے پیدا نہیں ہوسکتیں جو کہ دراصل خود بینی کی عجیب وغریب قسم ہے، جس میں آدمی خود اپنے آپ کو خدا کے مقام پر بٹھالیتا ہے، عقیدے اور یقین کے بغیر تہذیب تباہ ہوجائے گی، نظم، بے نظمی میں تبدیل ہوجائے گی، ضبط نفس اور اپنے آپ پر کنٹرول کا خاتمہ ہوجائے گا— اور برائی ہر طرف پھیل جائے گی، ضرورت ہے کہ ہم خدا پر اپنے یقین کو دوبارہ مضبوط کریں۔‘‘

Man Does not Stand Alone, p.123

آخری بات

اگر کسی دن ماونٹ پیلومر کی رصدگاہ سے یہ اعلان ہو کہ زمین کی قوتِ کشش ختم ہوگئی ہے تو ساری دنیا میں کہرام مچ جائے گا، کیوں کہ اس خبر کے معنی یہ ہیں کہ زمین کا پورا کرہ چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف کھنچنا شروع ہوجائے اور چند ہفتوں کے اندر سورج کے عظیم الاؤ میں اس طرح جا گرے کہ اس کی راکھ بھی یہ بتانے کے لیے باقی نہ رہے کہ زمین نام کی کوئی چیز کبھی اس کائنات میں موجود تھی، جس میں اربوں انسان بستے تھے، اور بڑے بڑے تمدنی شہر آباد تھے۔

مگر ماہرین اعداد و شمار کی یہ خبر کہ ہر منٹ میں ساری دنیا کے اندر ایک سو انسان مرجاتے ہیں، ہمارے لیے اس سے بھی زیادہ گھبرا دینے والی بات ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک رات اور دن میں تقریباً پندرہ لاکھ انسان ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں۔ 24 گھنٹے میں پندرہ لاکھ! اس صورت حال میں یہ واقعہ مزید شدت پیدا کردیتا ہے کہ پندرہ لاکھ کا یہ انتخاب تابکار عناصر کے برقی ذرّات کی طرح بالکل نامعلوم طور پر ہوتا ہے، کوئی بھی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اگلے چوبیس گھنٹے کے لیے جن پندرہ لاکھ انسانوں کی موت کی فہرست تیار ہو رہی ہے، اس میں اس کا نام شامل ہے یا نہیں، گویا ہر شخص ہر آن اس خطرے میں مبتلا ہے کہ قضا و قدر کا فیصلہ اس کے حق میں موت کا فرشتہ بن کر آپہنچے۔

یہ جانے والے لوگ کہاں جاتے ہیں، اس کا جواب آپ کو معلوم ہوچکا ہے کہ وہ کائنات کے مالک کے سامنے اپنے کارنامۂ زندگی کا حساب دینے کے لیے حاضر کیے جاتے ہیں، انھیں اس لیے موت آتی ہے کہ دوسری دنیا میں ان کی وہ مستقل زندگی شروع ہو جو دنیا کے عمل کے مطابق اچھی یا بری انھیں گزارنی ہے، یہ زندگی یا تو بے حد آرام کی زندگی ہے، یا بے حد تکلیف کی زندگی، یہ گھڑی بہر حال آکر رہے گی، ہم سب لوگ ایک ایسے ممکن انجام سے دوچار ہیں جس سے ہم صرف بچنے کی فکر کرسکتے ہیں، اس کے آنے کو ہم ٹال نہیں سکتے۔

پھر انسان تو کس انتظار میں ہے، کیا تجھ کو ہوشیار کرنے کے لیے یہ واقعہ کافی نہیں کہ تو اپنے آپ کو موت سے نہیں بچا سکتا، کیا تجھے اپنی زندگی کو بدلنے کے لیے اس سے بڑے کسی محرک کی ضرورت ہے کہ اگر تو نے دنیا میں اپنی زندگی نہیں بدلی تو تجھ کو ہمیشہ ہمیش کائنات کے ابدی کوڑے خانے میں رہنا ہے، کیا تو اس سے نہیں ڈرتا کہ دنیا میں جب تیری قبر پر تیرے معتقدین پھول چڑھا رہے ہوں تو آخرت میں تو اپنے غیر خدائی عمل کے جرم میں ابدی کوڑے خانے میں پڑا رہے گا۔

وہ دن جو بڑا سخت دن ہوگا، وہ جب آئے گا تو سارے زمین و آسمان کو الٹ دے گا، وہ ایک نئی دنیا بنائے گا، جہاں سچ سچ کی شکل میں ظاہر ہوگا اور جھوٹ جھوٹ کی شکل میں، کوئی نہ خود دھوکے میں رہے گا، اور نہ دوسرے کو دھوکا دے سکے گا، نہ کسی کا زور چلے گا، نہ سفارش کام آئے گی، اس دن تیرے الفاظ کے گھروندے بکھر جائیں گے، تیرے جھوٹے فلسفے بے دلیل ثابت ہوں گے، تیری فرضی امیدیں تجھے دھوکا دے دیں گی، تیرا اقتدار تیرے کچھ کام نہ آئے گا، تیرے خود ساختہ بت تجھے جواب دے دیں گے، آہ !انسان کس قدر بے سہارا ہوگا اس روز، حالاں کہ اسی دن اس کو سب سے زیادہ سہارے کی ضرورت ہوگی، وہ کتنا محروم ہوگا، اس روز، حالانکہ اسی دن وہ سب سے زیادہ پانے کا محتاج ہوگا۔

انسان! آج ہی سن لے، کیوں کہ کل تو سنے گا مگر اس وقت تیرا سننا بے کار ہوگا، آج ہی سوچ لے کیوں کہ موت کے بعد تو سوچے گا مگر اس وقت کا سوچنا تجھے کچھ کام نہ آئے گا، خدا کا راستہ تیرے سامنے کھلا ہوا ہے، اس کو پکڑ لے، خدا کے رسول پر ایمان لا، خدا کی کتاب کو اپنی زندگی کا دستور بنا، آخرت کے دن کے لیے تیاری کر — یہی تیری کامیابی کا راستہ ہے، اسی میں وہ زندگی چھپی ہوئی ہے، جس کی تجھے تلاش ہے۔

Back cover text:

زیرِنظر کتاب کا ترجمہ دنیا کی اکثر بڑی زبانوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اسلامی دنیا کی اکثر یونیورسٹیوں میں وہ مطالعہ کے نصاب میں داخل ہے۔ سیکڑوں کی تعداد میں اخبارات ورسائل نے اپنے تبصروں میں اس کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ مسلم دنیا کے مشہور ترین عربی اخبار الاہرام (قاہرہ) نے اپنے 2 جولائی 1973 کے شمارہ میں اس پر جو مفصل تبصرہ کیا تھا، اس کا آخری پیرا گراف یہ تھا—

''مصنفِ کتاب نے اسلام کے مطالعہ کا ایسا علمی انداز اختیار کیا ہے جو بالکل انوکھا ہے۔ جدید مادی فکر کے مقابلہ میں دین کو وہ اسی طرز استدلال سے ثابت کرتے ہیں جس سے منکرین اپنے نظریات کو ثابت کرتے ہیں۔ اسلام کے ظہور سے لے کر اب تک چودہ سو سالوں میں اسلام پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اگر تاریخ کو چھانا جائے اور اللہ کی طرف بلانے والی عمدہ کتابوں کو چھلنی سے چھان کر نکالا جائے تو یہ کتاب بلاشبہ ان میں سے ایک ہوگی۔''

زیرِنظر کتاب کا ترجمہ دنیا کی اکثر بڑی زبانوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اسلامی دنیا کی اکثر یونیورسٹیوں میں وہ مطالعہ کے نصاب میں داخل ہے۔ سیکڑوں کی تعداد میں اخبارات ورسائل نے اپنے تبصروں میں اس کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ مسلم دنیا کے مشہور ترین عربی اخبار الاہرام (قاہرہ) نے اپنے ۲ جولائی ۱۹۷۳ کے شمارہ میں اس پر جو مفصل تبصرہ کیا تھا، اس کا آخری پیراگراف یہ تھا ——————

مصنفِ کتاب نے اسلام کے مطالعہ کا ایسا علمی انداز اختیار کیا ہے جو بالکل انوکھا ہے۔ جدید مادی فکر کے مقابلہ میں دین کو وہ اسی طرزِ استدلال سے ثابت کرتے ہیں جس سے منکرین اپنے نظریات کو ثابت کرتے ہیں۔ اسلام کے ظہور سے لے کر اب تک چودہ سو سالوں میں اسلام پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اگر تاریخ کو چھانا جائے اور اللہ کی طرف بلانے والی عمدہ کتابوں کو چھلنی سے چھان کر نکالا جائے تو یہ کتاب بلاشبہ ان میں سے ایک ہوگی۔

ISLAMIC STUDIES



www.goodwordbooks.com

ISBN 978-81-7898-723-1

9 788178 987231